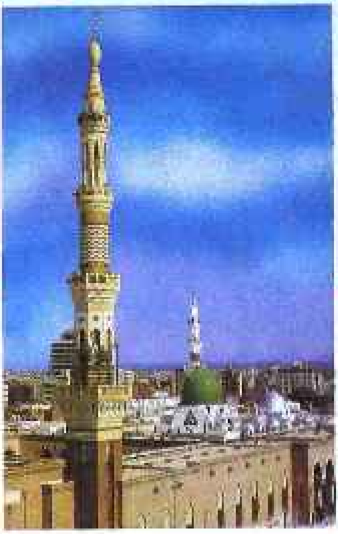

مکتبِ رسولؐ

استاد محسن قرائتی

جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان

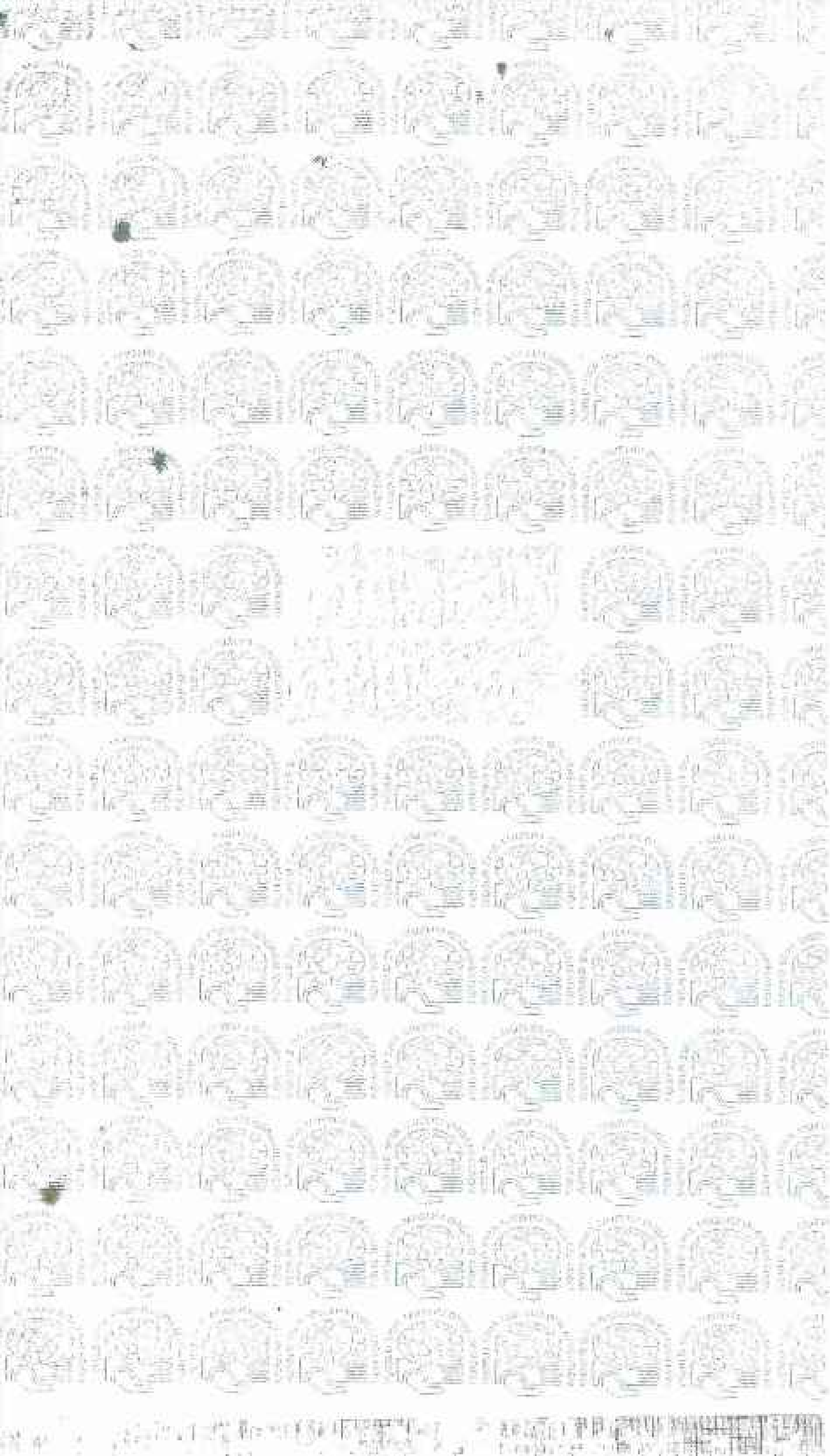

اصول دین

Muhammad Haris ar

لینسٹ لائبریری

مکتبِ رسولؐ

(دینی)
ACC No. 13008 Date 15/4/11
Section اصول دین Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

اُستاد محسن قرائتی

اصول دین
ACC No. 7595 Date
Section 6/5 Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

جامعہ تعلیمات اسلامی پوسٹ بکس: ۵۴۲۵ کراچی۔ پاکستان

مترجم ________ ڈاکٹر سہیل بخاری
مدیر ________ رضا حسین رضوانی
خوشنویس ________ شیخ اشرف راحت
مصحح ________ کاظم علی گجراتی
مطبع ________ سہیل پریس

جملہ حقوق محفوظ : یہ کتاب کُلی یا جُزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ راقم الحروف کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلد بندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل میں تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریتاً کرائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہوگی۔
وائی۔ کے۔ نفسی

ب
Acc No. 13008 Date 15/4/11
Section ... Status ...
D.D. Class ...
NAJAFI BOOK LIBRARY

اِنتساب

ان نوجوانوں کے نام جو
رات دن علم و دانش کی
تلاش میں رہتے ہیں۔

Hassan
NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No 11, M.L. Heights,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan.

اسلام

"کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد حق و صداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ علم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدد ندیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

"اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیت اور عبادت کا بلند ترین معیار قرار دیا ہے۔ اس نے اسے اعلیٰ احکام، بلند اصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوق اور مسلمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمہارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اسے قائم رکھو۔ اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو۔ اس کے معتقدات سے انصاف کرو۔ اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اسے اس کا مناسب مقام دو۔"

امام علی علیہ السلام

Shop No 11, M.L. Heights, Mirza Kaleej Baig Road, Soldier Bazar Karachi. ARY ... WELFARE TRUST (R)

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم موسوی خوئی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی دنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اس گرانبہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۵۰ سے زیادہ کتابیں شائع کر چکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاءاللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ۶۰ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچے بچیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جسکی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا سکے۔

دعا ہے کہ خداوندِ منان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

دعاؤں کا طلبگار: شیخ یوسف علی نفسی نجفی
وکیل حضرت آیت اللہ خوئی دام ظلہ العالی

قارئین گرامی!

یہ کتاب ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔
ادارہ ہذا کی مطبوعات کی اشاعت کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اجاگر کرنا ہے۔

اس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو گراں قدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔

آپ سے یہ بھی استدعا ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آرا تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ ارشادِ ربانی کی تعمیل ہو سکے۔

"(اے رسول ﷺ!) کہہ دیجیے میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو" (سورۂ سبا۔ آیت ۴۶)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں آپ پر نازل ہوں۔

سیکرٹری نشرو اشاعت

فہرست

پیش لفظ ۱۱-۱۸

توحید ۱۹-۹۰

جہاں بینی کے معنی۔ جہاں بینی پر بحث کا فائدہ۔ طرزِ جہاں بینی کا انتخاب۔ الہی جہاں بینی کا پہلا اصول۔ فطرت کیا ہے؟ نبیوں کا کام۔ کیا اطاعت کا حکم انسانوں کی آزادی کے منافی ہے۔ کون سا ایمان قابلِ قدر ہے۔ خدا پر ایمان کے آثار۔ پریشانی کے اسباب۔ بے ایمانی کے آثار۔ مذہب کے بارے میں مادہ پرستوں کی بیجان توجیہیں۔ اشتقاقی نظریوں کی رسوائی۔ ایک جماعت خدا یا مذہب کی طرف رغبت کیوں نہیں رکھتی۔ دین کے خدوخال۔ توحید کی اصلیت اور اسکے مختلف پہلو۔ توحید سے روگردانی کے اسباب۔ توحید کی دلیلیں۔ شرک کی بحث۔ شرک کے نمونے۔ شرک کے آثار۔ شرک کا اجتماعی اثر۔ آخرت پر شرک کا اثر۔ توحید کا منظر۔ توحید کا مثالی ہیرو۔ بااخلاص انسان کی علامات۔ ہم شرک اور بیجا امیدوں سے کسطرح بچیں۔ مشرک قوم کی علامات۔ جہاں والدین کی اطاعت سے منع کیا گیا ہے۔ نہ بخشا جانے والا گناہ۔ مشرکوں کے مقابلے میں ردِعمل۔

عدل ۹۱-۱۴۴

ظلم کے اسباب۔ خدا کی صفات سے ہماری واقفیت کا طریقہ۔ ہم عدل کو اصولِ دین میں کیوں شمار کرتے ہیں۔ عدل کے معنی۔ سرسری اور عاجلانہ فیصلوں پر قرآن کی نکتہ چینی۔ عدلِ الہی سے متعلق سوالات کا مطالعہ۔ اختلافات سے سماج بنتا ہے۔ شخصی تعمیر میں مشکلات کا اثر۔ انسان کی اختراعات میں مشکلات اور دشواریوں کا حصہ۔ سوالات و جوابات۔ بچے کا گناہ کیا ہے؟ ایک درخواست ایک دلچسپ یاد۔ درجہ بندی خدا کی پہچان کا ذریعہ ہے۔

سماجی انصاف ۱۴۵-۲۰۲

تمام اسلامی قواعد میں انصاف۔ سماجی انصاف کا الٰہی جہان بینی سے تعلق۔ انصاف کی خواہش قدرتی ہے۔ منصفانہ قانون صرف انبیاءؑ کے طرز فکر میں ملتا ہے۔ انصاف بنیادی شرط ہے۔ روایات میں انصاف کی اہمیت۔ انبیاءؑ کی بعثت کے مقاصد۔ مساوات کے لیے امام علیؑ کی دلیل۔ عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں۔ مُردوں کی گنتی۔ امام کے سامنے لوگوں کو خرید لینے کی تجویز۔ ایک نظریہ رکھنے اور کاروبار کرنے میں فرق ہے۔ ایک روٹی کی منصفانہ تقسیم۔ لوگوں کے فائدے کے لیے اپنے نظریے کو نہ بگاڑو۔ قضاوت کو معمولی نہ سمجھو۔ امیرالمومنینؑ پر بیجا اعتراض۔ جھگڑوں وغیرہ میں انصاف۔ کاغذ کو کفایت سے استعمال کرو۔ اپنے حقوق میں اضافہ کرانے کی کوشش۔ منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ممانعت۔ اسلام میں مساوات کی ایک مثال۔ اقربا نوازی کی ممانعت۔ اسلامی حکومت میں حد جاری کرنیوالے بھی کوڑے کھاتے ہیں۔ معاوضۂ سکوت کی تجویز۔ لوگوں کو اوصاف کی بنا پر زیادہ حصہ نہیں لینا چاہیے۔ حضرت عمر کو حضرت علیؑ کی تنبیہ۔ امیرالمومنینؑ کچہری سے کیوں چلے گئے۔ بحث اور عمل میں ضد۔ کافر اور دشمنوں سے انصاف۔ خون بہا اور قصاص سماجی انصاف کے ضامن ہیں۔ قرآن کا منصفانہ قصاص۔ عبادت میں اعتدال۔ تعریف اور تنقید میں انصاف و اعتدال۔ اخراجات اور خیرات میں اعتدال۔ گھر میں انصاف۔ کفایت شعاری میں اعتدال۔ کام کی مقدار۔ تقسیم اموال میں انصاف۔ حصہ لینے اور خرچ کرنے میں اعتدال۔ عدالت کی حفاظت کرنیوالے پیغمبرؐ، امام اور فقیہ۔ فقیہ سماجی انصاف کی نگرانی کا ذمہ دار ہے۔ ولایت فقیہ سماجی انصاف کی ضمانت ہے۔ انصاف سے پھر جانیکے اسباب۔ سماجی انصاف کا قیام عوام کی نگرانی سے متعلق ہے۔

نبوّت ۲۰۳ - ۳۷۲

خدا کی صحیح پہچان نہ ہونیکی علامت۔ علم اور عقل کی ضرورت۔ علم کے کام اور نبیوں کے کام کا فرق۔ انبیاءؑ کا راستا انسان کی پرانی خواہش ہے۔ انبیاءؑ کے بارے میں قرآن کا بیان۔ دوسروں پر ایک نظر۔ ہم لوگوں سے قانون کیسے منوائیں۔ قانون کو جاری کرنیکا ضامن کون ہے؟۔ نبیوں کی پہچان۔ معجزہ تماشا نہیں ہے۔ معجزے کی اصلیت۔ قرآن کی خصوصیات۔ ہم چودہ صدی سے جواب کے منتظر ہیں۔ آئیے ہم قرآن کو بہتر طور پر سمجھیں۔ تلاوت قرآن کے آداب۔ پیغمبروں کے تمام صفات اور رسول اکرمؐ کی سیرت۔ نبیوں کی عوامی زندگی۔ انبیاءؑ کو تنبیہ۔ پیغمبروں کا اخلاق۔ خدا کی اطاعت۔ پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کی ایک جھلک۔ پیغمبر خداؐ کا اجتماعی طرزِ عمل۔ پیغمبر خداؐ کے دیگر اوصاف۔ رسولِ خداؐ سے معذرت۔ چند تہمتیں۔ نبیوں کا کارنامہ۔ خوشخبری دینے اور ڈرانے والے۔ نبیوں کے دوست اور دشمن۔ لوگ انبیاءؑ کی مخالفت کیوں کرتے تھے؟۔ انبیاءؑ کے پیروؤں کے لیے طعنے اور اذیتیں۔ منافقوں کی تخریبکاری۔ اعتراضات کے الجھاوے۔ انبیاءؑ کے حامیوں کے میلان کا سبب۔ بے استقامت پیرو۔

امامت ۳۷۳ - ۴۷۸

کیا امام کو پہچاننا اصولِ دین میں داخل ہے؟۔ امام اصول دین میں شامل ہے۔ توحید سے امامت کا تعلق۔ امام کی ضرورت۔ کیا قرآن کافی نہیں ہے؟۔ امام کا کردار۔ قیامت میں امامت کی پرچھائیں۔ ایک بہت دلچسپ حدیث۔ امام کی یاد۔ امام کے معنی پر توجہ۔ امام کے کردار کا ایک نمونہ۔ حدیث میں امام کا کردار۔ امامت اور رہبری کا مقصد۔ امام کی علامات اور صفات۔

پیغمبرؐ کی کوشش۔ اظہارِ حق اور اسکی کوشش۔ امام کی کچھ اور صفات۔ رہبر اور امام کے تقرر کا طریقہ۔ لوگوں کا فیصلہ ہر جگہ صحیح نہیں ہوتا۔ دنیا میں رہبر کے تقرر کے طریقے۔ امام کا تقرر صرف خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ انتخابات کی فطری خرابیاں۔ جہاں انتخابات کی ممانعت ہے۔ نامزدگی ہی صحیح راستا ہے۔ بہترین شخص کی نامزدگی۔ امام علیؑ اور اہلبیتؑ کے کچھ فضائل۔ امام اور امت کے باہمی حقوق۔ امت کی ذمہ داری۔ حج کا آخری مقصد۔ تنوری شیعہ۔ جھوٹا شیعہ معصوموں کی امامت کیسے کمزور پڑ گئی۔ کیا اکثر لوگوں کا حق کو چھوڑ دینا ممکن ہے؟۔ شیعوں اور سنیوں کی مطابقت۔ ناجائز ولایت اور رہبری۔ اولی الامر کون ہے؟ ولایت فقیہ، ولایت فقیہہ کا کردار۔

معاد ۴۷۹ - ۵۴۶

معاد یا قیامت کا تصوّر۔ فطری دلیلیں حقیقی دلیلوں کی نشاندہی۔ انبیاؑ کا ارشاد۔ فرمان خدا بذریعۂ انبیاؑ۔ مردوں کا جی اٹھنا محال نہیں۔ قرآن کی ایک یاد آوری۔ قیامت کے وقوع کی چند مثالیں۔ ایک سچا واقعہ۔ قیامت پر پہلی دلیل، عدل خداوندی۔ خدا دنیا میں جزا و سزا کیوں نہیں دیتا۔ لوگوں کی آزادی عمل چھین جاتی۔ اسلامی اقدار کا معیار۔ ایک یاد آوری۔ دنیا میں کلی جزا و سزا ممکن نہیں۔ دنیا میں سزا کی مثالیں۔ انسانی زندگی تلپٹ ہو جاتی۔ دنیا میں سزا رحمت کی کمی ہے کبھی فوری جزا و سزا عادلانہ نہیں رہتی۔ وہ آیات جن میں عدل خداوندی کا بیان ہے۔ دوبارہ زندہ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ قیامت پر دوسری دلیل، خدا کی حکمت۔ دنیا کا دسترخوان اور ساتھ ہی ایک ہمدرد طبیب۔ ایک اور مثال۔ ایک سچی کہانی۔ لادین لوگوں کو دعوت فکر۔ قیامت پر ایمان رکھنے کا اثر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ، وَالصَّلٰوةُ عَلٰی مَنْ جَعَلَهٗ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا وَعَلٰی اٰلِهِ الَّذِیْنَ اَذْهَبَ عَنْهُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَطَهَّرَهُمْ تَطْهِیْرًا.

پیش لفظ

یہ کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے جب استاد محسن قرائتی نے حوزۂ علمیہ قم میں دورۂ سطح (مبادیاتِ اجتہاد) کی تحصیل مکمل کی اور عملی میدان میں قدم رکھا۔ اس وقت انھیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اپنے لیے کس راہ کا انتخاب کریں یعنی فقہ کی، تبلیغ کی، تصنیف کی یا درس کہنے کی۔ اس انتخاب میں دو باتیں ان کی رہنمائی کرسکتی تھیں:

۱۔ ان کے معاشرے کو کس چیز کی ضرورت ہے؟

۲۔ ان کا ذاتی میلان اور ذہنی رجحان کس طرف ہے؟

انھوں نے طے کیا کہ وہ درس کہنے کی راہ اختیار کریں گے۔ ان کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ جس طرح ہر سماج میں مختلف علوم و فنون میں "مہارتِ خصوصی" کا اصول تسلیم کیا جاتا ہے اور ہر شعبے میں ماہر کو غیر ماہر

پر ترجیح دی جاتی ہے' اچھا ہوگا اگر وہ بھی نوجوانوں کو سمعی و بصری AUDIO-VISUAL طریقے سے اسلامی عقائد و نظریات پڑھانے میں خصوصی مہارت حاصل کریں۔

خدا نے عزم و ارادے کا ایک شعلہ ان کے اندر روشن کر دیا۔ وہ گھر سے باہر گلی میں آئے اور کسی تمہید کے بغیر ان چند نوجوانوں سے جو وہاں موجود تھے، کہا: "میرے پیارے نوجوانو! کیا تم پسند کرتے ہو کہ میں تمھارا دوست بن جاؤں اور ہم کبھی کبھی مسجد میں اکٹھے ہو کر کچھ مذہبی گفتگو کر لیا کریں؟"

انھوں نے چند لمحے تک ان کے جواب کا انتظار کیا' نوجوانوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ یہ آخوند کیا کہتا ہے!

انھوں نے نوجوانوں کی ہمت بندھائی اور اپنے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "میں یہ چاہتا ہوں کہ تمھارے بھائی کی طرح تمھارے درمیان آؤں اور تمھیں آسان زبان میں مفید باتیں بتاؤں۔ اگر میں تمھیں مفید باتیں نہ بتا سکا تو پھر ہم یہ سلسلہ ختم کر دیں گے اور اپنے اپنے کام میں لگ جائیں گے۔"

نوجوان ان کی سچائی اور صاف گوئی سے بڑے متاثر ہوئے اور انھوں نے ان کی یہ تجویز مان لی۔ چنانچہ انھوں نے کاشان میں اپنے محلے کی ایک چھوٹی سی مسجد میں درس کا آغاز کر دیا۔ جو نوجوان پہلے پروگرام میں شریک ہوئے وہ صرف سات تھے۔ استاد خود ان سے پہلے مسجد میں پہنچ گئے اور خدا سے دعا کی کہ وہ ان کی مدد فرمائے تاکہ اس زمانے میں جب طاغوت کا راج تھا اور ہر قسم کے اجتماع حتیٰ کہ مجالس عزا بھی حکومت سے ڈرتے ڈرتے

پولیس کی پیشگی اجازت سے منعقد ہوتی تھیں۔ وہ حکومت سے اجازت لیے بغیر اسلام کا پیغام نوجوانوں تک پہنچا سکیں۔

پہلا درس خدا کے مہینے (رمضان) میں، خدا کے گھر (مسجد) میں، خدا کی مدد سے اور انھیں سات نوجوانوں کی شرکت میں شروع ہوا۔ دوسرے درس میں نوجوانوں کی تعداد بڑھ گئی۔ استاد مسجد میں تختۂ سیاہ لے آئے اور ہر رات کو آسان زبان میں آدھ گھنٹے تک مسائل بیان کرتے رہے۔ ماہ مبارک ختم ہوا تو انھوں نے نوجوانوں سے کہا: "اگر تم چاہو تو میں ہر جمعہ کو تم سے بات چیت کرنے کے لیے قم سے آجایا کروں۔" انھوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور چار سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ استاد ہر جمعہ کو کاشان جاتے اور درس کہتے۔ رفتہ رفتہ نوجوانوں کی تعداد بڑھتی گئی، وہ روز بروز زیادہ دلچسپی لینے لگے اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے رہے۔

استاد محسن قرائتی نے یہ سارا ماجرا قم میں اپنے ساتھی طلباء سے بیان کیا تو ان میں سے بھی چند ایک کاشان گئے۔ انھوں نے اس علمی مجلس کو قریب سے دیکھا تو اسے بہت پسند کیا اور ایسی ہی علمی مجلسیں اپنے شہروں میں بھی قائم کردیں۔

رفتہ رفتہ انھوں نے اپنے دائرہ کار کو وسعت دی اور باہم مشورے سے یہ طے کیا کہ وہ ہر سال ایک جگہ اکٹھے ہو جایا کریں گے۔ وہ قم میں چھ سال تک یہ کام کرتے رہے، آپس میں مل بیٹھ کر مختلف تجویزوں پر غور کرتے اور اپنی اپنی کارکردگی سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے تھے اس طرح وہ اپنی خامیاں دور کرتے اور ایک دوسرے سے مفید باتیں سیکھتے تھے۔ آخرکار وہ درس کہنے میں ماہر ہو گئے اور اس میدان میں آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔

پہلوی حکومت کی بوکھلاہٹ اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ہر جلسے کو کسی نہ کسی طرح روک دیا جاتا تھا۔ جب موسم گرما آیا تو قم کے دینی طلباء نے "درس قرآن" کے عنوان سے ایک تعلیمی سلسلہ شروع کر دیا اور پورے ایران میں عام فہم تقریروں کے ذریعے سے نوجوانوں کو اسلام کے اعلیٰ مفاہیم سے روشناس کرانے لگے۔ خوش قسمتی سے حوزۂ علمیہ کے طلباء کے اشتراک سے یہ سلسلہ گاؤں گاؤں پھیل گیا۔

وہی بے رونق کلاسیں اور چند سال کی کوششیں رنگ لائیں۔ جو نوجوان دلجمعی اور دلچسپی سے ان کلاسوں میں شرکت کرتے تھے وہ اسلام کے پرجوش حامی بن گئے۔ اگرچہ استاد محسن قرائتی چوراہے کے سپاہی کی طرح ایک ہی جگہ پر رہے لیکن انھوں نے جن نوجوانوں کی تربیت اور رہنمائی کی، ان میں سے ہر ایک اپنے مقصد تک پہنچ گیا۔

ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد یہ کلاسیں اپنی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہونے لگی ہیں۔

آپ اس کتاب میں جو کچھ پڑھیں گے، وہ وہی باتیں ہیں جو استاد محسن قرائتی نے نوجوانوں سے طویل تعلیمی مدت میں کہی ہیں۔ یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ سمعی و بصری طریقے سے کلاس روم میں موقع و محل کی مناسبت سے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ سب کا سب لکھنے کے قابل نہیں ہوتا مثلاً سنگ تراشی ایک ہنر ہے لیکن آپ اسے کاغذ پر لانا چاہیں تو پتھر اور چھینی کے الفاظ کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتے جبکہ ان چیزوں کے نام لکھنے سے آپ سنگ تراشی کی حقیقت کو دوسروں پر واضح نہیں کر سکتے۔ اسی طرح درس کہنا اور بیان کرنا بھی ایک ہنر ہے جو ہر مدرس

کو تجربہ کار اور ماہر لوگوں کو قریب سے دیکھ کر اور خود اپنے تجربے سے حاصل کرنا چاہیے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو صرف مطالعے سے آجائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عقل، فطرت، آیات قرآنی اور ارشادات معصومینؑ کو ان اسباق میں استدلال کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ جہاں تک ہوسکا یہی کوشش کی گئی ہے کہ غیر مانوس اصطلاحوں اور غیر ضروری طوالت سے پرہیز کیا جائے۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ان اسباق کے مخاطب اٹھارہ سال تک کے نوجوان ہیں۔ نیز مسائل کو کہاوتوں اور مثالوں کے ذریعے سے پیش کیا گیا ہے کیونکہ اس طرح:

۱۔ مسائل خشک استدلال سے نکل کر حسّی ہوجاتے ہیں۔

۲۔ بات آسانی اور درستی کے ساتھ جلدی سمجھ میں آجاتی ہے۔

۳۔ مثالوں میں مسئلہ کی مختلف اشکال کو دیکھ کر دل کو اطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔

۴۔ ضدی لوگ مثالوں کو دیکھ کر بات ماننے لگتے ہیں۔

اس بنا پر ان اسباق میں مختلف مسائل سمجھانے کے لیے واضح مثالوں سے کام لیا گیا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کا طریقہ تعلیم بھی تمثیلی ہے اور دیگر تمام علوم میں بھی مثالوں سے مدد لی جاتی ہے۔

اس پیش لفظ کا خلاصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ "دورۂ سطح" کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آئیڈیالوجی اور اصول عقائد کی تدریس کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیے یا یہ کام ایسے لوگوں کی نگرانی میں سرانجام دیا جانا چاہیے جو کارآشنا ہوں ورنہ کج فہمی اور گمراہی

کا خطرہ رہتا ہے۔

۲۔ خدا کی خوشنودی اور اس کی راہ پر توجہ جمانے کے بعد فیصلہ کرنے میں دو باتوں کو نظر میں رکھنا چاہیے ایک معاشرے کی ضرورت، دوسرے ذاتی شوق اور فطری رجحان۔

۳۔ جس نے راستا پہچان لیا ہو اسے دوسروں کی ہمراہی کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

۴۔ جس نے راستا پہچان لیا ہو اسے دوسروں کے بلاوے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

۵۔ ہر مذہبی معلم و مقرر پر لازم ہے کہ دوسرے استادوں کی طرح اپنے آپ کو ایک یا ایک سے زیادہ شعبوں میں تیار کرے اور ان میں خصوصی مہارت حاصل کرے (کچھ لوگ اسلامی تاریخ میں، کچھ اسلامی فلسفے میں، کچھ اصول عقائد میں، کچھ تفسیر میں اور کچھ بچوں اور نوجوانوں کو پڑھانے میں تخصّص حاصل کریں)۔

یہاں ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہمیں اپنی مسجدوں کے لیے بھی خاص قسم کا پروگرام مرتب کرنا چاہیے مثلاً کسی علاقے کی ایک مسجد مذہبی اجتماعات اور لڑکیوں کو پڑھانے کے لیے مخصوص ہو تو دوسری مزدوروں کے لیے ایک اور مسجد میں ایک وقت میں نوجوانوں کو تعلیم دی جاتی ہو تو دوسرے وقت میں گرہستی عورتوں کو پڑھایا جاتے کیونکہ جب تک درس میں شریک ہونے والوں کی عمر، قابلیت اور پیشے کے لحاظ سے درجہ بندی نہیں ہوگی مدرس اپنی گفتگو کے لیے کوئی بنیاد نہیں بنا سکے گا۔ ہم جو ذہنی انقلاب کے

حامی ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں تبدیلی آئے اور وہ اسلامی ہو جائیں تو ہمیں یہ بھی چاہیے کہ مسجدوں کے پروگرام بھی بدلیں جو اسلام کے قلعے ہیں اور تمام مسلمانوں کے لیے عام درسگاہیں سمجھی جاتی ہیں تاکہ ان میں نمازِ جماعت اور محافل و مجالس کے علاوہ مختلف طبقوں کے لیے خصوصی تعلیم کے مکمل منصوبے بھی موجود ہوں جیسے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام عام تعلیم و تربیت کے علاوہ شاگردوں کے ہر گروہ کو اس شعبے کے متعلق جس میں وہ زیادہ دلچسپی رکھتے تھے خاص معلومات سے بہرہ مند فرمایا کرتے تھے۔

ہم اس دن کی آمد سے پر امید ہیں جب ہماری مسجدوں میں قوم کے ہر طبقے کے لیے مخصوص دستورِ عمل اور خاص وقت معین ہو جائے گا اور صحیح ہم آہنگی، خیر خواہی اور اخلاص و اتحاد کے ماحول میں مخاطِب اور مخاطَب افادہ و استفادہ کر سکیں گے اور ہم موجودہ تفرقوں سے نجات پالیں گے۔

یہ بات کس قدر افسوسناک ہے کہ ہمارے ہاں بچوں کے علاج کے لیے ماہر معالجین اور ان کی سیکولر تعلیم کے لیے ماہر معلمین موجود ہیں لیکن ان کے لیے اسلام شناس ماہرین نہیں ہیں حالانکہ بچوں اور جوانوں کو اسلامی تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنا اسی طرح مشکل ہے جس طرح چھوٹی گھڑی کا بنانا بڑی گھڑی سے زیادہ نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ چونکہ مختلف عمر میں اور طرح طرح کے میلانات رکھنے والے تمام انسانی گروہوں کو ایک ہی بات ایک ہی طریقے سے نہیں سمجھائی جا سکتی اس لیے اب تک اصلاحِ احوال کے لیے جتنی کوششیں کی گئی ہیں ان سے بہت کم فائدہ پہنچا ہے۔

جب آیت اللہ مرتضیٰ مطہری نئی نسل کے لیے ایک کتاب "داستانِ راستان"

لکھتے ہیں یا عبد الفتاح عبد المقصود مصری جیسے معمر اسکالر بڑی بڑی کتابوں کی شرحیں تحریر کرنے کے بعد نوجوانوں کے لیے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں یا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مبلغ سے فرماتے ہیں کہ وہ اپنے علاقے میں نوجوانوں کو تلاش کریں اور ان سے رابطہ رکھیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کام کی قدر و قیمت کتنی زیادہ ہے البتہ ہمارے ہاں بچوں اور جوانوں کے لیے جو کتابیں سادہ زبان میں لکھی گئی ہیں (اگرچہ ہمیں لازم ہے کہ ہم خداوند تعالیٰ سے ان لکھنے والوں کے لیے جزائے خیر کی دعا کریں) وہ کافی نہیں ہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ کام رسمی اور عملی طور پر عام ہو جائے۔

نوجوانوں کے لیے اعتقادی مسائل سے متعلق یہ کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے مندرجات ان لوگوں کے لیے بہترین معاون ثابت ہوں گے جو اسلام کے اعتقادی مسائل کی تعلیم دینے میں مشغول ہیں۔

ہم خداوند عالم سے عمل، اخلاص اور اثر کی توفیق چاہتے ہیں۔

(ناشرین)

توحید

جہاں بینی کے معنی

ہم سب نے "جہاں بینی" کا لفظ سنا ہوا ہے۔ جہاں بینی یعنی زندگی کی مکمل تفسیر۔

کچھ لوگ جو اس کائنات کو دیکھتے ہیں وہ اسے ایسی بامقصد تخلیق پاتے ہیں جو شعور کی کارفرمائی سے وجود میں آئی ہے' ایک بنیاد پر قائم ہے اور تنظیم اور حساب رکھتی ہے۔ اسے "الٰہی جہاں بینی" کہتے ہیں۔

کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ نہ دنیائے موجودات کا پہلے سے تیار کیا ہوا کوئی منصوبہ ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مدبر ہے۔ نہ اس کا کوئی مقصد ہے اور نہ حساب۔ اس نقطۂ نظر اور طرز خیال کو "مادی جہاں بینی" کہتے ہیں۔

غرض دنیائے موجودات اور خود اپنے متعلق انسان کا مکمل نقطۂ نظر اور تفسیر جہاں بینی ہے۔

جہاں بینی پر بحث کا فائدہ

ان دونوں نظریات کے فائدے اور نتیجے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر میں یہ سوچوں کہ اس بڑے گھر (کائنات) کا کوئی مالک کوئی حساب اور کوئی مقصد ہے تو مجھ پر یہ لازم ہے کہ اپنے آپ کو گھر کے مالک (خدا) کی رضاجوئی کے لیے اس طریقے کے مطابق ڈھالوں جو اس نے وحی اور پیغمبروں کے واسطے سے انسان کے لیے مقرر کر دیا ہے اور اگر یہ کائنات کسی منصوبہ بندی، مقصد اور حساب کے بغیر ہی وجود میں آئی ہے تو پھر میرے لیے بھی کسی قاعدے اور ضابطے کی پابندی قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

آجکل "انسانِ متعہد و مسؤل" کے الفاظ کا استعمال بہت عام ہے۔ ہم اس وقت مسؤل اور ذمہ دار ہوتے ہیں جب ہم کسی کے زیر نگرانی ہوں، ہم سے کوئی باز پرس ہو اور زندگی کا کوئی حساب کتاب اور مقصد ہو۔ اس اعتبار سے ہم صرف "الٰہی جہاں بینی" ہی میں پابند اور ذمہ دار انسان بن سکتے ہیں۔

مادی نقطۂ نظر سے یہ پوری کائنات کسی پہلے سے تیار کیے ہوئے نقشے کے بغیر وجود میں آئی ہے اور اس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ صورت اختیار کر لی ہے۔ تمام انسان فنا کی طرف جا رہے ہیں اور موت انہیں مٹا دے گی۔ زندگی کا واحد مقصد عیش و نوش ہے، اس کے بعد بس فنا ہے۔ اس اندازِ فکر کے مطابق میں اپنے آپ سے کہہ سکتا ہوں کہ میں کیوں زندہ رہوں؟ کیوں نہ خودکشی کر لوں؟ جب مجھے برسوں کی مصیبت اٹھانے کے بعد بھی مر جانا ہے تو جلد سے جلد کیوں نہ اس قیدِ حیات

سے چھوٹ جاؤں؟ اس لیے اگر زندگی کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں تو وہ صرف الٰہی جہاں بینی کے سائے میں ہی ہو سکتے ہیں۔

جب تک آپ اس شخص کو اچھی طرح جان پہچان نہیں لیتے جو بے موقع آدھی رات کے وقت آپ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، آپ دروازہ نہیں کھولتے۔ جب تک ہم یہ نہ جان جائیں کہ اس شہر کی آب و ہوا جہاں ہم جانا چاہتے ہیں کیسی ہے اس وقت تک ہم یہ طے نہیں کر سکتے کہ اپنے ساتھ کیسے کپڑے لے جائیں۔ جب تک ہم کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ جہاں ہمیں بلایا گیا ہے وہ سوگ کی مجلس ہے یا شادی کی تقریب ہے ہم یہ طے نہیں کر سکتے کہ ہم وہاں کیسا لباس پہن کر جائیں۔ پس ضروری ہے کہ ہمارا علم واضح ہو تا کہ ہم اپنے فرض کو پہچان سکیں۔ اس بنا پر عقیدہ، طرزِ فکر اور شناخت دوسرے لفظوں میں ہمارا طرزِ جہاں بینی ہی ہمارے انتخاب کی نوعیت اور طریقے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

طرزِ جہاں بینی کا انتخاب

اس سے قبل ہم کہہ چکے ہیں کہ کائنات اور انسان کے متعلق دو قسم کے نظریات ملتے ہیں:

۱۔ الٰہی نظریہ، جو کائنات کے لیے ایک مالک، حساب، نقشہ، مدبر اور مقصد کو قبول کرتا ہے۔

۲۔ مادی نظریہ، جو دنیا کو بے مالک، بے تدبیر، بے نقشہ، بے مقصد اور زوال پذیر قرار دیتا ہے۔

جہاں بینی کی صورت اور اس کے نتائج کے پیشِ نظر جیسا کہ ہم نے پہلے

کہا ہے انسان کو ان دو نظریات میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا چاہیے۔

بہترین نظریے کی پہچان ان چند باتوں سے ہوتی ہے۔

۱۔ وہ جہاں بینی جو عقل، دلیل اور ثبوت سے تعلق رکھتی ہو۔

۲۔ وہ نقطۂ نظر اور تشریح جو ہماری فطرت سے ہم آہنگ ہو۔

۳۔ وہ جہاں بینی قابلِ قدر ہے جو انسان کو ذمہ داری، خوشی اور امید سے ہمکنار کرتی ہے۔

اب ہم مندرجہ بالا علامات کے لحاظ سے اس پہ غور کرتے ہیں۔

الٰہی جہاں بینی کا پہلا اصول

توحید

عقل ہمیں بتاتی ہے کہ ہر نتیجے کا ایک سبب ہوتا ہے اور یہ بات اس قدر روشن ہے کہ اگر آپ کسی نومولود کے بدن پر ایک ہلکی سی پھونک ماریں تو وہ اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے اور سبب کے پیچھے ادھر اُدھر نگاہ دوڑاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ اس پھونک کا کوئی سبب ضرور ہے۔ جی ہاں! نتیجے سے سبب کے سراغ لگانے کا مسئلہ ہماری روزمرہ زندگی کے واضح ترین مسئلوں میں سے ہے۔ تمام عدالتوں میں جج اور وکیل علامتوں اور قرینوں ہی سے اصل مطلب تک پہنچتے ہیں مثلاً یہ بات کیسے مان لی جائے کہ مرغے یا مور کی تصویر کسی فوٹوگرافر یا مصوّر کی محتاج ہو مگر خود مرغا یا مور کسی تدبیر اور مدبّر کے بغیر ہی پیدا ہو گیا ہو۔ عقل کو کیسے مطمئن کریں کہ کیمرے کا تو کوئی موجد ہے لیکن انسانی آنکھ کا کوئی باشعور خالق نہیں ہے حالانکہ آنکھ کی فوٹوگرافی کیمرے کی فوٹوگرافی سے

کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ کیمرہ جتنی بار فوٹو لیتا ہے ہم اس کی فلم بدلتے رہتے ہیں لیکن ہماری آنکھ برابر فوٹو لیتی رہتی ہے۔ کیمرے عام طور پر سادہ فوٹو لیتے ہیں یا رنگین لیکن ہماری آنکھ سادہ فوٹو بھی لیتی ہے اور رنگین بھی، پاس سے بھی اور دور سے بھی، دھوپ میں بھی اور سائے میں بھی۔ پھر عقل کیسے مان لے کہ آئل ریفائنری کا تو بنانے والا ہو لیکن نظامِ ہضم کا کوئی مدبر نہ ہو اور ہم کیسے تسلیم کریں کہ انسانی جسم کا نظام تو انسان میں شعور کی موجودگی کی دلیل ہو لیکن کائنات کا نظام اس میں ایک باشعور منتظم کی موجودگی کی دلیل نہ ہو۔ کائنات کے اندھے بہرے عناصر نے اپنے اندر کس طرح ایسے قوانین جاری کر لیے ہیں کہ ان میں سے محض کسی ایک قانون کی دریافت میں ایک محقق اپنی پوری عمر صرف کر دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر جہاں بینی کا اصول یہ ہے کہ اسے عقل مان لے تو اس کائنات کا باریک حساب اور انتظام دیکھتے ہوئے پہلی ہی نظر میں عقل اس کے لیے ایک باشعور ہستی کو مان لیتی ہے اور اسی عقل کی مدد سے انشاء اللہ اس بارے میں تمام شکوک و شبہات کا جواب بھی دیا جائیگا۔

اس زندگی کا مطالعہ جس میں اس قدر تنظیم اور قطعیت ہے الٰہی نظریے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ یہ اس نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کے درست ہونے کی پہلی علامت ہے۔ الٰہی جہاں بینی کی درستی کی دوسری علامت فطرت سے مطابقت ہے۔ مجھے اس مقام پر دوستوں کے لیے فطرت کی تشریح کر دینا چاہیے تاکہ جب ہم یہ کہیں کہ خدا شناسی ایک فطری امر ہے تو ہم اس آگاہی سے مستفید ہو سکیں۔

فطرت کیا ہے؟

"فطرت" کا لفظ "خلقت" کے وزن پر ہے اور اس کے معنی بھی دیتا ہے۔ انسان میں ہر قسم کا وہ جذبہ جس کے ابھرنے میں تربیت، تلقین، استاد اور مربی کی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ جذبہ انسان میں دائمی اور مستقل ہے اور سب لوگوں میں تمام مقاموں اور وقتوں میں برقرار رہتا ہے اسے کبھی فطرت اور کبھی جبلت سے تعبیر کیا جاتا ہے، البتہ عام طور پر جبلت اس بڑے جذبے اور میلان کو کہتے ہیں جو حیوان اور انسان دونوں میں پایا جاتا ہے۔ ہاں کسی بات کے فطری ہونے کی علامت اس کی یہی عمومیت ہے مثلاً بیٹے سے ماں کی محبت فطری ہے یعنی یہ ماں کا ایسا جذبہ ہے جو معلم، مربی اور کسی تلقین کے بغیر ماں کی خلقت میں چھپا ہوا ہے اور عمومیت رکھتا ہے۔ آپ جہاں جائیں گے ہر وقت، ہر جگہ، ہر حکومت اور ہر نظام میں ماؤں میں مامتا ضرور پائیں گے البتہ یہ ممکن ہے کہ کبھی کچھ عناصر اس جذبے میں کمی یا بیشی کا سبب بن جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کوئی ایک داخلی جذبہ دوسرے جذبے پر غالب آجائے۔

یہ مان لیجیے کہ ہر انسان کو مال سے بھی محبت ہے اور خوشی اور سلامتی سے بھی لیکن یہ محبتیں تمام انسانوں میں ایک سی نہیں ہوتیں۔ کچھ لوگ مال کو جان پر نچھاور کرتے ہیں اور کچھ جان کو مال پر قربان کر دیتے ہیں۔ چونکہ جس طرح بعض اوقات آبرو کی خاطر (اس لیے کہ بیٹی کا ہونا باعث شرم ہے) باپ اولاد کی محبت سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور بیٹی کو زندہ دفن کر دیتا ہے اس لیے کسی بات کے فطری ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان ہمیشہ اس کے مطابق عمل

کرتا ہے کیونکہ اکثر ایک فطری تقاضا ایک دوسرے فطری احساس کو دبا دیتا ہے فطری مسائل کی نشانیوں میں سے ایک افتخار کا جذبہ ہے۔ جو کوئی بھی فطرت کی زمین پہ قدم رکھتا ہے وہ اپنے اندر ایک طرح کے سکون کا احساس کرتا ہے۔ جو ماں اپنے بیٹے کو بغل میں لیے ہوتی ہے وہ اس پہ فخر کرتی ہے بلکہ اس ماں پر اعتراض کرتی ہے جو اپنے بیٹے سے رکھائی برتتی ہے۔ وہ فخر اور یہ نکتہ چینی دونوں فطری باتیں ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ خداشناسی بھی ایک فطری جذبہ ہے یا نہیں؟

ہم ہر وقت، ہر جگہ اور ہر مسلک کے ہر انسان سے پوچھتے ہیں کہ اس کائنات کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں؟ کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ خود کفیل ہیں یا اپنے اندر محتاجی کا احساس رکھتے ہیں؟ کوئی نہیں ہے جو یہ کہے کہ میں اس دنیا میں اپنے آپ کو خود کفیل محسوس کرتا ہوں۔ سب کے سب اپنے اندر محتاجی کا احساس رکھتے ہیں لیکن یہ سچا احساس دو طرح سے تسکین پاتا ہے:

۱۔ سچا احساس سچی تسکین کے ساتھ

۲۔ سچا احساس جھوٹی تسکین کے ساتھ

اس بچے کی مثال لیجیے جو بھوک کا احساس کرتا ہے۔ یہ سچا احساس ہے جو کبھی ماں کا آنچل دبا کر سچ مچ کی تسکین پاتا ہے اور کبھی یہ احساس سوکھی چسنی چوس کر جھوٹ موٹ کی تسکین پاتا ہے۔ انسان میں محتاجی کا احساس ایک واقعہ اور ایک حقیقت ہے لیکن محتاجی کس کی؟

۱۔ خدائی قوت کی؟

۲۔ فطری قوت کی؟

خود فطرت بھی سیکڑوں شرائط کی پابند ہے اس لیے ہمیں ایسی قوت کا محتاج

ہونا چاہیے جو ہماری طرح کسی اور کی محتاج نہ ہو۔

نبیوں کا کام

نبیوں کا کام یہ ہے کہ انسان کے لطیف جذبات کی جھوٹی تسکین نہ ہونے دیں۔ اس ضمن میں ماں کے عمل اور سرپرستی کی مثال ہمارے سامنے ہے، جو بچے کو بھوک کی حالت میں ہر قسم کی غذا نہیں کھانے دیتی۔ تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ نبیوں کی رہبری قبول نہیں کرتے رہے وہ کیسی کیسی مصیبتوں میں گرفتار ہوتے رہے ہیں۔

کیا اطاعت کا حکم انسانوں کی آزادی کے منافی ہے؟

کبھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاؑ اور آسمانی مذاہب ہم کو خدا کی عبادت کرنے کی طرف بلاتے ہیں تو یہ بات انسان کی آزادی کے منافی ہے لیکن غور کیجیے کہ انسان کچھ اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ وہ عشق، عبادت، میل جول اور امید کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کی سرشت میں محبت اور عبادت کا جذبہ رکھ دیا گیا ہے چنانچہ اگر نبیوں کی رہبری میں اس جذبے کی تہذیب نہیں ہوتی تو وہ بتوں، ستاروں، انسانوں اور طاغوتوں کو پوجنے بیٹھتا ہے اس لیے خدا کی یہ عبادت اور بندگی انسانی آزادی کے منافی نہیں بلکہ یہ اس جذبے کی ایک سچی تسکین ہے جو جھوٹی تسکین کو روکتی ہے اور عشق و محبت کے راستے میں کجی نہیں آنے دیتی۔

اب ہم اصل بحث کی طرف پلٹتے ہیں

الٰہی جہاں بینی اور خدا پر ایمان اپنی ایک فطری بنیاد رکھتا ہے یعنی دنیا میں بیکراں قدرت کی محتاجی کا احساس تمام انسانوں میں موجود ہے اگرچہ کبھی کبھی وہ اس بات کے سمجھنے میں غلطی بھی کر جاتے ہیں کہ بیکراں قدرت خدا کی قدرت ہے یا فطرت کی قوت ہے۔

بہرحال اصل چیز محتاجی کا احساس ہے اس لیے الٰہی جہاں بینی جو پوری کائنات کو ایک بیکراں اور باشعور قدرت کا محتاج سمجھتی ہے انسانی فطرت سے بھی ہم آہنگ ہے جو اپنے آپ کو محتاج سمجھتی ہے اور یہ الٰہی جہاں بینی کی صداقت کی ایک اور دلیل ہے۔

جہاں بینی کے بہترین نظریے کی تیسری علامت یہ ہے کہ وہ انسان کو امید، عشق اور ذمہ داری عطا کرتی ہے۔ اگر کسی مدرسے کا ایک طالب علم یہ جان لے کہ اس کی محنتیں بیکار نہیں جائیں گی اور اس کے حاصل کردہ نمبر کا سوال حصہ تک شمار میں آئے گا اور اس کے معقول عذر قبول کیے جائیں گے تو وہ خصوصی لگن کے ساتھ تحصیل علم جاری رکھے گا۔ الٰہی جہاں بینی میں انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ ہر وقت خدا کی نگرانی میں ہے۔ اس کا عذر قابل قبول ہے اور اس کی ذرہ بھر نیکی یا بدی سے بے توجہی نہیں برتی جا رہی ہے۔ نیک کام کا خریدار خدا ہے اور اس کے جان و مال کا عوض بہشت اور رضوان ہے۔ ایک طرف غیبی سہارے اور دوسری طرف

شک و شبہ، بھول چوک اور غلطی سے پاک الٰہی جہاں بینی کا یہ مکتب انسان کے دل میں امید کے چراغ جلا سکتا ہے۔

کس قسم کا ایمان اور میلان قابلِ قدر ہے؟

قرآن مجید میں ایمان اور میلان کی مندرجہ ذیل صورتوں پر نکتہ چینی کی گئی ہے:

وقتی اور عارضی میلان: مثلاً جیسے ہی خطرہ محسوس ہوا اور اپنی کشتی کو ڈوبنے کے قریب دیکھا تو "یا اللہ" کی فریاد بلند کر دی لیکن جونہی مصیبت سے چھٹکارا ملا اور اپنی کشتی کو کنارے پر پایا تو دوبارہ غیرِ خدا کے پیچھے چل دیے اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔

ہم قرآن میں پڑھتے ہیں:

> پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو نہایت خلوص سے اسکی عبادت کرنے والے بنکر خدا سے دعا کرتے ہیں، پھر جب وہ انھیں خشکی میں (پہنچا کر) نجات دیتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔ (سورۂ عنکبوت-آیت ۶۵)

۲- کبھی ایمان اور میلان کسی عقلی دلیل اور برہان کے بغیر صرف باپ داداؤں اور پرکھوں کی تقلید کی خاطر ہوتا ہے جیسے بت پرستوں کا ایمان جو نبیوں کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم نے بتوں کی پوجا کا یہ عقیدہ اپنے بزرگوں اور پرکھوں سے لیا ہے۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے:

کہنے لگے ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایسا ہی کرتے پایا۔

(سورۂ شعراء۔ آیت ۷۴)

۳۔ کبھی یہ ایمان دل وجان سے نہیں بلکہ محض ظاہری ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

یہ عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے (اے رسولؐ!) کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ (یوں) کہو کہ ہم اسلام لائے حالانکہ ایمان کا تو ابھی تک تمہارے دلوں میں گزر ہوا ہی نہیں۔

(سورۂ حجرات۔ آیت ۱۴)

۴۔ کبھی ایمان عمل کے بغیر ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ شخص علم رکھتا ہے لیکن عمل کے لحاظ سے سست ہوتا ہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں پر نکتہ چینی سے متعلق بہت سی آیتیں ملتی ہیں۔

کون سا ایمان قابل قدر ہے؟

قرآن کی رُو سے صرف وہ ایمان قابل قدر ہے جس کی بنیاد عقل اور صحیح سوچ بچار پر ہوتی ہے ہم قرآن میں پڑھتے ہیں:

اور (وہ لوگ جو) آسمانوں اور زمین کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں اور (بے ساختہ) کہہ اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے خدا! تو نے انہیں بے فائدہ پیدا نہیں کیا ہے۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۹۱)

خدا پر ایمان کے آثار

۱۔ عشق اور امید کا جذبہ

جو شخص یہ جانتا ہے کہ اس کے تمام اعمال شمار میں آتے ہیں اور اس کا کوئی بھی عمل ضائع نہیں جاتا اور اس کی کوشش کا خریدار خدا ہے اور وہ بھی بہشت اور رضوان کے عوض، یہاں تک کہ وہ کبھی کبھی کسی کوشش کے بغیر بھی صرف انسان کی نیک نیتی پر ہی انعام واکرام عطا کر دیتا ہے تو وہ شخص عشق اور امید کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔

۲۔ وہ مکاری، کمینگی اور ریاکاری سے دور رہتا ہے۔

جو شخص اپنے آپ کو خدا کے سامنے حاضر اور خدا کو اپنا ناظر جانتا ہے وہ کسی قسم کا دھوکا اور مکر نہیں کر سکتا۔

۳۔ عزّت

جس شخص نے خدا کی اطاعت قبول کر لی ہو وہ اس کے علاوہ کسی اور قوت اور منصب کے سامنے نہیں جھکتا اور سب کو اپنی ہی طرح کا انسان سمجھتا ہے۔

۴۔ وہ گھاٹے میں نہیں رہتا

چونکہ وہ اپنے وقتی عمل کے عوض باقی رہنے والا اور دائمی بدلا پاتا ہے اور قسم قسم کے کمزور سہاروں کے بجائے خدا ہی کا آسرا لیتا ہے اس لیے وہ ہرگز گھاٹے میں نہیں رہتا۔

۵۔ وہ خصوصی سکون پاتا ہے

اب ہم ڈر اور بے چینی کے اسباب کا پتا لگائیں یعنی یہ دیکھیں کہ خدا پر ایمان کس طرح سکون بخشتا ہے۔

پریشانی کے اسباب

۱۔ کبھی پچھلی برائیوں اور غلطیوں سے پریشانی سے خوف لاحق ہو جاتا ہے تو غفار اور رحیم خدا کی یاد اس اضطراب کو سکون سے بدل دیتی ہے کیونکہ وہ گناہوں کو معاف کرتا اور توبہ قبول کرتا ہے۔

۲۔ کبھی اپنی تنہائی کے خیال سے پریشانی ہوتی اور ڈر لگتا ہے تو حاضر و ناظر خدا پر ایمان اس اضطراب کو سکون سے بدل دیتا ہے۔ وہ ساتھی بھی ہے اور ہمدرد بھی۔ ہماری باتوں کو سنتا ہے، ہمارے اعمال کو دیکھتا ہے اور ہم پر مہربانی کرتا ہے۔

۳۔ کبھی اپنی بے مقصد زندگی اور نکمے پن کے احساس سے بے چینی ہوتی ہے لیکن اس حکمت والے خدا پر ایمان رکھنے سے پریشانی دور ہو جاتی ہے جس نے اس دنیا کی ہر شے کو اپنی حکمت کے مطابق اور ایک مقصد کے لیے اور وہ بھی ایک مقرر کی ہوئی مقدار اور ایک شمار کی ہوئی مدت میں ایک خاص دائرے میں پیدا کیا ہے۔

۴۔ کبھی پریشانی اور بے چینی اس لیے ہوتی ہے کہ انسان سب کو خوش نہیں کر پاتا اور اب بے آرام ہے کہ میں نے فلاں شخص یا فلاں جماعت کو

کیوں ناراض کر دیا لیکن اس بات پر ایمان کہ ہم کو فقط اپنے خدا کو راضی رکھنا چاہیے کہ عزت اور ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے اس بے چینی کو دور کر دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ:

جان لو کہ خدا کی یاد دلوں کو تسکین دیتی ہے (سورہ رعد-آیت ۲۸)

تو یہ ایک حقیقت ہے۔

بے ایمانی کے آثار

جو شخص موجوداتِ عالم کے اصلی سبب یعنی خدائے حکیم پر ایمان نہیں رکھتا وہ ایک ایسا انسان ہے جو:

۱۔ اپنے آپ کو بے اعتبار، بے مقصد اور اکیلا پاتا ہے اور اس کا مقصد جانوروں اور پرندوں کی طرح فقط اس مادی زندگی کی راحت ہوتا ہے۔

۲۔ اپنے کام کو ایک طرح کے دباؤ کے تحت سرانجام دینے کا احساس رکھتا ہے مثلاً معاشرے اور قوم کا دباؤ۔

۳۔ فنا کو اپنی آنے والی منزل سمجھتا ہے کیونکہ موت کے بعد کی زندگی اور روح کی بقا پر اس کا اعتقاد نہیں ہوتا۔

۴۔ اس کی زندگی کی باگ ڈور بیرونی طاغوتوں اور اندرونی خواہشوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

۵۔ اس کا دستورِ حیات (چونکہ وحی اور معصوم نبیوں سے حاصل نہیں ہوا) طرح طرح کے نظریوں، مجبوریوں، خامیوں اور غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔

۱۰۔ زندگی کی تشریح میں جو اس باختہ ہے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ کیوں آیا ہے اور کیوں جا رہا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس کی سوچ بس یہ ہے کہ زندگی کس طرح بسر کرے؟ یہ نہیں ہے کہ کس لیے جیے؟ ہاں یہ اس شخص کی خصوصیات ہیں جو الٰہی جہان بینی اور اسلامی عقیدوں سے دور ہے۔

آپ خدا کو ماننے والے اور نہ ماننے والے دو انسانوں کے چہروں کی عکاسی سے ایمان کی تصویر دریافت کر سکتے ہیں۔

مذہب کے بارے میں مادہ پرستوں کی بے جان توجیہیں

اب جب کہ ہم نے دو چیزوں "عقل" اور "فطرت" کو خدا پر ایمان کا سبب اور اصل بنیاد تسلیم کر لیا ہے عقل کہتی ہے کہ مظہر کا ظاہر کرنے والا ضرور ہوتا ہے کیونکہ ہم نے جہاں کہیں تنظیم اور حساب کو دیکھا ہے وہاں حساب لگانے والے کا بھی پتا ملتا ہے۔ فطرت کہتی ہے کہ ہر انسان اپنے اندر اپنے سے بالا قوت کی محتاجی کا احساس رکھتا ہے لیکن ایک گروہ نے ان دونوں اسباب یعنی عقل اور فطرت کو نظر انداز کر دیا ہے اور خدا پر ایمان کی ایک بے جان سی وجہ ڈھونڈ نکالی ہے۔ ہم مختصراً ان توجیہات کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں۔

اشتمالی نظریوں کی رسوائی

کمیونزم کی زندگی کا جو دن گزرتا ہے، اس کا ایک نہ ایک نظریہ باطل ہو جاتا

ہے مثلاً ایران کے اسلامی انقلاب میں اس کے کتنے ہی نظریوں کا بطلان تمام لوگوں پر ظاہر ہو گیا اور اس کو رسوا کر گیا۔

کمیونزم کا کہنا ہے کہ "دین قوموں کے لیے افیم ہے۔" دین لوگوں کو کاہلی، ذلت، اطاعت اور بے حسی کے سکوت کی طرف کھینچ لے جاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایران میں دین نے لوگوں کو کاہلی کے بجائے حرکت دی۔

کمیونزم کا دعویٰ ہے کہ اگر کسی میں اخلاقی نقطۂ نظر سے نقص ہے تو اس کی وجہ مالی کمزوری ہے مثلاً اگر کوئی شخص چوری کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے ناداری نے تنگ کر دیا ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ ایران کا بے ایمان حکومتی ٹولہ فقیر نہیں تھا۔

کمیونزم کے مطابق انقلاب کا سبب محروموں کی بے چینی اور استحصال کرنے والوں کے خلاف بھوکے طبقوں کا ٹوٹ پڑنا ہے لیکن ایران کا انقلاب آزادی، استقلال اور خدا کی حاکمیت قائم کرنے کے لیے برپا ہوا ہے۔ روٹی پانی یا مہنگائی سستائی کے لیے نہیں۔ اگر انقلاب اصل میں صرف محروموں کا ابال ہے تو ایران کا انقلاب کردستان اور سیستان وغیرہ سے شروع ہوتا کیونکہ یہ علاقے زیادہ محروم ہیں لیکن جو انقلاب مدرسۂ فیضیہ سے روحانیت کی رہبری میں شروع ہوتا ہے اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ عاشورے اور چہلم کے دنوں میں اپنے عروج کو پہنچتا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ انقلاب کی جڑ مکتب ہے، پیٹ نہیں۔ طاغوتی قانون کے مقابلے میں خدائی احکام کا انتخاب محروموں کا ابال نہیں ہے البتہ ہم مالیات اور محرومیت کے اثر سے انکار نہیں کرتے لیکن انقلاب کا اصلی محرک کیا تھا، پیٹ اور ابال یا مذہب اور انتخاب؟

کیسے کیسے لوگ تھے جنہیں زندگی کی تمام آسائشیں حاصل تھیں لیکن انھوں نے اپنی آسائشیں انقلاب کی کامیابی کے لیے ترک کر دیں۔

چوتھی رسوائی جو مادی جہاں بینی کے سلسلے میں ہماری بحث میں شامل ہے ایمان اور مذہب کی وہ بے جان توجیہہ ہے جو کمیونزم نے کی ہے اور وہ یہ ہے کہ سرمایہ دار اپنے رجعت پسند گماشتوں کے ذریعے سے عوام کو مذہب کی آڑ میں خاموش رہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ قوم کے محروموں سے کہتے ہیں کہ صبر کرو کیونکہ خدا صابروں کو دوست رکھتا ہے۔ اگر لوگوں نے تمہارا حق مار لیا ہے تو برداشت کرو یا کہتے ہیں کہ دنیا ہیچ ہے۔ اصلی چیز تو آخرت ہے یا یہ کہتے ہیں کہ انقلاب برپا نہ کرو بلکہ مہدیؑ موعود کا انتظار کرو، وہ خود آکر اصلاح کریں گے یا کہتے ہیں کہ تقیہ کرو اور تم نے جو کچھ دیکھا ہے اسے بیان نہ کرو۔ سرمایہ دار اسی طرح کی باتیں اور خیالات اپنے چیلوں کی زبان سے مذہب کے نام پہ عوام کے ذہنوں میں بٹھا دیتا ہے اور اس طریقے سے عوام کو جدوجہد اور اپنے جائز حقوق کے حصول سے روکتا ہے۔

آپ سوچیے کہ یہ بات منطق سے کتنی دور اور مہمل ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ایک ایسے زمانے میں موجود ہیں جب ہمارے نوجوانوں کی سمجھ اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ وہ کمیونزم کے ان باطل نظریات کی تردید کر سکتے ہیں کیونکہ صرف لمحہ بھر سوچ کر مسلمان جوان کمیونسٹوں سے پوچھتے ہیں:

۱۔ اگر سرمایہ دار نے محروم انسان کو خاموش کرنے کے لیے مذہب کو ایجاد کیا ہے تو پھر مذہب میں ایسے قوانین کیوں ہیں جو سرمایہ دار کی تھیلی خالی اور اس کا مال ضبط کر لیتے ہیں؟ استحصال، ظلم، رشوت، گرانفروشی،

کم فروشی، سود، ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ نیز غیر آباد اور ویران زرعی زمین کی فروخت سے جو کچھ ہاتھ لگتا ہے اسلام اس سب کو جو غلط اور ناجائز طریقے سے جمع ہوتا ہے سرمایہ دار سے واپس لے لیتا ہے اگر سرمایہ دار کوئی مذہب ایجاد کرتا تو کیا وہ ایک ایسا مذہب ہوتا جو اس کی دولت ہی اس سے چھین لے؟

ایک طرف تو یہ اور دوسری طرف یہ کہ مذہب ان تمام اصطلاحات کے صحیح اور موثر معنی رکھتا ہے جن سے غلط نتیجہ نکالا گیا ہے اور جنہیں تبدیل کر دیا گیا ہے مثلاً "انتظار" کے معنی خاموشی نہیں ہیں۔ سورج کے انتظار کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم رات کے گھپ اندھیرے میں بیٹھے رہیں اور چراغ تک نہ جلائیں۔ گرمی کے انتظار کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس وقت جو سردی کا موسم ہے اس کے لیے گھر میں گرم کرنے کا کوئی انتظام ہی نہ رکھیں اور اصلاح کے لیے امام مہدیؑ کے انتظار کے معنی بھی کوشش نہ کرنے، خاموش رہنے اور ظلم جھیلنے کے نہیں ہیں۔

صبر کے معنی بھی ظلم سہنے کے نہیں ہیں بلکہ ظالم کے مقابلے میں ثابت قدمی اور حق کے حصول میں استقامت کے ہیں جیسا کہ اسلام نے کہا ہے کہ جو کوئی اپنا مالی حق حاصل کرنے یا اس کے تحفظ میں قتل ہو جائے وہ شہید ہے یعنی حق حاصل کرنے میں شہادت کی حد تک ثبات قدم دکھانا چاہیے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ظالم کی طرح مظلوم بھی جہنم میں جائے گا کہ تو نے ظلم کو کیوں قبول کر لیا؟

اسی طرح دنیا کو ہیچ سمجھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم دنیا کو چھوڑ بیٹھیں بلکہ

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان جو زمین پر خدا کا نائب ہے اس کی قدر دنیا سے زیادہ ہے اس لیے انسان کا مقصد محض دنیا طلبی نہیں ہونا چاہیے۔

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیئے تو نہیں جہاں کیلئے

(اقبالؔ)

مختصراً یہ کہ اسلام میں صبر، انتظار اور قناعت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ استحصال کرنے والوں کے مقابلے میں محروم لوگ خاموش رہیں۔ اسلام سرمایہ داروں کی ناجائز دولت ان سے چھیننے اور اسے ضبط کر لینے کے علاوہ محروموں سے بھی کہتا ہے:

۱۔ سرمایہ دار کے سامنے عجز و انکساری ممنوع ہے اور جو کوئی دولت کے سبب کسی دولتمند کے سامنے جھکتا ہے اس کا ایک تہائی دین تلف ہو جاتا ہے۔

۲۔ حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جو کوئی پیسے والے کو زیادہ گرم جوشی سے سلام کریگا خدا قیامت میں اس پر غضبناک ہوگا۔

۳۔ کسی شخص کو مالدار ہونے کی وجہ سے ہرگز برتری اور خصوصی مقام نہ دیا جائے۔

۴۔ اس دستر خوان پر نہ بیٹھو جس پر صرف آسودہ حال لوگ بیٹھے ہوئے ہوں۔

۵۔ حضرت امام رضا علیہ السلام خود بھی اپنے غلاموں کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام اس قدر عظمت کے باوجود غریبوں کے ساتھ بود و باش رکھتے تھے۔ امیر المومنین امام علی ع

زمین پر بیٹھتے تھے اور ہمارے انبیاؑ گلہ بانی اور محنت مزدوری کیا کرتے تھے۔ نکھٹو اور بیکار آدمی کی دعا قبول نہیں ہوتی اور امامؑ نے تو اس شخص پر لعنت کی ہے جو اپنے خرچے کا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے۔ ان اصولوں سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نہ سرمایہ داروں کا حامی ہے' نہ ان کا بنایا ہوا ہے اور نہ ہی کاہلی اور سستی کی تائید کرتا ہے۔

یہ بھی کمیونزم کی ایک اور بے جان توجیہہ پر مختصر تبصرہ اور مذہب کی پیدائش کے سلسلے میں اس کے نظریے کی رسوائی ہے۔

دوسری بے جان توجیہہ

بعض دوسرے مادہ پرستوں نے جو الٰہی جہان بینی کو نہیں سمجھ پاتے جس کا سرچشمہ عقل و فطرت ہے اور اتفاقاً اپنے آپ کو دانشور بھی سمجھتے ہیں اس ایمان کی جو مومنوں کے دل میں خدا کا نور بکھیرتا ہے ایک دوسری توجیہہ کی ہے اور کہا ہے:

خدا پر ایمان کی جڑ خوف ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ جس طرح انسان اپنے بچپن میں والدین کی سرپرستی میں ہوتا ہے اسی طرح سیانے پن میں اس نے اپنے لیے خدا کو پناہ بنا لیا ہے۔ قدیم انسانوں نے جو مشکل اور خطرناک حادثوں مثلاً زلزلے' گرج چمک اور درندوں وغیرہ کا مقابلہ کرتے تھے اپنے لیے یہ خیالی پناہ گاہ مقرر کر لی تھی۔ جب کبھی انھیں ڈر لگتا تھا تو اسی سے اپنی بے چین روح کو تسلی دے لیتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خدا پر ایمان کی جڑ خوف ہے۔

اس توجیہہ کا جواب

۱۔ اگر خدا پر ایمان کا سبب خوف ہے تو پھر جو زیادہ خوف زدہ ہو اس کا ایمان بھی زیادہ ہونا چاہیے اور اس بنا پر سب سے پہلے ڈرنے والے ہی سب سے پہلے مومن ہونے چاہئیں۔

۲۔ اگر ایسا ہے تو جن موقعوں پر انسان کو ڈر کا احساس نہیں ہوگا، خدا کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں جائے گا حالانکہ خوف کے بغیر بھی خدا کی طرف دھیان جاتا ہے چنانچہ ہم خوف کے وقت خدا کی طرف رخ تو کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ ایمان کی وجہ محض خوف ہی ہو۔

انسان کو اکثر اوقات کوئی خوف نہیں ہوتا لیکن خدا کا دھیان ہوتا ہے۔ اس کی عقل باریک، نازک اور نپی تلی نشانیاں دیکھتی ہے اور خدا تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ اپنی طبیعت میں ایک بڑی طاقت سے وابستگی محسوس کر لیتا ہے۔ وہ لمحہ بھر کو سوچتا ہے کہ میں نے جیسا کہ میں اس وقت موجود ہوں، خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا ورنہ ممکن تھا کہ زیادہ طاقتور اور زیادہ خوبصورت پیدا کر لیتا یا اپنے اندر کچھ اور تبدیلیاں کر لیتا۔ دوسرے بھی جو میری طرح موجود ہیں ناپ تول کے بغیر نہیں ہیں۔ میرے ہر عضو اور خلیے میں اصولوں اور حساب سے کام لیا گیا ہے اس لیے یقیناً مجھے ایک قدرت والے خدا نے بنایا ہے۔ انسان اس سوچ بچار اور نتیجہ نکالنے میں کوئی اضطراب یا خوف نہیں رکھتا۔ اس کی عقل اور فطرت خدائے بزرگ کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے چنانچہ یہ توجیہہ بھی کہ خدا پر ایمان کا محرک خوف ہے ایک بے جان توجیہہ ہے۔ سچ مچ یہ توجیہیں

انسان کو اس شخص کی یاد دلاتی ہیں جس نے کاشان کے موسم گرما کی ہوا کی توجیہہ کی تھی۔ وہ کہتا تھا:

کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ کاشان کی ہوا گرم کیوں ہے؟ لفظِ کاشان میں شین کا حرف شامل ہے اور لفظِ شمر میں بھی یہ حرف موجود ہے اور جس دن شمر کربلا میں موجود تھا ہوا گرم تھی اس لیے کاشان کی ہوا بھی گرم ہے۔

ایمان کی یہ نفسیاتی توجیہہ جو اوپر بیان کی گئی ہے ایک ماہر نفسیات نے کی ہے۔ جی ہاں! یہ اسکالر غلطیاں بھی بڑی بڑی کر جاتے ہیں کیونکہ پہاڑ جتنا بلند ہو گا اس کا درّہ بھی اتنا ہی زیادہ خطرناک ہو گا۔ ہمیں علم سے ایسا مرعوب یا علم کا ایسا پرستار نہیں ہونا چاہیے کہ اگر کوئی اسکالر ایک یا دو مسئلوں میں گہری سوچ اور قابلیت رکھتا ہو تو ہم اس کے تمام نظریات جوں کے توں قبول کر لیں۔

ان اسکالروں میں ایک برٹرینڈ رسل بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں پہلے خدا پر یقین رکھتا تھا۔ بعد میں میں نے سوچا کہ اگر خدا نے سب چیزیں پیدا کی ہیں تو خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ جب میری سوچ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو میں نے خدا پر ایمان سے ہاتھ اٹھا لیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ مسٹر رسل نے جو ایمان خدا سے ہاتھ اٹھا لیا ہے تو اب کس کی طرف رخ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب میرا عقیدہ یہ ہے کہ پوری کائنات کا سرچشمہ خدا نہیں، مادہ ہے۔

ہم کہتے ہیں بہت خوب! جس طرح آپ نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا کہ خدا کہاں سے آیا ہے اور پھر اس سے ہاتھ کھینچ لیا، اسی طرح اب اپنے آپ سے پوچھیے کہ مادہ کہاں سے آیا ہے؟ وہ کہتے ہیں مادہ ہمیشہ سے ہے۔ ہم بھی

یہی کہتے ہیں کہ خدا ہمیشہ سے ہے۔ پھر جناب رسل نے ایک باشعور اور قدیم ہستی کو جس کا نام خدا ہے کیوں نہیں مانا اور مادے میں لاکھوں قدیم اور بے شعور ہستیوں (وجودوں) کو کیوں قبول کر لیا؟

ایک اور مثال

اشتراکی ہم سے کہتے ہیں کہ جب تک کوئی چیز محسوس نہ ہو اور تجربے میں نہ آئے قابلِ قبول نہیں ہے اس لیے ہم خدا، ملائکہ، وحی اور ان جیسی چیزوں پر ایمان نہیں لا سکتے کیونکہ ہم صرف حس اور تجربے ہی کو شناخت کا آلہ سمجھتے ہیں۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ آپ اپنے تاریخی تجزیے اور تشریح میں یہ کیسے کہتے ہیں کہ سیکڑوں، ہزاروں سال پہلے انسان مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے۔ مل کر جانوروں کا شکار کرتے اور کھاتے تھے۔ نہ ملکیت کی بنیاد پڑی تھی نہ حکومت کی۔ اس کے بعد غلامی کا نظام آیا اور ایک مدت کے بعد جاگیرداری نظام قائم ہوا۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ اس وقت جو آپ یہ تاریخی تبصرہ اور تجزیہ کر رہے ہیں تو کیا آپ ان صدیوں کو بھی چھو سکتے ہیں یا ان کا تجزیہ کر سکتے ہیں جن میں اشتراکی زندگی بسر ہوتی تھی؟ وہ کہتے ہیں نہیں۔ البتہ ہم ان زمانوں کو آثار سے جان سکتے ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ جس طرح آپ پچھلوں کی تاریخ کو نشانیوں سے سمجھ لیتے ہیں ہم بھی خدا کو اس کی نشانیوں سے پا لیتے ہیں۔ اگر یہی بات مان لی جائے کہ ہم نشانیوں سے کسی بات کو قبول کریں گے تو پھر کوئی فرق نہیں پڑے گا چاہے ہم آثار سے قدیم لوگوں کی تاریخ دریافت کریں چاہے آثار سے خدا کے وجود کا پتا پائیں۔

کیا پہچان کا طریقہ اور ذریعہ صرف حس اور تجربہ ہی ہے اور ہم آثار سے حقائق تک نہیں پہنچ سکتے؟ اگر ہم غور کریں تو ہماری اکثر شناختیں آثار کے وسیلے ہی سے ہوتی ہیں۔

ایک اور توجیہہ

کچھ لوگوں نے جو عقل اور فطرت کو خدا شناسی کی دلیل نہیں مانتے ایمان اور اصلیت کی دوسری توجیہہ کی ہے اور کہا ہے کہ خدا پر ایمان کی بنیاد جہل ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب پیش آنے والے مسائل اور حوادث کی وجہ نہیں سمجھ پائے تو انھوں نے اپنا ایک خدا فرض کر لیا تاکہ جب اور جس مسئلے کی علمی تشریح سے وہ عاجز رہ جائیں تو کہہ دیں کہ یہ کام خدا کا ہے اور اسی طرح مسئلہ خدا کے نام سے منسوب ہو گیا لیکن ان باتوں کا زمانہ ختم ہو گیا بلکہ شروع ہی سے اسے کوئی نہیں مانتا تھا کیونکہ:

۱۔ اگر خدا پر ایمان کی جڑ جہل ہو تو پھر ضروری ہے کہ جو زیادہ جاہل ہو اس کا ایمان بھی زیادہ ہو۔

۲۔ اگر خدا پر ایمان کی جڑ جہل ہو تو آسمانی کتابوں کو چاہیے کہ لوگوں کو جہل کی ترغیب دیں۔

۳۔ اگر خدا پر ایمان کی جڑ جہل ہو تو ضروری ہے کہ جس کا علم بڑھ جائے اور جہل گھٹ جائے وہ سب سے زیادہ بے ایمان بن جائے اور پھر لازم آئے گا کہ انسان جیسے جیسے بعض حادثات کے اسباب معلوم کرتا جائے ایمان سے بھی ہاتھ اٹھاتا جائے۔ کیا ایسی صورت میں بوعلی سینا، گلیلیو

اور آئن سٹائن جیسے لوگ جو خود بعض قدرتی اسباب کے دریافت کرنیوالے ہیں اور خدا پہ ایمان بھی رکھتے ہیں سچ مچ ایک یا ایک سے زیادہ قدرتی قوانین کی دریافت ہم کو قانون ساز کے وجود سے بے نیاز کر دے گی؟ فرض کیجیے کہ آپ نے ایک قانون دریافت کر لیا تو کیا قانون کی دریافت ہم کو قانون بنانے والے پہ ایمان لانے سے بے نیاز کر دے گی؟ اگر آپ کو راستے میں ایک پیسہ پڑا مل گیا تو کیا آپ کو یہ نہیں پوچھنا چاہیے کہ یہ کس کے بٹوے سے گر گیا ہے؟ کیا صرف اسی دریافت اور دستیابی پر معاملہ ختم ہو جائے گا؟

ایک جماعت خدا یا مذہب کی طرف رغبت کیوں نہیں رکھتی؟

اس کا جواب یہ ہے:

۱۔ اگر ہم یہ کہیں کہ انسان ایک خلیے کی بناوٹ یا ایٹم کے ذرے سے خدا کو پہچان سکتا ہے تو یہ صرف ان لوگوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے جو اسے پہچاننا چاہتے ہوں لیکن جو پہچاننے کی نیت ہی نہ رکھتا ہو وہ آثار سے خدا کو ہرگز نہیں پہچانے گا۔

چند مثالوں پر توجہ دیجیے تاکہ آسانی سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے۔

الف: آپ ایک کبابی کو دیکھیے جو ایک دن میں دسیوں کلیجیاں کاٹتا اور سیخ پر لگا کر بیچتا ہے لیکن وہ کلیجی کی رگیں نہیں پہچانتا کیونکہ اسے رگیں پہچاننے سے کام ہی نہیں پڑا۔

ب : ایک آئینہ فروش پر غور کیجیے کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور صبح سے شام تک وہ سیکڑوں دفعہ آئینوں کو دیکھتا ہے لیکن اپنے بال نہیں سنوارتا کیونکہ اسے اپنی درستی کا خیال نہیں ہے۔ وہ آئینے بیچنے کی فکر میں ہے اپنے بال درست کرنے کی فکر میں نہیں۔

ج : کبھی انسان رومال سے گھڑی کا شیشہ صاف کرتا ہے تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ ظہر کی نماز کے لیے کتنا وقت باقی ہے؟ وہ دوبارہ گھڑی دیکھتا ہے کیونکہ ابھی تک وہ اسے صاف کرنے کی فکر میں تھا وقت دیکھنے کی فکر میں نہیں۔

د۔ بڑھئی ہمیشہ سیڑھی بناتا ہے لیکن خود اس پر نہیں چڑھتا اور کبھی ایک سیڑھی کی خرید کی بنا پر ہزار بار اس پر چڑھتا ہے۔

اوپر کی کئی مثالوں سے ہم ایک ہی نتیجہ نکالتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان جب تک پہچاننا یا استفادہ کرنا نہیں چاہتا نہ وہ کسی چیز کو پہچانتا ہے نہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس طرح لوگ خدا کے آثار دیکھتے ہیں اور غور کرتے ہیں پھر بھی ایمان نہیں لاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غور کرنے سے ان کا مقصد خدا کی پہچان نہیں ہے۔

۲۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر ایک نعمت شروع ہی سے ہمیں حاصل رہے تو ہمارے لیے اس میں کوئی تازگی باقی نہیں رہتی۔ اب جو ہم خدا کے آثار دیکھتے ہیں تو اسے یاد نہیں کرتے اور اس کی قدر نہیں پہچانتے کیونکہ زندگی کے شروع ہی سے ہم نعمتوں میں اور نعمتوں کے ساتھ رہے ہیں۔

مثال یہ ہے:

آپ نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کے لیے خدا کا شکر کبھی ادا نہیں کیا کیونکہ وہ پیدائش سے آپ کے ساتھ چلا آ رہا ہے لیکن فرض کیجیے کہ یہ انگوٹھا تھوڑے دنوں کے لیے بندھ جائے یا بالکل کٹ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ اس کے بغیر گریبان کا بٹن تک نہیں لگا سکتے (آپ اسی وقت جبکہ یہ جملے پڑھ رہے ہیں اس بات کی جانچ کر سکتے ہیں)۔

چونکہ نعمتوں کا برابر حاصل رہنا خدا سے ہماری غفلت کا سبب بن جاتا ہے اس لیے یہ سختیاں ہماری تنبیہ کے لیے آتی ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ ہم کبھی کبھی انسانوں کو ضیق (مشکل) میں ڈال دیتے ہیں، شاید وہ ہماری طرف آئیں اور ہم سے دعا مانگیں۔ قرآن انسانوں کو بار بار حکم دیتا ہے کہ خدا کی نعمتوں اور مددگاریوں کو یاد کرتے رہو اور ہم اولیائے دین کی دعاؤں کے ایک بڑے حصے میں دیکھتے ہیں کہ وہ خدا کی ایک ایک نعمت گن گن کر اپنے آپ کو سناتے ہیں۔

"تو ہی ہے جس نے ہم کو چھٹائی سے بڑائی، نادانی سے دانائی، کمی سے زیادتی، فقر سے دولت اور بیماری سے صحت تک پہنچایا۔"

۳۔ جو لوگ مذہب سے منحرف ہیں اس کا سبب وہ بے سروپا باتیں ہیں جو نادان دوستوں اور دانا دشمنوں کی طرف سے مذہب میں بڑھا دی گئی ہیں۔ مثلاً:

اگر ہم پیاسے انسان کو جو پانی مانگ رہا ہے ایک گلاس پانی دیں اور اس گلاس میں مکھی گر جائے تو وہ پانی نہیں پیتا اسے بہا دیتا ہے چنانچہ جس طرح انسان ایک مکھی کی وجہ سے پانی کو نظر انداز کر دیتا ہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ چند

بے اصل باتوں کی موجودگی کے باعث وہ اصل مذہب کو ہی نظر انداز کر دے اس لیے بعض مسلمانوں کے اس عمل سے غافل نہیں رہنا چاہیے جس کی وجہ سے لوگ مذہب سے بھاگنے لگتے ہیں۔

۴۔ ماحول کا اثر

مذہب اور مذہبی احکام سے انسان کے انحراف کی ایک وجہ وہ مسئلہ ہے جسے ماحول کا اثر کہتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت اور ضمیر کی رو سے چوری کو ناپسند کرتا ہے، خیانت کو برا جانتا ہے لیکن جب ایسے ماحول میں جا رہتا ہے جس میں لوگ چوری اور خیانت کرنے والے ہوتے ہیں تو اسے بھی ان طور طریقوں کی عادت پڑ جاتی ہے۔

۵۔ ذمہ داری سے بچنا

کبھی مذہب سے بے اعتنائی ذمہ داری سے بچنے کی خاطر ہوتی ہے کیونکہ مذہب کا قبول کرنا مکمل قید اور پابندیاں قبول کرنے کے برابر ہوتا ہے۔ ایک جماعت صرف اس لیے کہ اپنے خیال میں آزاد رہے مذہب سے بے پروا ہو جاتی ہے لیکن وہ اس بات سے غافل ہے کہ خدا کی اطاعت اور حکم سے آزاد ہونے کے لیے ہر قسم کی قید اور غلامی قبول کرنا لازم آجاتا ہے جو اس (خدا) کا غلام نہیں رہا وہ سب کا غلام بن جائے گا اور جس نے اس کا حکم نہیں مانا وہ سب کا محکوم ہو جائے گا۔ جو خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف رُخ کرتا ہے اور غیر خدا کے پیچھے چلتا ہے گویا آسمان سے زمین پر گر پڑتا ہے۔ کہ خدا اس

کے گرد حلقہ باندھ لیتے ہیں اور اس کا ایک ایک ٹکڑا اڑتے ہیں۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
(اقبالؔ)

۶۔ دشمنی

ایک جماعت تعصب، ہوس اور خود غرضی کی وجہ سے ضد اور مخالفت کرتی ہے اور خدائی مکتب کو مسترد کر دیتی ہے۔

۷۔ صحیح تبلیغ کے نہ ہونے اور تبلیغ کی کوتاہیوں یا غلط پیشکش کو بھی ان بے پروائیوں کا ایک سبب سمجھا جا سکتا ہے۔

دین کی ضرورت

انسان زندگی میں کسی لائحۂ عمل کے بغیر نہیں رہتا لیکن وہ زندگی کا یہ نقشہ اور اپنی کامیابی اور ترقی کسطرح حاصل کرے؟ اس مقام پر اس کے سامنے تین طریقے ہیں:

۱۔ اپنے سلیقے اور رجحان کے مطابق دستور حیات کا انتخاب کرے۔
۲۔ لوگوں کی خواہشوں کے مطابق اپنا دستور حیات مرتب کرے۔
۳۔ اپنے آپ کو خدا کا اطاعت گزار بنائے اور صرف اسی سے اپنا دستور حیات حاصل کرے۔

پہلا طریقہ

یہ طریقہ غلط ہے کیونکہ انسانی سمجھ محدود ہے اور وہ خود اپنے گزشتہ اعمال کے متعلق سیکڑوں غلطیوں اور لغزشوں کا گواہ ہے۔ جبلتوں کا طوفان ہر گھڑی انسان کو برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس حالت میں کیا یہ مناسب ہوگا کہ وہ پھر بھی ایسے طریقے کے انتخاب میں جو اس کی مستقل نیک بختی اور بدبختی سے مربوط ہوگا اپنی ناقص فکر اور اپنے محدود علم کے مطابق آگے بڑھے۔

دوسرا طریقہ

یہ طریقہ بھی پہلے طریقے سے کچھ کم غیر تسلی بخش نہیں ہے اس لیے کہ دوسرے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اور وہ طرح طرح کی خواہشات اور میلانات رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہی لغزش، بھول اور کوتاہی جو اپنے سلیقے میں ہے ان کے نظریے میں بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں اپنے سلیقے کو نظر انداز کر دوں، اپنی آزادی چھوڑ دوں اور ایسے لوگوں کا غلام بن جاؤں جو نہ مجھے پہچانتے ہیں نہ میری مستقل نیک بختی کو سمجھتے ہیں اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ میرے خیر خواہ ہیں۔

تیسرا طریقہ

صرف یہی طریقہ صحیح ہے کیونکہ جس طرح ہم اپنی گاڑی مکینک کے سپرد اور جسم معالج کے سپرد کر دیتے ہیں اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ جاننے والا ہے

اسی طرح ہمیں چاہیے کہ ہم اپنا دستورِ حیات خدا کے سپرد کر دیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ جاننے والا ہے۔

دین کے خدوخال

شاید ان چند جملوں میں دین کو مجملاً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک دوست کے کہنے کے مطابق ہم جو کام کسی گاڑی پر کرتے ہیں وہی کام دین' انسان پر کرتا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ ہم ایک گاڑی بنانے میں چند مرحلے طے کرتے ہیں۔

۱۔ لوہے کی کان دریافت کرتے ہیں۔
۲۔ دریافت کی ہوئی کان سے لوہا نکالتے ہیں۔
۳۔ لوہے سے مشین کے پرزے ڈھالتے ہیں
۴۔ ڈھلے ہوئے پرزے اکٹھے کر کے انھیں آپس میں جوڑ دیتے ہیں۔
۵۔ اس گاڑی کو ایک ماہر ڈرائیور چلاتا ہے۔

دین بھی انسان پر یہی پانچ کام کرتا ہے۔

۱۔ انسان کی دریافت : جو انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے وہ اپنی راہ ' اپنا رہبر اور اپنی منزل کھو دیتا ہے اور حیوانیت کے درجے تک گر جاتا ہے ' چونکہ وہ اس مادی زندگی میں نشاط ہی کو اپنا اصلی مقصد سمجھتا ہے اس لیے وہ ایک مردے کی مانند ہو جاتا ہے اور اس پر حق اثر نہیں کرتا ' وہ چیرنے ' پھاڑنے میں بھیڑیا ' مکر میں لومڑی ' چوری میں چوہا اور دل کی سختی میں پتھر ہو جاتا ہے۔ لازم ہے کہ یہ گمشدہ انسان اپنے آپ کو پہچانے اور دریافت کرے۔

دین کا ایک کام یہ ہے کہ وہ انسان اور اس کی خصوصیات کو بیان کرے۔ جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسان کا کس طرح تعارف کراتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

۱۔ تو خدا کا خلیفہ ہے۔ "میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۳۰)

۲۔ "جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے اسے خدا نے تمہارے تابع کر دیا ہے"۔ (سورۂ لقمان۔ آیت ۲۰)

۳۔ تو امانت الٰہی کا حامل ہے۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۷۲)

۴۔ تجھ میں خدا کی روح پھونکی گئی ہے۔ (سورۂ حجر۔ آیت ۲۹)

۵۔ ہم نے انسان کو عزت دی۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۰)

۶۔ ہم نے انسان کو فضیلت دی۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۰)

پھر قرآن انسان کو خبردار کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو جو تو اپنے آپ کو بھول جائے، گم کر دے، اپنا نقصان کرے، اپنی تجارت میں فائدہ نہ اٹھائے اور اپنے آپ کو غیر حقیقی گاہک کے ہاتھوں سستے داموں بیچ ڈالے۔ اس کے بعد جیتنے اور ہارنے والوں کی مثالیں و دیگر ٹائپ اور ماڈل طے کرتا ہے اور اس ذریعے سے انسان کو اپنی ذات، صلاحیت اور حوصلے کا پتا لگتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اگر میں صرف مادی زندگی آسائش اور حیوانی جبلتوں کی تسکین کے لیے ہی پیدا ہوا ہوں تو پھر مجھ میں اعلیٰ قابلیت، بلند استعداد اور ترقی کی تمنا کیوں ودیعت کی گئی ہے۔

دین کا دوسرا کام اس دریافت کی ہوئی کان کا خالی کرنا ہے۔ انسان کو

چاہیے کہ وہ ظلموں، نادانیوں، خرافاتوں اور شرک کے خیالوں سے باہر نکل آئے۔ خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لا چکے ہیں۔ وہ انھیں گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لے آتا ہے۔ (سورہ بقرہ۔ آیت ۲۵۷)

دین کا تیسرا کام فرد سازی ہے۔ اس کا مطلب ہے عبادت، تقویٰ اور انسانی صفات اور کمال کو شگفتہ کرنا اور ایک ایک صفت پر توجہ دینا۔ ذاتی تربیت کا کام وہی ہے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیام مکہ کے پرآشوب زمانے میں انجام دیا۔ وہ تمام احکام جو سماجی پہلو نہیں رکھتے اسی سلسلے میں آتے ہیں کہ ہر انسان کو پوری توجہ اور محنت سے تیار کیا جائے۔

دین کا چوتھا کام تیار کیے ہوئے افراد کو منظم کرنا، باہم جوڑنا اور ایک صورت بخشنا نیز ایک عالمگیر خدائی حکومت کی تشکیل کرنا ہے جس میں ہر قسم کے واضح اور کامل احکام ہوں۔ وہی کام جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینے میں انجام دیا اور بعد میں قابل اور اہل لوگوں کو مختلف شعبوں سے وابستہ کرنا، دفاعی قوت جمع کرنا اور بجٹ بنانا وغیرہ۔ مزید یہ کہ ایک اسلامی معاشرے کے لیے معیار، مقاصد اور روایات کا تعین کرنا تاکہ وہ ہر لحاظ سے غیر اسلامی معاشروں سے قطعی مختلف ہو۔ ایک دین کا آخری کام یہ ہے کہ تشکیل دیے ہوئے اس معاشرے کو کسی لائق اور معصوم رہبر کے سپرد کر دے۔ مفسد، مسرف، طاغوت، جاہل اور ظالم لوگوں یا گروہوں کی سرپرستی قبول کرنے اور ان سے بیزاری ظاہر کرنے کے بارے میں کئی تنبیہیں آئی ہیں کیونکہ قوم کی رہنمائی ایک غیر معصوم شخص کے سپرد کر دینا واقعی انسانیت پر ظلم ہے۔ یہ ہے ایک دین اور مکتب کے مکمل خدوخال کا ایک منظر اور اگر ہم چاہیں کہ ان سب باتوں کا خلاصہ

ایک جملے میں بیان کردیں تو ہم کہیں گے:

"دین ایک سماجی منصوبہ ہے جو خدا کے خاص معیاروں کے مطابق انسان اور سماج کے لیے ایک نظریہ، جدوجہد اور چلن طے کرتا ہے۔"

توحید کی اصلیت اور اسکے مختلف پہلو

اسلامی لغت میں توحید[1] کا لفظ بہت اچھے، اونچے اور وسیع معنی رکھتا ہے۔ ہمارے علماء نے اسے عباداتی توحید، ذاتی توحید، صفاتی توحید اور افعالی توحید میں تقسیم کیا ہے۔

اب ہم بعض اصطلاحیں حذف کر کے توحید کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ محترم قارئین اپنے آپ کو اس معیار پر جانچیں اور پھر معلوم کریں کہ وہ توحید کے کس درجے پر ہیں۔

توحید یعنی صرف خدا کو مَلِکُ النّاس (لوگوں کا بادشاہ) سمجھنا"

---

[1] بعض جماعتوں نے اس پاک لفظ کو سب سے آگے رہنے والی دوسری پاک چیزوں کی طرح توحیدی قوم اور توحیدی فوج کا نام دیکر چاہا کہ اسے اشتراکی اور غیر طبقاتی نظام کی علامت قرار دیں لیکن آیت اللہ خمینی اور دیگر علماء کے علمی مباحثوں اور خود ان گروہوں کی اصلیت کھل جانے سے اس پاک لفظ نے ان کے چنگل سے رہائی پائی۔

خدا کے ایک ہونے پر ایمان رکھنا اور خدا کو لاشریک اور بے ہمتا جاننا۔

توحید یعنی خواہشات کی نفی۔ جو ہوس پرست ہے وہ توحید کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے:

"تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔" (سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۳)

توحید یعنی طاغوتوں کی نفی۔ امام رضا علیہ السلام نے مامون کی ولی عہدی کو مجبوراً قبول کرنے کے بعد ایک مجمع عام میں سب لوگوں کے سامنے یہ شرط لگائی کہ آپؑ مامون کے اس نظام میں موقوفی اور تقرری کے امور میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

توحید یعنی تمام مشرقی اور مغربی اداروں کو ملانے والے خطوط کو کاٹ دینا اور تمام نظریوں اور نظاموں کو رد کر دینا جو عام طور پر خود غرض لوگوں کے ذہنوں کی اپج ہیں۔

توحید یعنی ان تمام سلسلوں اور رشتوں کو توڑ دینا جو مسلمانوں پر دوسروں کی بالادستی اور تسلط کا سبب ہیں۔

توحید یعنی کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرنا جس کا حکم خدا کی حدود کے مطابق نہ ہو۔

توحید یعنی ایسے لوگوں کی رہبری قبول کرنا جن کی رہبری کو خدا نے پسند فرمایا ہے۔

توحید یعنی خدا کی بندگی کرنا اور اس کے احکام بجالانا۔

توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ سب اندرونی اور بیرونی بت یعنی نام کا بت،

سمجھ کا بت، منصب کا بت، مزاج کا بت اور مال کا بت توڑنا ان معنوں میں کہ ان میں سے کوئی بھی مجھے حق کے دائرے سے، حق کے ماننے سے اور حق کے راستے سے نہیں روک سکتا۔

توحید یہ ہے کہ حق سے تعلق کے سوا کوئی دوسرا تعلق میرے لیے راہ عمل معین نہیں کر سکتا بلکہ میرا اٹھنا بیٹھنا خدا ہی کے لیے ہوگا۔

توحیدی اقتصادیات یعنی ذرائع پیداوار، طریقۂ تقسیم اور حق استعمال کے لائحۂ عمل میں خدا کا حکم ہی کارفرما ہو۔ توحیدی سپاہ یعنی علمی مرتبہ، سابقیت اور مہارت کے لحاظ سے روانگی، حملہ، جنگ، حکمت عملی اور قہر و غضب، ہر حال میں خدائی فریضے کا خیال رہے اور دل کے کسی گوشے میں رقابت، خودغرضی، انتقام، ملک گیری اور استحصال کا قصد شامل نہ ہو بلکہ حق بات کی اشاعت اور خدائی قانون کا نفاذ مدنظر ہو۔ خدا کے حکم سے ظالم کی بیخ کنی، کمزوروں کی نجات اور ان کے مال، جان اور عزت کا بچاؤ اور سرحدوں کی حفاظت کی کوشش ملحوظ ہو۔ بلاشبہ توحیدی فوج کا سپہ سالار امام معصوم کا نائب اور پیروکار ہوتا ہے، اس کا مقصد حق ہوتا ہے۔ اس کا سپاہی اپنی مرضی سے شہادت قبول کرتا ہے اور اس کا سپاہی ہونا بھی عبادت ہے۔ توحیدی فوج کے صحیح معنی یہی ہیں۔ (سابقہ خدمات اور مہارت وغیرہ کا حوالہ دیکر) غلط رعایتیں حاصل کرتا اور کمان کے منصبی احکامات کی خلاف ورزی کرنا نہیں ہے۔

توحیدی معاشرہ یعنی ایسا معاشرہ جس کا رہبر زور زبردستی، قبیلہ یا پارٹی وغیرہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ خدائی اصولوں (علم، تقویٰ، جہاد، کارکردگی، امانت، قدرت اور انتظامی قابلیت وغیرہ) کے مطابق منتخب ہو۔ توحیدی معاشرہ یعنی

جس معاشرے میں صرف ایک ہی مکتب اور وہ بھی خدائی مکتب حکمران ہو اور سب لوگوں پر اس کا حکم یکساں طور پر نافذ ہو اور قانون کی نظر میں سب برابر ہوں' جس میں ذاتی فائدے کی کوششیں باطل ہوں اور باہمی تفرقے مٹ جائیں۔ شاید توحید کے یہ معنی جو بیان ہوئے مکمل' وسیع اور درست ہوں۔

اب اس معیار کو پیش نظر رکھ کر دیکھیں کہ ہم میں سے کونسا شخص اور کونسا معاشرہ توحید کے اس مقام تک پہنچا ہے یا ہم کس طرح اس تک پہنچ سکتے ہیں؟

ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قُولُوا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه، کہو اور فلاح و رستگاری پاؤ۔" تو ہمیں اس جملے پر سرسری نظر نہیں ڈالنی چاہیے کیونکہ پیغمبرؐ اسلام کی اس حدیث میں توحید کا نتیجہ ایک لفظ "تفلحوا" ہے جس کے معنی ہیں فلاح و رستگاری۔

قرآن ہمارا آخری مقصد فلاح (بہبود) بتاتا ہے کیونکہ ہم قرآنی آیات میں دیکھتے ہیں کہ تمام عبادتوں کا مقصد تقویٰ ہے:

"اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا کہ شاید تم متقی بن جاؤ۔" (سورہ بقرہ - آیت ۲۱)

لیکن تقویٰ آخری منزل نہیں ہے بلکہ تقویٰ فلاح کا مقدمہ ہے جس کا ثبوت قرآن کا یہ فرمانا ہے کہ:

"اے صاحبانِ عقل! تقویٰ اختیار کرو' شاید تم فلاح پاؤ۔"

(سورۂ مائدہ - آیت ۱۰۰)

مندرجہ ذیل جملے پر ذرا زیادہ توجہ فرمایئے:

قرآنی الفاظ "سَخَّرَ لَكُمْ" اور "خَلَقَ لَكُمْ" کی رُو سے یہ ساری دنیا

ہمارے لیے پیدا ہوئی ہے اور ہم خدا کی عبادت کے لیے خلق کیے گئے ہیں تاکہ اس کی راہ پر چلیں، عبادت تقویٰ پیدا ہونے کے لیے ہے، تقویٰ فلاح کا نقطہ آغاز ہے اور فلاح ان معنوں کے مطابق جو راغب اصفہانی نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں دیئے ہیں فتح و کامیابی کے معنی میں ہے' اس اعتبار سے زندگی ہمارے لیے ہے' ہم عبادت کے لیے ہیں' عبادت تقویٰ کے لیے ہے اور تقویٰ فلاح کے لیے ہے۔ اس سے فلاح کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قیدوں' پابندیوں اور داخلی و خارجی دشمنوں پر فتح مندی۔

میں جس زمانے میں "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کا سبق پڑھا رہا تھا' میں نے تختہ سیاہ پر ایک ایسے دانے کی تصویر کھینچی جس پر مٹی ڈالی جاتی ہے جس کے بعد وہ سرسبز ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ یہ دانہ مٹی کی تہ سے چھٹکارا پانے اور اگنے میں تین کام انجام دیتا ہے۔

۱۔ مٹی میں اپنی جڑیں پھیلانا۔

۲۔ مٹی سے غذا حاصل کرنا۔

۳۔ اپنی نمو کے لیے مٹی کے ذرات کو دور کرنا۔

پھر میں نے کہا تھا اگر انسان چاہے کہ وہ بھی آزادی حاصل کرے تو انہی تین کاموں کے ذریعے سے آزادی حاصل کر سکتا ہے۔

۱۔ ایسا عقیدہ اور آئیڈیالوجی رکھتا ہو جو دلیل اور برہان پر مبنی ہو۔

۲۔ جہاں جہاں سے ممکن ہو اپنی ترقی کے لیے ذہنی پختگی کا سرمایہ حاصل کرے۔

۳۔ اپنے راستے سے ہر قسم کی رکاوٹیں دور کرے تاکہ توحید کی فضا میں پہنچ جائے۔

اگر کوئی انسان ان تین کاموں میں سے کسی ایک میں بھی کوتاہی کریگا تو بدستور بدبختی میں پڑا رہے گا۔ اگر اس کے عقیدے پختہ اور علم پر قائم نہیں ہونگے، وہ امکانات سے فائدہ نہیں اٹھائے گا اور دشمنوں کو دفع نہیں کریگا تو اسی طرح برباد ہو جائے گا جس طرح وہ دانہ جو مٹی کی تہ میں یہ تینوں کام نہیں کریگا تو ریزہ ریزہ ہو جائیگا۔

توحید سے روگردانی کے اسباب

ان اسباب میں سے جو انسان کو خدا کے راستے اور توحید کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں کچھ یہ ہیں:

۱۔ طاغوت اور زور زبردستی: گمراہی کے اسباب میں سے ایک سبب لوگوں کا خوف ہے۔ قرآن، فرعون کی بات دہراتا ہے کہ وہ اعلان کرتا تھا:

"اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو اپنا معبود بنایا تو میں ضرور تمھیں اپنا قیدی بناؤں گا۔" (سورۂ شعراء۔ آیت ۲۹)

چنانچہ لوگ بھی ڈر کے مارے اسکی بندگی میں مشغول رہتے تھے۔

۲۔ عشق و عقیدت: کبھی کسی چیز سے عشق اور محبت اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ انسان خدا کو نظر انداز کر دے اور اس چیز یا انسان کی طرف رخ کرے جس سے اسے دلی تعلق ہے اور اس چیز کو اپنے کام، خوشی اور ناخوشی کا محور مانے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں، زاہدوں اور مریمؑ کے بیٹے مسیحؑ کو اپنا پروردگار بنا ڈالا۔" (سورۂ توبہ۔ آیت ۳)

یہ بنے ہوئے عالم خدا کے بتائے ہوئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال

بنا دیتے تھے اور یہ لوگ ان سے اپنی عقیدت کے باعث اسے مان لیتے تھے۔

۳۔ بے جا امید: کبھی لوگ مدد یا عزت حاصل ہونے کی امید میں غیر خدا پر بھروسا کر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

"اور لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر فرضی معبود بنا لیے ہیں تاکہ انھیں ان سے کچھ مدد ملے۔" (سورۂ یٰسٓ۔ آیت ۷۴)

اور دوسری آیت میں کہتا ہے:

"اور لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کی عزت کا باعث ہوں۔" (سورۂ مریم۔ آیت ۸۱)

انسان کو توحید کے راستے اور دائرے سے خارج کرنے کے لیے یہ لوگ خوش کن تقریریں اور دلچسپ طریقے لیکر آتے ہیں اور وعدے کرتے اور ڈراوے دکھاتے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے:

"یہ سب خالی تو ہیں ہیں اور خوبصورت ناموں کے سوا جو تم نے رکھ لیے ہیں کچھ بھی نہیں ہیں۔" (سورۂ یوسف۔ آیت ۴۰)

آج بھی اسلام کے راستے سے انحراف کے سلسلے میں بہت سے خوبصورت نام پھیلے ہوئے ہیں جیسے آزادی، جمہوریت، کسان، مزدور، وکیل، بین الاقوامی قوانین، کونسل وغیرہ، کیونکہ وقت گزاری کے لیے فی الحال ناموں کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔

توحید کی دلیلیں

۱۔موجودات کی ہم آہنگی

توحید کی سب سے اچھی اور سب سے سادہ دلیل وہ تنظیم اور ہم آہنگی ہے جو موجودات کے درمیان پائی جاتی ہے۔

ایک عمارت کے مختلف حصوں، ایک کتاب کے مقالوں اور ایک خط کی سطروں میں ہم آہنگی اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ انھیں بنانے والا اور لکھنے والا ایک ہی ہے۔ اگر تین مصور ایک گوشے میں ایک مرغے کی تصویر بنانے میں مشغول ہوں اور ان میں سے ایک مرغے کے سر کی، دوسرا پیٹ کی اور تیسرا اس کے پاؤں کی تصویر کھینچے اور اس کے بعد ہم ان تینوں اوراق کو تینوں مصوروں سے لیں اور آپس میں جوڑ دیں تو تینوں مصوروں کی بنائی ہوئی مرغے کے سر پیٹ اور پاؤں کی تصویریں ایک دوسری سے ہم آہنگ نہیں ہونگی۔

بے شک خلقت میں ہم آہنگی، توازن اور تناسب خدا کی وحدانیت کی سب سے اچھی اور سب سے سادہ دلیل ہے۔ کمزوریاں قوتوں سے، حملے مدافعتوں سے اور دکھائیاں ہمدردیوں سے ایسے ملی ہوئی ہیں کہ انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں اور سب نے مجموعی طور پر ایک ہم آہنگ نظام قائم کر رکھا ہے۔ والدین کی قوت اور مدد سے نومولود بچے کی کمزوری کی کس طرح تلافی ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے آسمانی پتھروں کا بکھراؤ تہ دار فضا کی مضبوطی کا جو زمین کو گھیرے ہوتے ہے کس طرح عوض ہو جاتا ہے۔ انسان تنفس

کے دوران جو کاربن گیس نکالتا ہے نباتات کے رد عمل سے جو کاربن گیس لیتی اور آکسیجن نکالتی ہے کس طرح ہم آہنگ اور متناسب کام کرتا ہے! کیمرے کی بناوٹ روشن آنکھ سے کس طرح ہم آہنگ ہے اور آنکھ کا تارا روشنی میں کس طرح خود بخود سکڑتا اور کم روشنی میں کس طرح پھیلتا ہے اور اگر زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو پلکیں اور کالی کالی خوشنما بھوئیں روشنی کو متناسب کرکے کس طرح اس آلے تک پہنچا دیتی ہیں! آنکھ نمکین پانی سے اور منہ میٹھے پانی سے کس طرح تعلق رکھتا ہے اور ان پانیوں کا مزا منہ اور آنکھ کی بناوٹ سے کس طرح میل کھاتا ہے! مرد کی سختی و تندی، عورت کی نرمی اور محبت سے کس طرح ہم آہنگ ہے جو ساتھ ملکر زندگی گزارتے ہیں اور ایک دوسرے کو متوازن بناتے ہیں۔

آپ فطری اور مزاجی تعلق کا جو خلقت میں جاری وساری ہے مطالعہ کیجیے کہ کس طرح ان میں دقیق تناسب اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ بچے کا خالق اور چھاتی کے دودھ کا خالق ایک ہی ہے اس لیے کہ نومولود کے پیدا ہونے کی مناسبت سے ماں کی چھاتی میں بھی دودھ پیدا ہو جاتا ہے۔ سورج روشنی نیچے پھینکتا ہے، بحر اوقیانوس بھاپ اوپر بھیجتا ہے، زمین کی کشش اسے پھر نیچے لے آتی ہے اور درختوں کی جڑیں غذائی مواد زمین سے اوپر دھکیلتی ہیں۔ کیا یہ ہم آہنگیاں ایک لامحدود اور مدبر قدرت کی کارفرمائی کا پتہ نہیں دیتیں؟

ہر حیوان کے اعضا اور آلاتِ شناخت اس کی ضرورت کے مطابق ہیں۔ تمام حیوانوں میں ماؤں اور بچوں کے تعلق کا ختم ہونا بچے کی ضرورت سے وابستہ

اور اس کے مطابق ہے۔ البتہ ہمارے علم اور جہل میں وہی نسبت ہے جو ایک قطرے اور سمندر میں ہے کیونکہ دنیا میں لاکھوں بھید، باریکیاں اور مناسبتیں ایسی ہیں جن تک انسان ابھی تک نہیں پہنچ پایا ہے اور ہم ان کے باہمی تعلقات کا سراغ نہیں لگا پائے ہیں۔

ایک واقعہ

ایک دن ایک نوجوان نے جو سبق کے چند الفاظ پڑھ کر مغرور ہو گیا تھا مجھ سے کہا: صبح کی نماز دو رکعت کیوں ہے؟ میں نے کہا کہ میں نہیں جانتا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم پر تمام احکام خداوندی کی دلیلیں واضح ہو جائیں اور وہ بھی آج ہی کے دن اور پھر کبھی کبھی بنیادی طور پر حکم محض عبادت اور اطاعت کا پہلو بھی رکھتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم خدا کی فرمانبرداری کریں مثلاً قرآن کہتا ہے:

"اس (جہنم) پر انیس فرشتے متعین ہیں اور ہم نے جہنم کا نگہبان تو بس فرشتوں کو بنایا ہے اور ان کی یہ گنتی بھی کافروں کی آزمائش کے لیے مقرر کی ہے۔" (سورۂ مدثر۔ آیت ۳۰)

یعنی یہ دیکھیں کہ کوئی اعتراض کرتا ہے یا نہیں کہ انیس کی جگہ بیس فرشتے کیوں نہیں ہیں۔

ہم قرآن میں دوسری جگہ پڑھتے ہیں:

"(اے رسولؐ!) جس قبلے کی طرف تم پہلے سجدہ کرتے تھے ہم

نے اس کو صرف اس وجہ سے قبلہ قرار دیا تھا کہ جب قبلہ بدلا جائے تو ہم ان لوگوں کو جو رسولؐ کی پیروی کرتے ہیں ان لوگوں سے الگ دیکھ لیں جو اُلٹے پاؤں پھرتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۴۳)
کیا قرآن میں یہ نہیں آیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیدیا گیا تا کہ خدا دیکھ لے کہ وہ اس کی راہ میں کتنی فداکاری کرتے ہیں؟ (سورۂ صافات۔ آیت ۵-۱)
پھر میں نے اس نوجوان بھائی سے کہا کہ جس طرح اس مادی دنیا میں کمل کلیے ہیں کہ جب تک غور نہ کیا جائے نتیجہ ہاتھ نہیں آتا اسی طرح روحانی دنیا میں بھی ممکن ہے کہ ہماری ذہنی پختگی اور دائمی نیک بختی کے لیے ایسے کلیے موجود ہوں کہ اگر ہم غور نہ کریں تو اس نتیجے پر نہ پہنچیں۔

مثال

فرض کیجیے کہ لوگوں نے آپ سے کہا کہ سو قدم پر ایک خزانہ ہے اور آپ ایک سو دس قدم چل کر زمین کو چاہے کتنا کھودیں آپ کو کچھ نہیں ملے گا اس لیے ہم کو اسی مقدار کا لحاظ رکھنا چاہیے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ ٹیلی فون میں یہ باریکی محسوس ہو جاتی ہے کہ اگر ایک نمبر کم یا زیادہ ہو جائے تو اس مقام یا شہر سے جہاں آپ چاہتے ہیں رابطہ قائم نہیں ہوتا۔ اگرچہ مثالیں زیادہ ہو گئیں لیکن مجھے ایک مثال اور پیش کرنے کی اجازت دیجیے کہ گھر کے دروازے کی چابی یا مشین کے سوئچ میں ایک دندانہ کم ہو یا ضروری دندانوں میں سے ایک دندانہ اونچا

یا نیچا ہو جائے تو دروازہ نہیں کھلتا اور مشین چالو نہیں ہوتی۔

میں نے اسے جتنی مثالیں دیں اور جس قدر گفتگو کی میں نے دیکھا کہ وہ کتابیں پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے سے اتنا مغرور ہو گیا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ عبادت کے ضمن میں اس مسئلہ کو تسلیم کرے اور وہ یہ بھی نہیں مانتا کہ ہم وحی کی ہدایت کے بغیر تمام کمالات تک خود نہیں پہنچ سکتے اور نہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس محدود عقل اور علم کے ساتھ اس پر اسرار دنیا میں وسوسے، ابہام اور حیرانی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رکھتے۔

۲۔ کسی دوسرے خدا کا خود کو ظاہر نہ کرنا

ایک بات کہ جس کی طرف امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے ہمیں متوجہ کیا ہے یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا خدا ہوتا تو وہ بھی اپنے پیغمبر بھیجتا اور ہمیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا۔ علاوہ ازیں اگر دو خدا ہوں اور دونوں قدرت کے سرچشمے ہوں تو دونوں محدود ہوں گے اور محدود ہوں تو خدا نہیں ہیں کیونکہ محدود قدرت وہ قدرت ہے جو ایک مرحلے پر نابودی تک پہنچتی ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ ایسی قدرت خدا نہیں ہو سکتی یا پھر دونوں لامحدود قدرتیں ہوں۔ اگر دونوں لامحدود ہوئے تو بھی دونوں قدرت نہیں ہیں۔ میں اس بارے میں ایک عالم کی بیان کردہ ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

اگر آپ نے ایک معمار سے کہا کہ وہ ایسا گھر بنا دے جس کا رقبہ لامحدود ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ایک سے زیادہ گھر نہیں بنا سکتا کیونکہ دوسرے گھر کے لیے جگہ ہی نہیں بچے گی۔

شرک کی بحث

شرک یعنی: غیر خدا پر بھروسا کرنا اور خدا کی مخلوق کو خدا کا مقام دینا۔ خدا کی قدرت کے مقابلے میں ایک اور قدرت قرار دینا۔

شرک یعنی: غیر خدا کی بے چون وچرا اطاعت کرنا۔

شرک یعنی: ہر طرح کا گروہی میلان اور ہر قسم کی پرستش جو خدا کے لیے نہ ہو۔

قرآنی داستانوں میں زیادہ تر ان دو باتوں کا تذکرہ ملتا ہے:

۱۔ اللہ کی قدرت سے ایمان تازہ کرنا۔ غیبی امداد اور الطاف کا خیال، خدا کے قہر و غلبہ سے غافل نہ ہونا۔

۲۔ تمام مفروضہ سہاروں کو توڑ پھینکنا، تمام غلط معیاروں کو باطل قرار دینا اور شرک کی تمام جڑوں کو کاٹ ڈالنا۔

ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بے ایمان بیٹے کو خبردار کیا اور بتایا کہ اس زمانے کے تمام کافر خدا کے غضب سے طوفان میں غرق ہو جائیں گے۔ بیٹے نے کہا جب تک آپ کے خدا کا قہر موجود رہے گا میں پہاڑ کی چوٹی پر پناہ لیے رہوں گا۔ دیکھا آپ نے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کی منطق کیا ہے۔ وہ پہاڑ اور پہاڑ کی قوت کو قہرِ خدا کا مدمقابل سمجھتا ہے۔ یہ شرک کی اصلیت کی مثال ہے اور اب اگر ہم بھی نوح علیہ السلام کے بیٹے کی طرح کسی انسان یا کسی چیز کو خدا کے مقابلے میں کھڑا کر دیں تو ہم بھی مشرک ہو جائیں گے۔

شرک کے نمونے

ایک شخص کہتا ہے کہ اب ہمیں نمازِ استسقاء کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم جھیل یا ڈیم میں اپنی ضرورت کا پانی محفوظ کریں گے۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ خدا قہر نازل کرے اور لوگوں میں قحط پڑ جائے کیونکہ باہر سے گیہوں کے جہاز فوراً آجاتے ہیں۔

تیسرا شخص کہتا ہے کہ شرعی قانون جو اہمیت رکھتا ہے اسے ہم مانتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں کر سکتے کہ ملکی یا بین الاقوامی قوانین سے انحراف کریں یا یہ کہتا ہے کہ خدا کا حکم تو ایسا ہے لیکن مردوں یا عورتوں کی رضامندی کا بھی خیال کرنا چاہیے اس لیے ہم کبھی خدا کے حکم کی اور کبھی دوسروں کے حکم کی بھی پیروی کرتے ہیں ایسی قسم کا نظریہ اور منطق توحید اور بندگی کے خلاف ہے۔[1]

---

[1] ایک فقیہ بیان کرتے تھے: تقریباً بیس سال پہلے میں آیت اللہ خمینی کے ساتھ قُم سے تہران جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں میں نے ان سے کہا یہ بہت اچھا ہے کہ عراقی حکومت ایرانیوں کو عراق میں داخلے کی اجازت نہیں دیتی ورنہ قم کے علماء اور طلباء نجف چلے جاتے اور قم کا حوزۂ علمیہ ویران ہو جاتا۔ آیت اللہ اس گفتگو سے بہت آزردہ ہوئے اور راستے بھر مجھے سمجھاتے رہے کہ اگر کسی کے دل میں غیرِ خدا کا خیال ہے اور وہ سوچتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک اونچا اور دوسرا نیچا ہو جائے یعنی قم کا حوزہ پُر رونق اور نجف کا حوزہ بے رونق ہو جائے یا اس کے برعکس تو اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ اور مرضی کے سوا کسی دوسرے معاملے کی درستی کی فکر میں رہیگا اور اس طرح وہ توحید کے دائرے سے نکل جائیگا۔ تعلقات، رشتے، علاقے، خاندانے پلتے اور مقامی اور قبائلی تعصبات کی بجائے ہمارا مرکزِ خیال خدا اور صرف خدا ہونا چاہیے۔

قرآن مجید میں تقریباً دو سو مرتبہ "دُوْنِ اللّٰہِ" یا "دُوْنِہٖ" کے لفظ سے جو غیر خدا کے معنی دیتا ہے شرک کی بات کی گئی ہے۔ اگر ہم مشرک کی ایک ایسی علامت اور نشانی مقرر کرنا چاہیں جو صحیح بھی ہو اور قرآنی بھی تو یہ لفظ یعنی غیر خدا بہت مناسب ہوگا۔ ہاں جو لوگ غیر خدا کے پیچھے جاتے ہیں وہ اپنی عزت اور ذلت غیر خدا سے چاہتے ہیں' اور غیر خدا کا حکم اور قانون نافذ کرتے ہیں۔ وہ جنھوں نے غیر خدا سے دل لگا رکھا ہے' غیر خدا کی خوشنودی ان کے عمل کی محرک ہے۔ وہ جو غیر خدا سے ڈرتے ہیں' اور غیر خدا کے لیے کام کرتے ہیں وہ قطعی طور پر توحید کے دائرے سے باہر نکل گئے ہیں۔

مشرکوں کے اعداد و شمار

ان معنوں میں جو ہم نے بیان کیے ایسے مخلص لوگ کم ہیں جنھوں نے خدا کو اپنے اعمال کا محور بنا لیا ہو اور غیر خدا سے کسی اجر و ثواب کی آس نہ لگائی ہو' جو ریاکار نہ ہوں' خدائی قانون کا احترام کرتے ہوں اور غیر خدا کے قوانین کو رائج نہ کرتے ہوں' ہاں ایسے لوگ کم ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

"اکثر لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ خدا پر ایمان نہیں لاتے مگر یہ کہ شرک بھی کیے جاتے ہیں" (سورۂ یوسف۔ آیت ۱۰۵)

الجھن شرک کی نشانی ہے

نفسیات کا ایک بڑا مسئلہ الجھن اور الجھنوں کی روک تھام پر غور کرنا ہے لیکن میری نظر میں جو شخص توحید کے دائرے میں آگیا ہو اور اس کا فکر اور عمل خدا کے لیے ہو اس کی اعصابی شکستگی اور الجھن کے لیے کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ جب تک

اس کے برخلاف عمل اس سے ظاہر نہ ہو یا کوئی نفسیاتی الجھن وجود میں نہ آئے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جیسے ہی انسان نے خدا کے لیے قدم اٹھایا خدا اس کے کام کا خریدار ہو گیا[1] وہ اس کی باتیں سنتا ہے اور اس کے عمل کو دیکھتا ہے[2] اور وہ انسان غیر خدا سے نہ کوئی غرض رکھتا ہے نہ آس۔[3]

یہ جو ہماری باتوں میں اس قسم کے مسائل کا ذکر آتا ہے کہ فلاں کا کام اٹک گیا یا نہیں اٹکا، وہ ہار گیا یا جیت گیا، پھلا پھولا یا برباد ہو گیا۔ نیز نفسیات میں جو غور کیا جاتا ہے کہ فلاں کام میں ناکامی الجھن کا سبب بن گئی تو یہ کامیابیاں یا ناکامیاں توحید کے دائرے سے باہر زیر بحث آتی ہیں کیونکہ توحید کے دائرے میں ناکامی زیر بحث نہیں آتی۔ پیغمبرؐ خدا کے لیے اس زمانے میں جبکہ وہ بھیڑیں چراتے تھے یا مکے سے ہجرت کر کے مدینے چلے گئے یا غار ثور میں پناہ گزین ہوئے یا میدان جنگ میں تھے یا منبر پر خطبہ دیتے ہوئے یا اعمال حج میں طواف کی حالت میں تھے یا مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے پتھر ڈھونے میں مشغول تھے، کبھی جنگی لباس یا روزمرہ کے لباس میں ہوں، اکیلے ہوں یا لوگوں کے ہجوم میں، پیغمبرؐ خدا کی روح کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں ذمہ داریاں

---

[1] خدا نے مومنوں کی جان اور مال بہشت کے عوض خرید لیے ہیں (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۱۱)

[2] وہ تمام آیات جن میں خدا کو سمیع و بصیر بتایا گیا ہے۔

[3] اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جب اہلبیتؑ نے اپنے روزہ افطار کرنے کی غذا تین راتوں تک مسلسل قوم کے محروموں (غریب، یتیم اور قیدی) کو بخش دی تو فرمایا اس کھانا کھلانے سے ہمارا مقصد خدا کی خوشنودی ہے۔ ہم تم سے نہ شکریہ چاہتے ہیں نہ بدلہ (سورۂ دہر، آیات ۸،۹)

فرق پیدا کرتی ہیں۔ دل کی چاہتیں کوئی فرق نہیں ڈالتیں۔

یہ ہم ہیں کہ اگر با اختیار لوگ ہمارا عہدہ یا ہمارا لباس، ہمارا منبر، ہمارا دفتر یا ہماری جائے رہائش کو ہم سے چھین لینا چاہیں تو ہم اس سلسلے میں دلی رنجش سے بلکہ خودکشی کی حد تک سب سے آگے ہونگے اس لیے کہ یہ سب چیزیں ایک طرح سے ہمیں مرغوب ہیں یا بہتر طور پر یہ کہیں کہ یہ چیزیں ہمارے لیے بت بن گئی ہیں۔

بعض ممالک کی حکومتیں مذہبی علماء پر دباؤ ڈالتی ہیں کہ وہ مسجدوں میں حاکم کے لیے ضرور دعا کریں اور انھیں دھمکا کر یا لالچ دیکر اس کام کے لیے مجبور کرتی ہیں جس کے لیے ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ جب جرائم قابل تعریف بن جائیں تو طاغوت کی قوت بڑھ جاتی ہے اور قدرتی طور پر عرش اعظم جس سے حکومت الٰہی مراد ہے کانپ اٹھتا ہے۔ ہاں طاغوت کا حکم جتنا زیادہ مضبوط ہوتا جائیگا خدا کا حکم اتنا ہی کمزور پڑتا جائیگا۔ بالآخر ایسی صورت میں اگر وہ مذہبی عالم جو طاغوت کے دباؤ میں آنے کی بجائے اپنی جگہ چھوڑ کے چلا جائے یا خطابت و امامت چھوڑ دے تو طاغوت کا دباؤ اپنے سر سے کم کرسکتا ہے اور اس جرم میں شرکت سے بچ سکتا ہے لیکن جب رہنے کی جگہ، پیشہ، لباس اور منصب کسی شخص کی اصلیت (بنیادی حقیقت) اور اس کے لیے بت بن جاتے ہیں تو وہ اسے اپنا اسیر بنا لیتے ہیں۔

خدا اپنے با اخلاص بندوں کے مرتبے کے طفیل میں ہم کو اس قید و بند اور غیر خداؤں سے جو ہماری رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں نجات دے۔

شرک کے آثار

کسی کو خدا کا شریک بنانا برائی کی نشانی ہے جس کا ایک گوشہ ہم یہاں دکھاتے ہیں۔

۱۔ عملی اثر

شرک اعمال کے مٹنے اور فنا ہونے کا سبب ہوتا ہے اور قرآن کے کہنے کے مطابق انسان کے تمام نیک اعمال بھی شرک کی بدولت "حبط" ہو جاتے ہیں۔ کبھی زندگی کا ایک چھوٹا سا عمل ایسے لوگوں کی تمام محنتیں اکارت کر دیتا ہے۔ ان چند مثالوں پر غور کیجیے:

۱۔ ایک طالب علم سال بھر تک پوری مدت میں سبق پڑھتا ہے لیکن امتحان میں نہیں بیٹھتا۔ اس کے اسباق بے ثبوت کے رہ جاتے ہیں اور اگرچہ اس کا علم محفوظ ہے لیکن وہ اپنا سماجی اعتبار کھو بیٹھتا ہے۔

ب۔ وہ شخص جو عمر بھر اپنی صحت کا خیال رکھتا ہے لیکن ایک وقت تھوڑا سا زہر کھا لیتا ہے۔ یہ چھوٹا سا عمل اپنی صحت کے بارے میں اس کی تمام احتیاطیں بے اثر کر دیتا ہے۔

ج۔ ایک طالب علم عمر بھر کی خدمت، محنت اور استاد کی محبت و شفقت کے باوجود ایک عمل مثلاً استاد زادے کے قتل سے اپنے تمام اچھے کاموں کو ضائع کر دیتا ہے۔

بے شک کسی کو خدا کا شریک بنانا زہر کھانے اور استاد کے بیٹے کو مار ڈالنے

کے مانند ہے جو مدت العمر کی مشقتوں کو رائیگاں کر دیتا ہے۔ ذرا قرآن کی طرف رجوع کیجیے جو کہتا ہے:

"اگر ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو ان کا کیا دھرا سب کارت ہو جاتا۔" (سورۂ انعام۔ آیت ۸۸)

۲۔ شرک کا نفسیاتی اثر

یہ بات قطعی طور پر ظاہر ہے کہ انسان کی پریشانی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ سب لوگوں کو اپنے آپ سے راضی نہیں رکھ سکتا اس لیے کہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اور ان میں سے ہر ایک اس سے بہت سی امیدیں رکھتا ہے چنانچہ ایک انسان جو لوگوں کے طرح طرح کے مطالبوں میں پھنس جاتا ہے بے چین اور پریشان ہو جاتا ہے کیونکہ ایک انسان اور ایک جماعت کی خوشنودی کی قیمت دوسرے شخص اور دوسری جماعت کی ناراضی سے چکانا پڑتی ہے۔ یہاں توحید اور شرک کا مسئلہ زیر بحث ہے۔ موحّد انسان صرف خدا کو خوش کرنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ دوسرے لوگ یا گروہ کیا چاہتے ہیں چنانچہ فطری طور پر اسے ایک خاص سکون حاصل ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید دو مثالیں پیش کرتا ہے:

پہلی مثال

بھلا جُدا جُدا معبود اچھے یا ایک زبردست خدا (سورۂ یوسف۔ آیت ۳۹)

یعنی انسان ایک خدا کو راضی رکھنے میں سکون پاتا ہے یا طرح طرح

کا ذوق رکھنے والے کئی لوگوں کو راضی رکھنے میں؟

دوسری مثال

یہ مثال وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ آدمی جو صرف ایک شخص کا مطیع ہو سکون میں رہتا ہے یا وہ شخص جو کئی بداخلاق اور شعلہ مزاج لوگوں کی سرپرستی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ قرآن کے الفاظ یوں ہیں:

خدا نے ایک مثل بیان کی ہے کہ ایک وہ غلام ہے جس میں کئی جھگڑالو ساجھی ہیں اور ایک وہ غلام ہے جس کا ایک مالک ہے۔
کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟ (سورۂ زمر۔ آیت ۲۹)

علاوہ ازیں دوسروں کو راضی کرنا مشکل ہے لیکن خدا اپنے بندے سے جلدی راضی ہو جاتا ہے۔ دعائے کمیل میں ہے "یَا سَرِیْعَ الرِّضَا" اے جلدی راضی ہو جانے والے!

مزید برآں دوسرے لوگ راضی بھی ہو جائیں تو وہ ہماری کمزوریوں کو نہیں بھولتے۔ وہ بس خدا ہی ہے جو ہمارے عیبوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم دعا میں پڑھتے ہیں: اے خدا تو خوبیاں ظاہر کرتا اور عیب چھپاتا ہے۔

اصولی طور پر اگر لوگوں کا راضی ہونا توحید کے دائرے اور خدا کی حد میں نہ ہو تو اس کی کیا وقعت ہو گی۔ لوگ میرے لیے کیا کریں گے۔ ایک ذرا تالی بجائے" میرے نام پر کسی سڑک کا نام رکھ دیئے اور اسی قسم کی عارضی اور کھوکھلی حوصلہ افزائیوں کے سوا ان کے ہاتھوں کبھی کوئی دوسرا کام بھی ہوا ہے۔ اس سے قطع نظر کیا اس وقت جبکہ میں ماں کے پیٹ میں تھا خدا کے سوا اور کون میری نگرانی کرتا تھا؟

کیا اب میں اس کے زیرِ نظر نہیں ہوں؟ کیا کل قیامت میں مجھے اس سے سروکار نہیں ہوگا؟ کیا تمام خوبیاں اور کمالات اسی کی طرف سے نہیں ہیں اور کیا لوگوں کے دل اس کے قبضے میں نہیں ہیں؟ پھر میں کس لیے اصل کو چھوڑ دوں اور تیرے میرے خیال کے پیچھے بھاگتا پھروں۔

مختصر بات یہ ہے کہ ان تمام لوگوں کے راضی کرنے سے جو مختلف ذوق رکھتے ہیں خصوصاً جبکہ ان کی خوشنودی میرے ماضی اور مستقبل پہ کوئی اثر نہیں ڈال سکے گی اس ایک خدا کو راضی رکھنا بہت بہتر ہے جو جلدی راضی بھی ہوجاتا ہے اور دوسروں کے خیالات کو میرے لیے تبدیل بھی کرسکتا ہے اور اپنے ماضی اور مستقبل میں مجھے اس سے سروکار بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

دیکھو کہیں خدا کے ساتھ دوسرے کو اس کا شریک نہ بنانا ورنہ تم برے حال میں ذلیل و رسوا بیٹھے کے بیٹھے رہ جاؤ گے۔

(سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۲۲)

ہم عمر بھر دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے دوڑتے رہے اور آخرکار یہ سمجھے کہ سب لوگ ہم کو صرف اپنی غرض سے چاہتے ہیں۔ یہ صرف خدا ہے جو ہمکو ہمارے لیے چاہتا ہے۔ لوگ جیسے ہی دو ہمیں دوست بنا لیتے ہیں اور کوئی دوسری جگہ اپنا لیتے ہیں ہمیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور اس طرح ہمیں بدبختی کے ایک حلقے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر قرآن میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ: تمھاری بعض اولادیں اور بیویاں تمھاری دشمن ہیں (سورۂ تغابن۔ آیت ۱۴)۔

تو وہ انھی معنوں پر دھیان دینے کے لیے ہے۔ ہماری بعض بیویاں اور اولادیں ہم کو صرف اپنے آرام کی خاطر چاہتی ہیں چاہے اس کا بدلہ ہمیں

اپنی بدبختی اور بربادی کی شکل میں ہی کیوں نہ ملے۔

۳۔ شرک کا اجتماعی اثر

توحیدی معاشرے میں ذاتی ذوق، قانون اور گروہی میلانات سب ایک ہی حلقے میں داخل ہیں۔ حکم، قانون اور راہ صرف ایک ہی ہے اور وہ خدا کی راہ اور خدا کا قانون ہے اور سب لوگوں کا ایک ہی سرپرست ہے لیکن شرک کے معاشرے میں ایک قانون اور ایک راہ کی بجائے سینکڑوں قانون اور راہیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر شخص اسی راہ اور اسی بات کی حمایت کی کوشش میں رہتا ہے جو اس نے اختیار کر رکھی ہے اور بقول قرآن:

اس وقت ہر خدا اپنی اپنی مخلوق کو لیے پھرتا۔ (سورۂ مومنون۔ آیت ۹۱)

یعنی اس معاشرے میں وکلاء حقیقت کی نہیں صرف اپنے اپنے مؤکلوں کی حمایت کرتے ہیں۔

اس معاشرے میں خدا کی عبادت مقصود نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کی خوشامد پیش نظر ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

پروردگارا! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کا کہنا مانا تو انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۶۷)

لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے رقابت رکھتے ہیں۔ بقول قرآن:

یقیناً ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا۔ (سورۂ مومنون۔ آیت ۹۱)

اور جو کچھ اس کے نزدیک پسندیدہ ہے ہر گروہ اسی سے اپنا دل خوش کرتا ہے اور حق و باطل سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ صرف اپنے مقصد، اپنی

راہ، اپنے خیر خواہوں اور اپنے سماجی مقام کی حقیقت کا قائل ہوتا ہے لیکن اپنے مخالفوں کی (چاہے وہ مخالفت کے دلائل بھی رکھتے ہوں) قدر و قیمت کا قائل نہیں ہوتا، اور قرآن کے کہنے کے بموجب:

جس فرقے کے پاس جو دین ہے وہ اسی میں نہال ہے۔

(سورۂ روم۔ آیت ۳۲)

غلبے، سرکوبیاں، بے جا پروپیگنڈے اور اختلافات شرک کے اجتماعی آثار ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

تم مشرکوں میں شامل نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے اصلی دین میں تفرقہ پردازی کی اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ (سورۂ روم۔ آیات ۳۱-۳۲)

اور یہ نہ سوچنا کہ صرف بت پرست ہی مشرک ہوتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلافات ڈالنے والے اور ذاتی پسند و ناپسند اور خود ساختہ نظریات (جنھیں وہ کسی مکتب کے سر تھوپتا ہے اور اپنی اصلیت اور پاکیزگی سے محروم کر دیتا ہے) درآمد کرنے والے کے مکتب میں شامل نہ ہونا ورنہ تم بھی مشرک ہو جاؤ گے کیونکہ تم خدا کے حکم کے پہلو بہ پہلو اپنے ذوق اور نظریے کو بھی دخل دیتے ہو۔

آخرت پر شرک کا اثر

رسوائی کے ساتھ دوزخ میں داخلہ شرک کے اخروی اثرات میں شامل ہے۔ ہم قرآن مجید میں بار بار پڑھتے ہیں کہ قیامت میں مشرکوں سے خطاب ہو گا کہ تم دنیا میں غیر خدا کے پیچھے چلتے تھے اور سوچتے تھے کہ وہ تمھارے دکھ کی دوا کریں گے۔ آج تمھاری پکڑ کا دن ہے، اب انھیں بلاؤ کہ وہ

تمھاری نجات کے لیے کوئی تدبیر سوچیں۔ قرآن مزید کہتا ہے:

خدا کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنانا ورنہ تمھیں نہایت رسوائی کے ساتھ جہنم کے بھڑکتے شعلوں میں جھونک دیا جائے گا۔

(سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۸)

توحید کا منظر

قرآن مجید کا طریقہ ہے کہ وہ امر اور نہی اور صحیح لائحہ عمل کا خاکہ بتانے کے علاوہ اس ضمن میں مثال اور نمونہ بھی پیش کرتا ہے، جو بجائے خود قرآنی مثالوں کے زیرِ عنوان ایک دلچسپ بحث ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے مومنوں کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال کتنی اچھی ہے جو دلکش اور فریب دینے والے اسباب کے باوجود بھی اپنے راستے سے نہیں بھٹکی۔ وہ ایسی ایماندار تھی کہ فرعون کے دربار کی ناز برداریاں، نعمتیں، دولت اور منصب بھی اس کے ارادے کو متاثر نہ کرسکے اور وہ ایمان کے درجات میں ترقی کرتی چلی گئی حتیٰ کہ اس نے خدا سے اپنی بخشش کی دعا کی۔ قرآن کہتا ہے:

خدا نے مومنین کی تسلی کے لیے فرعون کی بیوی (آسیہ) کی مثال بیان فرمائی ہے کہ جب اس نے دعا کی "پروردگارا! میرے لیے اپنے یہاں بہشت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کی کارستانی سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں کے ہاتھ سے چھٹکارا عطا فرما۔" (سورۂ تحریم۔ آیت ۱۱)

ہم قرآن میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ ایک کافر کی واضح مثال حضرت نوحؑ کی

بیوی ہے کہ کس طرح مخالفت، ضد اور ہوس اس کے ہدایت پانے میں رکاوٹ بنی (سورۂ تحریم۔ آیت ۹) اس حد تک کہ وحی کے گھر میں اور حضرت نوح علیہ السلام جیسے پیغمبر کی رفاقت میں بھی اسی طرح اپنی راہ پر قائم رہی۔ قرآن کہتا ہے:

خدا نے کافروں کی عبرت کے واسطے نوحؑ کی بیوی (واعلہ) اور لوطؑ کی بیوی (واہلہ) کی مثال بیان فرمائی ہے۔ (سورۂ تحریم۔ آیت ۱۰)

توحید کا مثالی ہیرو

قرآن مجید حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہتا ہے:

حضرت ابراہیمؑ مشرک نہیں تھے۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۹۵)

اب ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تاریخی حالات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کے کارناموں کی ایک فہرست مرتب کرتے ہیں تاکہ مکتب توحید میں ان کا ہیرو ہونا واضح ہو جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے فرائض منصبی میں خدا کے مطیع اور فرمانبردار تھے اور کوئی رکاوٹ ان کا راستا نہیں روک سکتی تھی۔ وہ ان تمام آزمائشوں میں کامیاب رہے جن میں خدا نے انھیں ڈالا۔ قرآن کہتا ہے:

جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا جنھیں انھوں نے پورا کر دیا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)

۱۔ ہوا و ہوس کا بت توڑا

ان کے پیارے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے بارے میں جو تقریباً سو سال

کی عمر میں انھیں عطا ہوئے تھے' انھیں حکم ملا کہ اپنے نوجوان بیٹے کو ذبح کر دیں۔ انھوں نے بلا عذر اس حکم کی اطاعت کی' محبت پر فرض کو مقدم رکھا۔ ہوا وہوس کا بُت اپنے اندر توڑ دیا۔ اپنے نفس کو روند ڈالا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لٹا کر ان کی گردن پر چھری رکھی ہی تھی کہ حکم آیا:

"اے ابراہیمؑ! اپنا ہاتھ روک لو کیونکہ ہمارا یہ حکم ایک امتحان تھا"
ہاں وہ اندرونی بت توڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

(سورۃ صافات۔ آیت ۱۰۵)

۲۔ اپنے عہد کے طاغوت کو کچل دیا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے غرور کو بحث و استدلال سے مٹی میں ملا دیا۔ (سورۃ بقرہ۔ آیت ۲۵۸)

۳۔ نیچر (فطرت) کا بُت توڑا

چاند سورج اور ستاروں کو پوجنے والوں کے مقابلے میں اپنے دستور (میں غروب ہو جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا) کے مطابق ان کے چلن پر اعتراض کیا اور ان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا۔ (سورۃ انعام۔ آیت ۷۶)

۴۔ اپنے عزیزوں سے خدا کی خاطر تعلقات ختم کر لیے۔ (سورۃ ابراہیم۔ آیت ۳۶)

۵۔ دین کی عزت کی خاطر اپنی بیوی اور دودھ پیتے بچے سے بھی درگزرے۔

(سورۃ ابراہیم۔ آیت ۳۷)

۶۔ اپنی جان سے (جس وقت انھیں آگ میں ڈالا گیا) ہاتھ دھو لیے (سورہ انبیا آیت ۶۹)

قرآن مجید میں مندرجہ بالا باتیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ ہم نے صرف اس لیے کہ فہرست نگاری سے قدم باہر نہ نکالیں سورتوں اور آیتوں کے حوالوں پر ہی اکتفا کیا ہے۔

ریا کار مشرک ہے

ہم حدیث میں پڑھتے ہیں: ہر ریاکاری شرک ہے (کُلُّ رِیَاءٍ شِرْکٌ) البتہ شرک کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ یہ کبھی تو بالکل ظاہر اور عیاں ہوتا ہے جیسے بت، چاند یا سورج کو پوجنا اور کبھی اتنا خفیف ہوتا ہے کہ خود انسان بھی جو اس میں مبتلا ہوتا ہے اسے نہیں سمجھ پاتا۔ ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ یہ شرک اور اخلاص (توحید تنزیہی) کا مسئلہ اور اس کی پہچان اس قدر مشکل ہے جتنی آدھی رات کو پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی پہچان، اس لیے اللہ کی دائمی مدد، غور و خوض اور جستجو کے بغیر شرک کے باریک جال سے مخلصی آسان کام نہیں ہے۔

با اخلاص انسان کی علامات

۱۔ امید اور انتظار نہیں کرتا

قرآن مجید ایسے لوگوں کو اخلاص کا نمونہ سمجھتا ہے جو اپنی ضرورت کا کھانا اور وہ بھی افطار کے وقت مسلسل تین راتوں تک معاشرے کے محروموں کو دینے کے بعد یہ کہہ دیتے تھے کہ ہم تو لوگوں سے کسی بدلے اور انعام کی امید نہیں رکھتے اور نہ تم سے اپنی تعریف اور شکریے کی توقع کرتے ہیں۔ (سورۂ دہر

کی آیات ۸۔۹ کی طرف اشارہ ہے) اس لیے وہ شخص اخلاص نہیں رکھتا جو اپنے اس کام کے بدلے میں جو وہ کرتا ہے لوگوں سے بدلہ اور تعریف کی نیت رکھتا ہے اور جب یہ دیکھتا ہے کہ کوئی اس کے کام کی تعریف نہیں کرتا تو پشیمان ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو اپنی نیت پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

۲۔ جبلتوں کے طوفان سے بچاؤ

اخلاص کی دوسری علامت یہ ہے کہ میرے کام پر ذاتی جذبات اور جبلتوں کا کوئی اثر نہ پڑے۔ آپ سب نے سنا ہوگا کہ امیرالمومنین امام علی علیہ السلام نے لڑائی میں دشمن کو زمین پر گرا کر چاہا کہ اسے قتل کردیں۔ دشمن نے (انکے منہ پر تھوک کر) ان کی توہین کی۔ امام کو غصہ آگیا۔ اسی وجہ سے آپ نے کچھ وقت صبر کیا یہاں تک کہ آپ کی مزاجی کیفیت معمول پر آگئی۔ پھر آپ نے دشمن کو قتل کیا اور فرمایا میرا صبر اس لیے تھا کہ خدا کے حکم کی تعمیل میں میرے ذاتی جذبات، فطری تقاضے اور وہ غصہ جو اپنی توہین کی وجہ سے مجھے آگیا تھا یہ سب میرے عمل جہاد پر اپنا اثر نہ ڈالیں۔

۳۔ با اخلاص آدمی شرمندہ اور ناکام نہیں ہوتا

با اخلاص انسان جو کام کرتا ہے خدا کے لیے کرتا ہے اور اس کا اجر محفوظ ہوتا ہے اس لیے اسے ہار جیت، غم اور خوشی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اسے کوئی الجھن نہیں ہوتی کیونکہ تمام الجھنوں

کی جڑ پوری نہ ہونے والی امیدیں (حسرتیں) اور ہماری ناکامیاں ہیں اور با اخلاص انسان کبھی ناکام نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ اپنی مراد خدا کی رضا اور اس کے حضور مقبول ہونے سے حاصل کرتا ہے اور راحت سے زندگی گزارتا ہے۔

ہم شرک اور بے جا امیدوں سے کس طرح بچیں

قرآن میں شرک سے بچنے پر بہت زور دیا گیا ہے اور سچ مچ اگر ہم شیطان کے قید و بند سے چھوٹ جائیں، اندرونی محاذ پر خواہشات نفس کو پاؤں تلے روند ڈالیں اور بیرونی جہاد میں طاغوتوں کو مٹا ڈالیں تو پھر شرک و ریا کا کوئی مسئلہ باقی نہ رہے۔ ہماری بدبختی اور ہماری راہ کی تمام رکاوٹیں شرک کی یہی کجرویاں، دلی تحریصات اور بیرونی طاغوت ہیں اور درحقیقت شرک کا دور ہونا توحید پر مقدم ہے کیونکہ جب تک برتن خراب غذا سے خالی نہیں ہو جاتا اس میں اچھی غذا نہیں ڈالی جا سکتی اس لیے توحید کے مکتب میں کلمہ لَآ اِلٰهَ کلمہ اِلَّا اللّٰهُ پر مقدم ہے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں شرک کے اسباب کی نشاندہی کرتا اور کہتا ہے:

> اے انسان! یہ سہارے جو تو نے اپنے لیے ڈھونڈ رکھے ہیں اور تو ان سے حسن مدد، فائدے اور عزت کی امید رکھتا ہے وہ مکڑی کے جالے کی طرح ناپائدار ہیں۔ (سورہ عنکبوت۔ آیت ۴۱)

اور دوسری جگہ کہتا ہے کہ:

> غیر خدا تو اپنے ہی نفع و نقصان پر قادر نہیں ہیں وہ تیری

کیا مدد کریں گے۔ (سورۂ رعد۔ آیت ۱۶)

قرآن مجید میں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ:

چاہے تمام طاغوتی طاقتیں جمع ہو جائیں لیکن یہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتیں۔ (سورہ حج۔ آیت ۷۳)

کیا تو ان غیر خداؤں کی طرف سے عزت چاہتا ہے۔ (سورۂ نساء۔ آیت ۱۳۹)

اور کبھی قرآن مثالیں بیان کرتا ہے کہ کس طرح قارون، فرعون، نمرود اور انکا خوشامدی ٹولہ قہر خدا کو روکنے میں ناکام رہا۔

مختصر یہ ہے کہ قرآن مجید نے شرک کو مٹانے کے لیے راہیں دکھا دی ہیں:

۱۔ ان کی حقیقت کو بیان کرنا کہ یہ قوتیں جو نہ نفع نقصان پر قادر ہیں نہ پیدا کرنے، بچانے اور عزت دینے پر، کس طرح ہماری امیدوں کا مرکز بن سکتی ہیں۔

۲۔ دنیا میں نمونے دکھانا کہ لوگوں نے کس طرح غیر خدا پر تکیہ کیا اور پھر کوئی پھل نہیں پایا لیکن خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں، حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں، حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں، حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے دشمنوں سے جنھوں نے آپؐ کے گھر کو گھیر لیا تھا بچا لیا۔[1]

---

[1] ہم نے موجودہ زمانے میں اس بات کا ثبوت خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کس طرح تمام قوتیں بادشاہ کی محافظت کے لیے اور آیت اللہ خمینی کو نابود کرنے کے درپے رہیں لیکن ناکام ہوگئیں۔

اسی طرح خدا اپنے مخلص اور مومن بندوں کو بھی نجات دیتا ہے۔ (سورۂ انبیاء۔ آیت ۸۸)

۳۔ خدا اور غیر خدا کے درمیان موازنہ: شرک کو مٹانے کے لیے قرآن کا ایک طریقہ وہ موازنہ ہے جو وہ خدا اور غیر خدا کے درمیان کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے انسان کو خبردار کرتا ہے کہ ایک انسان کس طرح ذلت کے گڑھے میں جا گرتا ہے اور کس چیز کو کس چیز کی جگہ قبول کر لیتا ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند آیتوں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

ا۔ کیا وہ خدا جو (اتنی مخلوقات کو) پیدا کرتا ہے وہ ان (بتوں) کے برابر ہو سکتا ہے جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے تو کیا تم (اتنی سی بات بھی) نہیں سمجھتے۔ (سورۂ نحل، آیت ۱۷)

ب۔ بے شک وہ بھی جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو تمھاری ہی طرح (خدا کے) بندے ہیں۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۹۴)

اور خود تمھاری ہی طرح کی محدود، ضعیف، عاجز اور حاجتمند مخلوق ہیں۔ سچ مچ تم نے اپنی عزت اپنے ہاتھوں سے کیوں دے ڈالی ہے اور اپنی طرح کے لوگوں کے سامنے اس قدر عاجزی کیوں کرتے ہو؟ ہاں اخدا پر ایمان جاتا رہا تو عزت نفس بھی جاتی رہے گی اور انسان ہر ایک کے سامنے ذلیل وخوار ہو جائے گا۔ اس مقام پر اگر میں ایسی ذلتوں اور غلامیوں کے بارے میں ڈاکٹر محمد اقبال کے دو اشعار نقل کر دوں تو بے جا نہ ہوگا۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولی نذر قباد و جم کرد

ایک انسان نے اپنے اندھے پن کی وجہ سے دوسرے انسان کی غلامی اختیار کی۔ وہ آزادی کا ایک موتی رکھتا تھا لیکن

وہ اس نے کیقباد[1] اور جمشید[2] کو دے ڈالا۔

یعنی در خوئے غلامی زسگاں خوار تراست

من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

یعنی غلامی کی عادت میں وہ کتوں سے بھی بد تر ہے میں نے نہیں دیکھا کہ کسی کتے نے دوسرے کتے کے سامنے سر جھکایا ہو۔

ج۔ تم نے خدا کے جتنے بھی شریک بنائے ہیں کیا ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو تمھیں حق کی راہ دکھا سکے۔

(سورۃ یونس۔ آیت ۳۵)

۴۔ شرک کا مقابلہ کرنے اور اسے مٹانے کے لیے چوتھی راہ نماز، حمد، دعا اور ذکر ہے کہ اگر اس کا ہر لفظ اور جملہ دھیان دے کر ادا کیا جائے تو انسان کے دل و دماغ میں توحید کی روح شگفتہ ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر اگر ہم ایک لمحہ کے لیے جملہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، بِحَوْلِ اللّٰہِ اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے معنی پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کے معنی ہیں ہر صفت اور خیال سے بڑا، ہر انسان کے سوچ سے بڑا دیکھنے سننے، کہنے اور لکھنے کے لائق تمام باتوں سے بلند، بڑی طاقتوں طاغوتوں اور ان کی سازشوں سے بڑا۔

بِحَوْلِ اللّٰہِ وَقُوَّتِہٖ اَقُوْمُ وَاَقْعُدُ، اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

میں اللہ کی قدرت اور طاقت ہی سے اٹھتا بیٹھتا ہوں۔

---

[1] و [2] قدیم ایران کے دو مشہور بادشاہ

ہماری عبادت صرف اسکے لیے ہے۔ نہ ہم مشرق کے بندے بنیں گے نہ مغرب کے۔ ہم اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اس لیے کہ اس کی قدرت لامحدود ہے، اور جو کچھ دنیا میں ہے اسی کا لشکر ہے۔ وہ ہوا، ریت، بادل، چاند اور پانی سے بھی انسان کی مدد کر سکتا ہے۔ اس نے فرشتوں، دشمنوں کے دلوں میں خوف یا ان کے سروں پر آسمانی پتھروں اور بے وقت کی بارشوں سے اور مومنوں کو تسکین دیکر انسان کی مدد کی ہے[1] ہم اسی سے مدد چاہتے ہیں جس کی طرف سے اور جس کے ہاتھ میں زندگی ہے۔

مختصر یہ کہ دعاؤں کا ہر جملہ توحید کی روح کو زندہ کرنے اور غیر خداؤں سے تعلق ختم کرنے کے لیے ایک اٹھتی ہوئی لہر ہے البتہ یہ جستجو اور تلاش کو ترک کرنے، ذاتی کوشش اور دنیاوی ذرائع سے استفادہ نہ کرنے کے معنوں میں نہیں ہے۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس کتاب میں ہماری گفتگو مفصل مطالعہ کے درجے پر نہیں ہے اس لیے اگر ہم نے توحید کی روح کے شگفتہ ہونے اور شرک کا جال توڑنے کے لیے چار راہیں بیان کی ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی پانچویں راہ نہیں ہے بلکہ ان کلاسوں میں اصول عقائد کے اسباق پڑھاتے وقت جو مطالب خدا نے میرے ذہن میں ڈالے وہ یہی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس مقصد کے لیے دوسری راہیں بھی ہوں۔

---

[1] ان میں سے ہر ایک کے لیے قرآن میں مثالیں موجود ہیں۔

مشرک قوم کی علامت

قرآن سورۂ زمر میں فرماتا ہے: جب صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں اور جب خدا کے سوا (اور معبودوں کا) ذکر کیا جاتا ہے تو پھر ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں (آیت ۴۵) مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ خدا کے حکم کے مطابق اس روش یا شخص یا گروہ کا مقابلہ کرنا چاہیے، یہ خدائی فریضہ ہے تو کچھ چہرے بگڑ جاتے ہیں لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں بین الاقوامی قانون کے مطابق ...... تو وہی چہرے کھل اٹھتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے شرک کی علامت ہے۔ اگر ہم کہیں کہ "خدا چاہتا ہے" تو ناخوش ہو جاتے ہیں اور اگر ہم کہیں کہ لوگ ایسا چاہتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ تمام معاملات میں وحی کے بجائے ان لوگوں نے اپنی آنکھیں مشرق و مغرب کی طرف لگا رکھی ہیں۔ خدا کی بجائے غیروں کی طرف توجہ اور اس کے قانون کی جگہ غیر کے قانون سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ ایک قوم کی گمراہی کی علامت ہے۔

جہاں والدین کی اطاعت کو منع کیا گیا ہے

قرآن مجید میں پانچ مرتبہ والدین کے ساتھ نیکی کرنے کے متعلق سخت تاکید[1]

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۸۳، سورۂ نساء آیت ۳۶، سورۂ انعام آیت ۱۵۱، سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲۳ اور سورۂ احقاف آیت ۱۵۔

آئی ہے اور چار موقعوں پر توحید اور خدا کی خالص بندگی کے پہلو بہ پہلو والدین کے احترام کا مسئلہ بھی بیان ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا وجود پہلے مرحلے میں خدا سے اور دوسرے مرحلے میں والدین سے وابستہ ہے۔ یہ تو ہے اس مسئلہ کا ایک پہلو لیکن دوسری طرف والدین کی خدمت بھی خاصی اہمیت کی حامل ہے جس کا ذکر توحید، ایمان اور خدا کی بندگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔
روایات میں ماں باپ کے ادب و لحاظ کے متعلق اس حد تک سفارش کی گئی ہے کہ ان کو دل کی چاہت سے دیکھنا عبادت میں شمار کیا گیا ہے۔ ان سفارشات کے باوجود اگر والدین خدا کی راہ سے اولاد کو ہٹانے کی کوشش کریں تو ان کی اطاعت ممنوع ہے اور اولاد کا فرض ہے کہ وہ ان کی نافرمانی کرے۔ ایسی نافرمانی کا ذکر قرآن کی دو آیتوں میں نظر آتا ہے جن کی تشریح اور معنی یکساں ہیں:

> اگر تیرے ماں باپ تجھے اس بات پر مجبور کریں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک بنائے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو تو ان کا کہنا نہ ماننا۔ (سورۂ عنکبوت آیت ۸ و سورۂ لقمان۔ آیت ۱۵)

اس قسم کی کوششیں کبھی ہمدردی کی شکل میں ہوتی ہیں کہ لے بیٹے ہم اگر فلاں طاغوت کی اطاعت نہیں کرتے تو ہمارا آب و دانہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ہمارا مال، منصب اور عزت اس بات سے وابستہ ہے کہ اس وقت ہم جی حضوری کرنے لگیں۔ کبھی یہ کوششیں بیٹے کی بے عزتی کی شکل میں ہوتی ہیں کہ تو نہیں سمجھتا، وہ بزرگ جو ہم سے پہلے گزرے ہیں وہ اسی راستے پر چلتے رہے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے وقت کے طاغوتوں کی تعظیم اور اطاعت کی ہے اور زندگی آرام سے گزاری ہے۔ ہمارے بزرگوں اور ہمارے خاندان کی روایات

کا یہی تقاضا ہے کہ فلاں راہ پر چلیں، فلاں اصول کو قبول کریں، فلاں عمل میں مشغول ہوں، فلاں ذوق رکھیں اور اسی طرح کی سیکڑوں دوسری باتیں جن سے قرآن کی تشریح کے بموجب ماں باپ اپنی پوری کوشش سے اپنی اولاد کو غیرِ خدا کی راہ پر لگا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے موقع پر جب شرک اور غیرِ خدا پر ایمان اور اسکی اطاعت کا مسئلہ درپیش ہو تو والدین کی مخالفت کرنا چاہیے۔

نہ بخشا جانے والا گناہ

شرک ایک نہ بخشا جانے والا گناہ ہے۔ سورۂ نساء میں دو بار آیا ہے:

"بے شک خدا اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کوئی شریک بنایا جائے۔ ہاں اس کے سوا جس گناہ کو وہ چاہے معاف کر دے۔ (سورۂ نساء- آیات ۴۸ و ۱۱۶)

البتہ خدا کی بخشش ان لوگوں کے لیے ہے جن کو وہ بخشنا چاہتا ہے اور خدائے دانا کی مرضی خود انسان کی پرہیزگاری اور اس کے حسنِ عمل سے مربوط ہے۔

مشرکوں کے مقابلے میں ردِ عمل

ہمیں چاہیے کہ ان لوگوں سے بے تعلق اور بے خبر نہ رہیں جن کا مقصود غیرِ خدا ہے اور جن کی کوشش خدائی فرض کو پورا کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد خود اپنے آپ کو اور اپنے منصب کو بلند کرنا اور اپنے گروہ کو مقبول بنانا ہے کیونکہ اگر ہم خدا کی سیدھی راہ پر نہیں چلیں گے تو سب

گردہ اور لوٹے ہم پر للچائیں گے اور ہم مردہ لاش کی طرح اپنی مرضی کے بغیر کتنے ہی مردار خواروں کے قبضے میں آجائیں گے جو ہر روز ہمیں ایک طرف سے دوسری طرف لے جائیں گے اور جیسے ہی ہم سے اپنا کام نکال لیں گے ہمیں چھوڑ دیں گے اور کسی دوسرے شکار کی تلاش میں لگ جائیں گے۔

استاد شہید مطہری فرمایا کرتے تھے کہ دعا کا یہ جملہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ سنایا کرو:

خَابَ الْوَافِدُوْنَ عَلٰی غَیْرِكَ وَخَسِرَ الْمُتَعَرِّضُوْنَ اِلَّا لَكَ۔

اے خدا! جو تیری بارگاہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر میں گئے وہ ہار گئے اور جنھوں نے تیرے غیر کی طرف رجوع کیا انھوں نے گھاٹا اٹھایا۔

محترم قاری نیچے لکھے ہوئے کلیوں پر غور کریں:

انسان ان راستوں میں سے ایک پر چلے۔

۱۔ وہ راستا جو اپنی مرضی سے اپنے لیے معین کرتا ہے۔

۲۔ وہ راستا جو دوسرے اس کے لیے معین کرتے ہیں۔

۳۔ وہ راستا جو خدا اس کے لیے معین کرتا ہے۔

پہلا راستا درست نہیں ہے کیونکہ میں ایک دن اس کا فیصلہ کرتا ہوں لیکن دوسرے ہی دن سمجھتا ہوں کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ میں اپنے علم کی کمی اور جبلتوں کی حکمرانی میں سیکڑوں راستوں میں سے درست راستا کیسے چن سکتا ہوں!

دوسرا راستا بھی غلط ہے کیونکہ بقول امیرالمومنین امام علی علیہ السلام

"ماں نے مجھے آزاد جنا ہے تو اب میں کیوں کسی شے کی ہوس میں گرفتار ہو جاؤں"

کیونکہ یہ اندھی اطاعتیں بذاتِ خود شرک ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

اگر (کہیں) تم نے ان کا کہنا مان لیا تو (سمجھ رکھو کہ) بلاشبہ تم بھی مشرک ہو۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۱۲۱)

اب باقی رہ جاتا ہے تیسرا راستا اور وہی خدائی راستا (سبیل اللہ)[1] ہے۔

یہی میرا سیدھا راستا ہے۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۱۵۳)

اس راہ میں کسی طرح کی کجی (خرابی) نہیں ہے۔ (سورہ کہف۔ آیت ۱)

یہ سیدھا راستا محمدؐ کا راستا ہے جو بے شک مرسلین میں سے ہیں۔ (سورۂ یٰسین۔ آیات ۳-۴)

یہ سیدھا راستا دوسروں (مَغضُوبِ عَلَیْهِمْ اور ضَآلِّیْنَ) کے راستوں کے خلاف ہے۔ (سورۂ فاتحہ)

یہ راستا نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحوں کا راستا ہے۔ (سورۂ نساء۔ آیات ۶۸-۶۹)

مختصر یہ ہے کہ یہ راستا بندگی کا راستا ہے۔ یہ ایسا راستا ہے جو وحی کے ذریعے سے خدا کے لامحدود علم سے نکلا ہے۔ معصوم پیغمبروں اور اماموں اور عادل فقیہوں کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے اور ہمارا راستا یہی راستا ہے۔[2]

---

[1] قرآن میں خدائی راستے کا ذکر سبیل اللہ کے نام سے پچاس سے زیادہ مرتبہ آیا ہے خصوصاً ہجرت، جہاد اور قتال کے بارے میں ضروری سمجھا گیا ہے کہ یہ ضرور فی سبیل اللہ ہونے چاہئیں۔

[2] حضرت امام مہدی آخر الزماںؑ کا فرمان کہ غیبت کے زمانے کے حوادث و واقعات میں ہوا و ہوس سے پاک فقیہوں کی طرف رجوع کرو۔

اب جبکہ توحید کا راستا واضح ہو گیا ہمیں دوسرے راستوں کے مقابلے میں اپنے ردعمل کا اظہار بھی کرنا چاہیے ورنہ ہماری لاتعلقی سے لوگ غلط فائدہ اٹھائیں گے اور ہمیں توحید کے دائرے اور سیدھے راستے سے دور لیجائیں گے۔

خدا اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ مشرکوں سے کنارہ کش رہو۔
(سورۂ انعام۔ آیت ۱۰۶)

مشرکوں کو مسجد بنانے کا بھی حق نہیں ہے۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۷)

تمھیں ان کے لیے دعائے خیر کا بھی حق نہیں ہے۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۱۳)

پوری قطعیت اور ثابت قدمی سے اپنے راستے پر قائم رہو اور دوسرے راستوں اور ان راستوں کی طرف بلانے والوں کو چھوڑ دو۔ (سورۂ ممتحنہ۔ آیت ۴)

عدل

ظلم کے اسباب

پہلے باب میں ہم نے مختصر طور پر الٰہی جہاں بینی اور توحید اور شرک کے بارے میں بحث کی تھی۔ اس باب میں ہم اپنے دوسرے اعتقادی اصول یعنی عدل پر گفتگو کرتے ہیں۔

ہم اس عقل کی قوت سے جو خدا نے ہمیں عنایت کی ہے اچھائیوں اور برائیوں کو پہچانتے ہیں اور اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ظلم برا ہوتا ہے اور عدالت اچھی چیز ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کوئی برا کام نہیں کرتا اور اس کے پاس ظلم وستم نہیں ہے کیونکہ وہ تمام ظلم وستم جو ہم انسان میں دیکھتے ہیں وہ مندرجہ ذیل نکاسوں میں سے کسی ایک سے نکلتے ہیں:

۱۔ جہل

کبھی کبھی جہل اور نادانی ظلم کا سبب ہوتی ہے مثلاً انسان یہ بات نہیں

جانتا کہ سفید اور سیاہ نسلوں میں باہم کوئی فرق نہیں ہے اس لیے ایک سفید رنگت رکھنے والا انسان اپنی برتری کے زعم میں کالی رنگت والے انسان پر ظلم کرتا ہے۔ اس ظلم کی جڑ ناواقفیت یا خود غرضی ہے اس لیے ممکن ہے کہ ایک انسان اپنی غلط اندیشی، کج فہمی اور نادانی سے ایسے کام کرنے لگے جن کا نتیجہ سوائے ظلم کے کچھ نہ ہو لیکن وہ خدا جسے جہل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جس کا علم لامحدود ہے کس طرح ممکن ہے کہ اس سے ظلم سرزد ہو؟

۲۔ خوف

کبھی ظلم کا محرک خوف ہوتا ہے مثلاً ایک قوت اپنی دشمن قوت سے گھبراتی اور ڈرتی ہے کہ اگر وہ اپنی مخالف قوت پر حملہ نہیں کرے گی تو ادھر سے اس پر حملہ ہو جائے گا اس لیے وہ پیش بندی کرتے ہوئے حملہ آور ہو کر اس پر ظلم کرتی ہے یا طاغوت اپنی طاقت کی بنیادیں مضبوط کرنے اور آزادی چاہنے والوں پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ظلم وستم کرتے ہیں لیکن کیا خدا کا بھی کوئی رقیب ہے یا اسے بھی اپنی قوت کا سکہ جمانے کی ضرورت ہے؟

۳۔ ضرورت اور کمی

کبھی ظلم کا سبب ضرورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ مادی یا نفسانی ضرورتیں کسی شخص کو مجبور کر دیں کہ وہ برے کام میں ہاتھ ڈالے اور دوسروں پر ظلم کرے۔

۴۔ ممکن ہے کہ بعض ستمکاریاں لوگوں کی باطنی کمینگی کی وجہ سے ہوں۔

بعض افراد اذیت کوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو ایذا پہنچانے میں یا دوسروں کے ایذا اٹھانے سے مزہ لیتے ہیں۔

اب جو آپ ظلم کے اسباب سے واقف ہو گئے ہیں تو بتائیے کہ آپ خدا میں کون سا سبب پاتے ہیں جس سے اس میں ظلم کی تحریک ہو؟ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

خدا موجودات عالم میں سے کسی پر ظلم کا ارادہ تک نہیں کرتا۔

(سورہ آل عمران۔ آیت ۱۰۸)

جو خدا ہمیں عدالت کا حکم دیتا ہے[1] کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود ظلم کرے؟ کیسے ممکن ہے کہ خدا انسان کو جو کمزور ہے اور جو سرکش جبلتوں کے طوفان میں زندگی بسر کرتا ہے یہ حکم دے کہ جو دشمنیاں اور تکلیفیں اسے قوم سے ملتی ہیں وہ اس کی بے عدالتی کا سبب نہ بنیں[2] لیکن وہ خود لا محدود قوت کا مالک ہونے اور کسی جبلت کے زیر اثر نہ ہونے کے باوجود ظلم کرے؟

خدا کی صفات سے ہماری واقفیت کا طریقہ

خدا کی صفات سے ہماری واقفیت کا طریقہ خود خدا سے ہماری واقفیت کے طریقے سے ملتا جلتا ہے مثلاً جس طرح آپ کسی تحریر سے اس کے لکھنے والے کا سراغ پا لیتے ہیں، اسی طرح اسلوب تحریر سے بھی لکھنے والے

---

[1] سورۂ نحل۔ آیت ۹۰ [2] سورۂ مائدہ۔ آیت ۸

کی معلومات کا پتا پا لیتے ہیں۔ اس کے الفاظ سے سمجھ جاتے ہیں کہ اسے الفاظ کے استعمال سے کتنی واقفیت ہے۔ اس کی انشا سے اس کے لکھنے کی قابلیت اور مقصدِ تحریر جان جاتے ہیں اور اس کی باتوں سے اس کی ذہنیت سے باخبر ہو جاتے ہیں غرض ہر پیدا ہونے والا دو کام کر سکتا ہے:

۱۔ اپنے خالق کی پہچان کرائے۔

۲۔ اپنے خالق کی صفات، حالات اور اس کے مقصدِ تخلیق کو واضح کرے۔[1]

ہم عدل کو اصول دین میں کیوں شمار کرتے ہیں

جب خدا بہت سی صفات مثلاً حکمت، قدرت، خالقیت اور علم وغیرہ رکھتا ہے تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ عدالت دین کا ایک اصول ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اول توحید دوم حیات یا اول توحید دوم علم بلکہ ان سب کے بجائے یہ کہا جاتا ہے کہ اول توحید دوسرے عدل؟

جواب: چونکہ مسلمانوں کا چھوٹا سا گروہ (فرقۂ اشعری) خدا کے عادل

---

[1] بیشک خدا کی تمام صفات قدرت اور علم جیسی نہیں ہیں۔ خدا کی صفات دو طرح کی ہیں:

ا۔ وہ صفات جو اس سے الگ نہیں ہو سکتیں جیسے علم، قدرت اور حیات۔

ب۔ وہ صفات جو اس سے الگ ہو سکتی ہیں جیسے خالق ہونا کیونکہ یہ تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہو اور خلق نہ کرے لیکن یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ خدا تو ہو لیکن وہ علم اور قدرت نہ رکھتا ہو۔

ہونے کو ضروری نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ خدا نے جو کام چاہا وہی ٹھیک ہے چاہے ہماری عقل کی رو سے وہ کام خراب، غلط اور ظلم ہی ہو مثلاً اشاعرہ کہتے ہیں کہ اگر خدا امیر المومنین امام علی علیہ السلام کو دوزخ میں اور ان کے قاتل ابن ملجم (مردود) کو بہشت میں بھیج دے تو اس کے لیے کوئی امر مانع نہیں ہے لیکن ہم یہ منطق نہیں مانتے اور خدا کی عدالت کو اپنے اصول دین کا ایک جزو سمجھتے ہیں اور قرآنی اور عقلی دلائل کے مطابق کہتے ہیں کہ خدا کے تمام کام عدل اور حکمت کے حامل ہوتے ہیں اور اس سے کوئی ظلم اور برا کام سرزد نہیں ہوتا۔[1]

اس کے علاوہ خدا کو عادل ماننے کا عقیدہ انسان کی تعمیرِ ذات پر مختلف پہلوؤں سے گہرا اثر ڈالتا ہے۔

۱۔ گناہوں کے مقابلے میں اپنے آپ پر کنٹرول رکھنے کے لحاظ سے کیونکہ جب انسان یہ سمجھ لے کہ اس کی گفتار اور کردار خدا کی نظر میں ہے، اس کے اعمال کا سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی جزو نظر انداز نہیں ہوتا اور وہ اپنی ہر اچھائی برائی کا بدلہ پائے گا تو وہ اپنے آپ کو اس دنیا میں آزاد اور غیر پابند نہیں سمجھے گا (اس کے بارے میں قرآن میں بہت سی آیتیں موجود ہیں)۔

---

[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا ہر کام کو انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے لیکن وہ حکمت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا مثلاً ہم اپنی آنکھ پھوڑ لینے پر قادر ہیں لیکن نہیں پھوڑتے کیونکہ یہ دانائی کا کام نہیں ہے۔ چنانچہ خدا بھی ہر طرح کا کام کرنے کی قدرت تو رکھتا ہے مگر اس قدرت کو کام میں لانے کی شرط یہ ہے کہ اس کا ہر عمل عدل، حکمت (جاری ہے)

۲۔خوش بینی

جوانسان دنیاوی نظام میں عدل الٰہی کاعقیدہ رکھتاہے وہ خوش بین ہوتاہے اورجب وہ خدا کوعادل سمجھتاہے توناخوشگوارباتوں کی ایک درست اورتسلی بخش توجیہ بھی رکھتاہے۔ناگوارواقعات اس کے لیے گوارا ہوجاتے ہیں۔ایساشخص کسی حال میں بھی افسردہ اورمایوس نہیں ہوتا۔

۳۔انفرادی اوراجتماعی زندگی میں عدل

عدل الٰہی کاعقیدہ انفرادی اوراجتماعی زندگی کوبھی عدالت کے اصول پرقائم کرنے کامحرک ہوتاہے۔جوشخص عدل الٰہی کاعقیدہ رکھتاہے وہ اپنی ذاتی اورسماجی زندگی میں عدل کوقبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتاہے۔

اوراس کاہرکام پہلے سے کیے ہوئے وعدوں کے مطابق ہو۔جب خدانے مومنوں کو بہشت میں اورفاسقوں کودوزخ میں بھیجنے کاوعدہ کررکھاہے اب اگروہ اس کے خلاف عمل کرتاہے تواس طرح گویاوعدہ خلافی ہوتی ہے اوریہ ایک براکام ہے جبکہ خدااپنی قدرت سے کوئی براکام کرتاہی نہیں۔ہم جوکہتے ہیں کہ خداظلم نہیں کرسکتا توہم نے اس کی قدرت گھٹائی نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت جتائی ہے جوقدرت سے مناسب موقع پرکام لیتی ہے۔

عدل کے معنی

بنیادی مسئلہ

عدل کی اس بحث میں بنیادی مسئلہ اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دینا ہے۔ ہم ان اعتراضات کے جواب میں آیات اور روایات کی روشنی میں مختصر طور پر کچھ نکات پیش کرتے ہیں۔

پہلا نکتہ

خدا عادل ہے یعنی وہ کسی مخلوق کا حق پامال نہیں کرتا اور دنیا کے حکیمانہ نظام کے مطابق ہر مخلوق پر مہربانی کرتا ہے اور کسی کے حقوق کا پامال کرنا ظلم ہے۔ چنانچہ عدل اور ظلم کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کسی حق کا سوال اٹھتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ کیا خدا سے واقعی کسی کا کوئی مطالبہ ہے اور کیا مخلوقات کا پہلے سے کوئی حق موجود رہا ہے جس کے پامال ہونے سے ظلم کی صورت پیدا ہو جائے؟ کیا ہم پہلے موجود تھے یا ہمارے پاس کچھ تھا جو چھین لیا گیا یا پامال ہو گیا ہو۔ بے شک دنیا کے موجودات میں تفاوت ہے۔ ایک جمادات ہے، ایک نباتات ہے، ایک حیوان ہے اور ایک انسان ہے، لیکن کسی موجود کا نہ پہلے کوئی وجود تھا نہ حق جسے دبا لیا گیا ہو۔ مثلاً اگر ہم ایک بڑے قالین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قالین جو پہلے بڑا

تھا اب ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے اپنا بڑا پن کھو بیٹھا ہے لیکن وہ قالین جسے ہم نے اول ہی سے چھوٹا بنایا ہو تو وہ یہ فریاد اور اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ چھوٹا کیوں ہوں کیونکہ وہ پہلے کچھ بھی نہیں تھا اور جب بنا تو چھوٹا ہی بنا۔ وہ ابتدا میں بڑائی رکھتا ہی نہیں تھا جو کسی نے اس سے چھین لی ہو اور اس پر ظلم ہو گیا ہو۔

خدا نے تمام موجودات کو حکیمانہ فرق کے ساتھ پیدا کیا جبکہ کسی موجود کا پہلے سے نہ کوئی مطالبہ تھا نہ حق تھا۔ اس نے ہستی کا ایک نظام (سبب اور مسبب کا نظام) قائم کیا اور ہر موجود کے لیے ایک مناسب راہ مقرر کی۔ وہ کسی موجود سے جو توقع اور امید رکھتا ہے یا اسے جو فریضہ سونپتا اور حکم دیتا ہے نیز اس کے لیے جو اجر اور پاداش مقرر کر چکا ہے اس سے متعلق وہ دو نسلوں، دو قوموں یا دو افراد میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ اس نے حکم میں مخلوق کی سکت کا لحاظ اور سزا میں تناسب رکھا ہے اور اس طریق کار میں کوئی ظلم نہیں ہے۔ آپ ایک کارخانے کو لے لیجیے جو چھوٹے چھوٹے پرزے بھی بناتا ہے اور بڑی بڑی موٹروں کے ٹائر بھی۔ کیا آپ کارخانہ دار کو پرزے اور ٹائر کے درمیان فرق کی وجہ سے ظالم کہیں گے؟ کیا خود پرزے کو اعتراض کا حق حاصل ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے کیونکہ اس مشینی نظام میں ہمیں پرزے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بڑے ٹائر کی بھی لیکن ایک وقت ایسا بھی تھا کہ ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں تھا اور کارخانہ دار نے اپنی مصلحت کے مطابق ان دونوں کو دو مختلف کاموں کے لیے بنایا۔ یہاں ظلم کی صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ٹائر کا بوجھ پرزے

پر ڈال دیں۔ اب اگر ان میں سے ہر ایک کو کسی ایک کام کے لیے بنایا گیا تھا اور اس کی استعداد سے زیادہ ہم نے اس پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا اور ان میں سے کسی کا بھی نہ پہلے کوئی وجود تھا اور نہ کارخانہ دار سے وہ کوئی مطالبہ یا حق رکھتے تھے اور کارخانہ دار بھی ان کی استعداد اور گنجائش سے زیادہ ان سے امید نہیں رکھتا تو اس صورت میں ظلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس مرحلے پر جبکہ عدل اور ظلم کے معنی واضح ہو گئے ہیں تو ایک نکتے پر غور کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر وقت عدل کے معنی مساوات اور برابری کے نہیں ہیں۔ اگر ایک استاد اپنے تمام شاگردوں کو ان کی محنت اور قابلیت کا خیال کیے بغیر مساوی نمبر دیتا ہے تو وہ بہت بڑا ظلم کرتا ہے۔ ایک طبیب اگر بیماروں کے مختلف حالات کا لحاظ کیے بغیر ان سب کو ایک جیسی دوا دیتا ہے تو وہ ظلم کرتا ہے۔ ان دونوں مثالوں میں استاد اور طبیب کی عدالت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ متفاوت نمبر اور مختلف دوائیں دیں۔ یہ اختلافات امتیازی نہیں فطری ہیں۔ ان میں تاکید، سفارش اور اقربا نوازی کا دخل نہیں ہے بلکہ یہ اختلافات عقلِ سلیم کے عین مطابق ہیں۔ اس لحاظ سے کسی قسم کی عدم مساوات اور فرق جب تک کہ وہ کسی حکمت اور مصلحت کے تحت ہو ظلم نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ

عدلِ الٰہی پر بہت سے اعتراضات محض عاجلانہ اور سرسری فیصلوں کے ہوتے ہیں۔ ہمارا فیصلہ سرسری اور عاجلانہ ہے۔ چند مثالوں پر غور کیجیے:

فرض کیجیے کہ اسلامی حکومت کسی علاقے کی ضرورت اور عوامی فائدے کے لیے ۴۵ میٹر لمبی ایک سڑک تعمیر کرنے کا حکم دیتی ہے۔ ہر سڑک گاڑیوں کی آمد و رفت، لوگوں کے آنے جانے اور ضروریات زندگی کی بہم رسانی کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے لیکن ہر سڑک کی تعمیر سے ایک گروہ پریشان ہو جاتا ہے۔ جب تک مسمار شدہ مکان کا حکومت سے معاوضہ ملے اور نیا مکان تیار ہو، لوگوں کو تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں لیکن چند آدمیوں کی تکلیف کی وجہ سے قوم کی ضرورت اور عوام کے مفاد کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ اسلام میں فرد کی مالکیت اور حقوق کی جو اہمیت ہے اس کے باوجود معاشرے کے حقوق پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

مثلاً امیر المومنین امام علی علیہ السلام مالک اشتر سے فرماتے ہیں:

"جن لوگوں نے عوام کی ضرورت کی چیزیں ذخیرہ کر رکھی ہیں انہیں بلاؤ اور نصیحت اور نہی عن المنکر کے بعد بھی اگر وہ اپنا یہ عمل جاری رکھیں تو ان سے سختی سے پیش آؤ۔"[1]

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"ذخیرہ اندوزی کا عمل اگرچہ فرد کو فائدہ پہنچاتا ہے لیکن سماج کے لیے ضرر رساں ہے۔"[2]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

---

[1] ذخیرہ اندوز سے سختی سے پیش آؤ۔ (نہج البلاغہ)

[2] ذخیرہ اندوزی کا عمل ملت کو نقصان پہنچانے والا طریقہ ہے۔ (نہج البلاغہ)

"حکومت میں تمہاری توجہ عوام کی آسائش اور خوشنودی پر ہونا چاہیئے چاہے اس سے خواص کی ناراضگی ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔"

ایک قصّہ

ایک شخص نے اپنے گھر میں ایک کتّا پال رکھا تھا۔ وہ کوئی چیز خریدنے بازار گیا اور اپنے کمسن بچے کو گھر میں اس خیال سے چھوڑ گیا کہ ابھی واپس آجاتا ہوں۔ جب وہ پلٹا تو کتا خون بھرے منہ سے اسکی پیشوائی کو دروازے پر آیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ کتے نے حملہ کر کے بچے کو چیر پھاڑ ڈالا ہے۔ چنانچہ غصے میں آکر اس نے اپنی بندوق تانی اور کتے پر داغ دی اور جلدی سے دوڑ کر گھر میں گیا لیکن وہاں اس نے دوسری ہی حالت دیکھی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک بھیڑیا جو شہر کے باہر رہتا تھا' آجاتا ہے اور چونکہ دروازے کھلے تھے وہ کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور بچے پر جھپٹتا ہے۔ کتّا بچے کو بچانے کے لیے بڑی ہمت سے بھیڑیے کو اپنے پنجوں اور دانتوں سے پیچھے سے کھدیڑتا اور زخمی کر کے چیر ڈالتا ہے لیکن گھر والا اپنے عاجلانہ فیصلے کی وجہ سے احسان مند ہونے کی بجائے کتے کو مار ڈالتا ہے۔

گھر والا اپنے کیے پر پچھتایا اور کتے کے پاس آیا کہ شاید اسے مرنے سے بچا سکے لیکن اس کا کام تمام ہو چکا تھا اور اب پچھتاوے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے کتے کی آنکھوں پر نگاہ کی۔ اس کی ان کھلی ہوئی آنکھوں کی یہ فریاد میں نے گوش دل سے سنی کہ اے انسان! تو کتنی جلدی کرتا ہے۔ کتنی جلدی فیصلہ کر لیتا ہے۔ تو نے گھر کے اندر جا کر

معلومات کیوں نہیں حاصل کیں۔ مجھے کیوں مار ڈالا۔ اس شخص نے اس افسوسناک واقعے کے بعد ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "اے انسان! تو کتنی جلدی فیصلہ کر لیتا ہے!"

کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جنھوں نے دعائیں مانگی ہوں گی اور وہ قبول نہیں ہوئی ہوں گی اور بعد میں انھیں خیال آیا ہوگا کہ اچھا ہوا جو قبول نہیں ہوئیں۔

سرسری اور عاجلانہ فیصلوں پر قرآن کی نکتہ چینی

انھیں سرسری اور عاجلانہ فیصلوں کی وجہ سے قرآن برابر انسان کو خبردار کرتا رہتا ہے کہ تمھارے بہت سے خیالات اور اندیشے بے بنیاد ہوتے ہیں۔ کتنے ہی کام تمھاری نظر میں برے ہوتے ہیں اور تم ان سے نفرت کرتے ہو لیکن حقیقت میں وہ تمھارے فائدے میں ہوتے ہیں اور کتنی ہی باتیں ہیں جنھیں تم اچھا سمجھتے ہو لیکن وہ تمھارے حق میں بری ہوتی ہیں مثلاً جہاد کے متعلق ارشاد ہے:

تم اسے پہلی اور سرسری نظر میں برا جانتے ہو لیکن حقیقت میں وہ تمھارے لیے اچھا ہے[1]

---

[1] تم پر جہاد واجب کر دیا گیا ہے حالانکہ یہ حکم تمھارے لیے ناگوار، سخت اور بیزاری کا سبب ہے لیکن جان لو کہ بہت سی چیزیں جو تمھیں ناگوار ہیں، حقیقت میں وہ تمھارے فائدے کے لیے ہیں اور اس کے برعکس بھی صحیح ہے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۲۱۶)۔

جنگ اور جہاد قابلیتوں کی تکمیل کرتے ہیں اور لیاقتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ جنگ اور لڑائی میں جو لوگ صرف بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اور جو لوگ میدانِ عمل میں اترتے ہیں وہ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ جنگ ہم مقصد قوتوں کو متحد کر دیتی ہے اور انسان کو عزت و وقار بخشتی ہے اور بنیادی طور پہ مظلوم قوموں کی زندگی کا مقصد لڑنا ہے۔

ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ:

تم بہت سی چیزوں کو ناپسند کرتے ہو لیکن خدا نے ان میں بہت کچھ بھلائی رکھی ہے۔ (سورہ نساء۔ آیت ۱۹)

اگر ہم قرآن سے لفظ حُسبان اور اس کے مشتقات جمع کریں تو ہمیں پتا لگے گا کہ قرآن ہمیں برابر خبردار کرتا ہے کہ ایسا خیال نہ کرو، ایسا نہ سوچو، اس طرح گمان نہ کرو اور اسی طرح کی باتیں بتاتا ہے جو سرسری اور عاجلانہ خیالات کی تردید کرنے والی ہیں۔

عاجلانہ فیصلے کی دوسری مثال

ہم قرآن میں یہ پڑھتے ہیں کہ فرشتوں نے (اس وجہ سے کہ انسان کے متعلق گہری واقفیت نہیں رکھتے تھے) خدا سے عرض کی کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تو ہماری عبادت کے باوجود تو انسان کو کیوں پیدا کر رہا ہے؟ لیکن خدا چاہتا تھا کہ زمین پر اپنا ایک لائق جانشین مقرر کرے اس لیے اس نے انسان کو علوم عطا کر کے ایک ہلا دینے والا منظر پیش کر دیا اور فرشتوں پہ ثابت کر دیا کہ انسان کے بارے میں ان کا فیصلہ سرسری اور عاجلانہ ہے۔

مختصر یہ کہ اگر ہم خدا کے عدل کی بحث میں اس شک میں پڑ گئے کہ اگر خدا عادل ہے تو پھر ایسا کیوں ہے اور ویسا کیوں ہے؟ تو ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارے فیصلے اور شناختیں سو میں سے محض چند صحیح ہوتی ہیں اور بہت سے مسائل اور ان کے اسباب ہم سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں کیونکہ ہمارا علم، سوچ اور تجربہ محدود ہے۔ سالہا سال گزر گئے اور ہم جنگلوں کا وجود بیکار ہی سمجھا کیے لیکن وقت گزرنے پر معلوم ہوا کہ انہیں جنگلوں سے دسیوں ایسی چیزیں حاصل ہوتی ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ کیا برسوں تک لوگ یہ نہیں کہتے رہے کہ غدود بے فائدہ چیز ہے لیکن اب کہنے لگے ہیں کہ غدود خون میں ایسے مفید جسیمے بناتے ہیں جو مائکروبوں کے جراثیم کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لوگ سالہا سال تک زائد آنت کو بیکار چیز سمجھتے رہے لیکن آج کہتے ہیں کہ یہی اپینڈکس سرطان سے بچاؤ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اگر ہم کسی ایسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں بلند اور بیش قیمت مضامین ہیں لیکن کچھ سطروں کے بعد ایک لفظ ایسا آجاتا ہے جس کے معنی ہمیں معلوم نہیں ہوتے تو ہمیں جلدی سے فیصلہ نہیں کر لینا چاہیے اور مصنف کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے بلکہ اپنے سمجھے ہوئے مطلب پر نظر ثانی کر لینا چاہیے۔ اب جو ہم نے عدل کے معنی جان لیے ہیں اور ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ عقیدۂ عدل پر ہمارے بہت سے اعتراضوں کی وجہ ہمارے سرسری اور عاجلانہ فیصلے ہیں تو اب ہم تیسرے نکتے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انسان کی تکلیفوں کے اسباب پر غور کرتے ہیں۔

تیسرا نکتہ

ہم اپنی مصیبتوں کو جنم دینے میں خود اپنے کردار سے غافل ہیں اور بلاوجہ ان سب کو خدا کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں اور پھر یہ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ اے خدا! اگر تو عادل ہے تو پھر مجھے یہ پریشانی اور تکلیف کیوں پیش آئی؟ ظاہر ہے کہ بہت سی مصیبتیں تو خود ہماری ہی پیدا کی ہوئی ہیں مثلاً ہم جو حفظانِ صحت کا خیال نہیں رکھتے تو بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں نہی عن المنکر کی تمام صورتوں سے فساد کو نہیں روکتے تو شریر لوگ ہم پر چھا جاتے ہیں اور پھر ہماری دعا اور فریاد بھی بے نتیجہ رہ جاتی ہے۔ اس موضوع پر بھی ہم پہلے کی طرح قرآن کی رہنمائی سے مدد لیتے ہیں اور اس سلسلے میں چند آیتیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ جو سختی اور مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ ان کاموں کی وجہ سے ہے جو تم نے خود اپنے ہاتھوں سے کیے ہیں۔ تم خود ہی مصیبتوں کی پیدائش کا سبب ہو۔ (سورۂ شوریٰ۔ آیت ۳۰)

۲۔ اگر لوگوں کو اپنے غلط چلن اور اعمال کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ ہماری رحمت سے ناامید ہو جاتے ہیں۔

(سورۂ روم۔ آیت ۳۶)

اس آیت میں بھی ہمارے اپنے ہی چلن کو ہماری تکلیفوں اور مشکلوں کا سبب بتایا گیا ہے۔

۳۔ جب خدا نے انسان کو آزمائش کی کٹھالی میں ڈالا اور اس کے لیے کوئی تنگی پیدا کی تو اس کی فریاد بلند ہو جاتی ہے کہ خدا نے مجھ پہ

اپنی مہربانی کم کردی ہے۔ (سورۂ فجر- آیت ۱۶)

حالانکہ ان تنگیوں کا سبب اور ثبوت اپنے اندر تلاش کرنا چاہیے۔ پھر آیت کے اگلے حصے میں ہم یوں پڑھتے ہیں: خدا وجہ کے بغیر کسی کا حصہ اور روزی منقطع نہیں کرتا۔ اگر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ آپ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے یتیم کا خیال نہیں رکھا اور معاشرے کے محروم افراد کی مدد کرنے اور انھیں کھانا کھلانے کے لیے لوگوں کو آمادہ نہیں کیا۔ آپ کی بے پروائی کا یہ انداز خدائی قہر و غضب کا سبب بن گیا۔ یہ آیت بھی خود ہمارے ہی اعمال کو خدا کی مہربانی میں کمی کا سبب بتاتی ہے۔

۴۔ اس آیت میں خدا ایک قریے کی خصوصیت بیان کرتا ہے جس میں نعمتیں بہت تھیں لیکن ان کثیر نعمتوں کے تناسب سے ہی اس کے باشندوں نے کفر کیا[1] (سورہ نحل آیت ۱۱۲) خدا نے بھی اس بستی کے لوگوں کو خوف اور بھوک میں مبتلا کر دیا۔ یہ آیت بھی صاف صاف بیان کرتی ہے کہ بہت سی مصیبتوں کا سبب خود ہمارا ہی ناشکرا پن ہے۔

عدلِ الٰہی سے متعلق سوالات کا مطالعہ

تیسرے نکتے کے سلسلے میں ہم نے جو یہ کہا ہے کہ بہت سی مصیبتیں خود ہمارے

---

[1] کفر کبھی خود خدا کے بارے میں ہوتا ہے اور کبھی حکم خدا سے متعلق ہوتا ہے اور کبھی خدا کی نعمتوں کے خلاف۔ اس تیسرے موقع کو عام طور پر کفران کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ لوگ خدا کی نعمتوں سے صحیح صحیح فائدہ نہیں اٹھاتے۔

ہی کرتوتوں کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ہم اپنی نامناسب حرکات سے خدائی قہر اور بعض مصیبتوں کو بلاتے ہیں اس صورت میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ ہم اپنی زندگی میں کچھ لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی قسم کے ظلم و ستم سے باز نہیں رہتے حالانکہ وہ بہت آسائش اور خوشحالی میں بھی ہیں۔ آپ یہ جو کہتے ہیں کہ مصیبتیں ہمارے ہی اعمال کی وجہ سے آتی ہیں تو پھر جن لوگوں کا چلن ہم سے زیادہ خراب اور جن کے کرتوت ہم سے بھی بدتر ہیں وہ پریشان اور تکلیفوں میں گرفتار کیوں نہیں ہوتے؟

آیات اور روایات کی رو سے جواب

خدا کے نزدیک سب لوگوں اور گروہوں کا حساب یکساں نہیں ہے:

۱۔ وہ کسی گروہ یا قوم کو فوراً سزا دیتا ہے۔

۲۔ کسی گروہ یا قوم کو ایک مدت تک مہلت دیتا ہے۔

۳۔ کسی گروہ کو اس کے آخری دور تک سزا نہیں دیتا اور وہ بہت کچھ ظلم کے باوجود آرام میں رہتا ہے۔ خدا اسے روزِ قیامت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے اس لیے کہ ہم اپنی جہاں بینی میں دنیا کو آخرت سے الگ نہیں سمجھتے۔

ممکن ہے ایک استاد بھی اپنی کلاس کے شاگردوں کے لیے کئی قسم کا دستور رکھتا ہو۔ وہ بعض کو قہر و غضب سے فوراً سزا دیدے مگر دوسروں کو ایک مدت تک مہلت دے اور بعض کے متعلق جو سب سے بدتر ہیں کسی قسم کا ردِعمل ہی ظاہر نہ کرے اور ان سب کو ان کے حسبِ حال نمبر دینے کے لیے

سال کے اخیر تک آزاد چھوڑ دے۔ یہی درجہ بندی خدا کی طرف سے دانائی پر مبنی ہے اس لیے کہ نہ تمام قصوروار برابر ہیں اور نہ ان کے اعمال کی نوعیت اور ذہنیت ہی یکساں ہے کہ سب کا حساب بھی برابر ہو۔ کبھی استاد کسی اچھے شاگرد کے غلط طرزِ عمل پر شدید خفگی کا اظہار کرتا ہے کیونکہ وہ اچھے شاگرد سے ایسے کام کی امید نہیں رکھتا جبکہ وہ نالائق شاگردوں پر اتنی سختی نہیں کرتا۔ ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ خدا ولیوں اور پیغمبروں کو کبھی کبھی ایک ایسے عمل کی وجہ سے (جو گناہ بھی نہیں ہوتا) سخت تنبیہہ کرتا ہے کیونکہ ان جیسی عظیم ہستیوں سے وہ اس عمل کی امید نہیں رکھتا لیکن ہم دوسرے عام لوگوں کے متعلق پڑھتے ہیں:

ہمارا بستی والوں کو ظلم کی سزا میں ہلاک کرنا مقررہ قاعدوں کے مطابق اور معینہ وقت پر عمل میں آتا ہے۔

(سورۂ کہف۔ آیت ۵۹)

ایسا نہیں ہے کہ جیسے ہی لوگوں نے کوئی گناہ کیا ہم فوراً انھیں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کردیں بلکہ ہماری طرف سے سزا اور ہلاکت میں مہلت، صبر اور وعدہ بھی مدِ نظر رہتا ہے۔

ہم جو لوگوں سے قوموں کی تباہی کی تاریخ بیان کرتے ہیں تو یہ کفار کہتے ہیں کہ ہم پر عذاب کیوں نازل نہیں ہوتا۔ ہم تو کفر اور ظلم کے باوجود مزے میں ہیں۔ یہ لوگ خدا کے قہر و غضب کے متعلق عجلت ظاہر کر رہے ہیں حالانکہ خدا اپنے وعدے پر عمل کرے گا لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔

(سورۂ حج۔ آیت ۴۷)

اس سبب سے خدا کبھی کبھی ظالموں کے خلاف فوری اقدام نہیں کرتا

اور کہتا ہے:

میں شروع میں کافروں کو مہلت دیتا ہوں اور پھر پکڑتا ہوں۔

(سورۂ رعد آیت ۳۲)

خدا کافروں کو مہلت دینے کی وجہ بھی بیان کرتا ہے:

جو لوگ کافر ہو گئے (اور بغاوت کی راہ پر چل پڑے) یہ نہ سوچیں کہ اگر ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تو یہ ان کے فائدے کے لیے ہے۔ ہم انھیں اس لیے مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے گناہوں میں اضافہ کریں اور ان کا جی بھر جائے۔ اس کے بعد خوار کرنے والا عذاب اور رسوائی انکی گھات میں ہے۔ (سورۂ آل عمران آیت ۱۷۸)

سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے قتل کے بعد یزید (ملعون) نے اپنے آپ کو کامیاب اور فتح مند جانا لیکن حضرت زینب علیہا السلام نے یہی آیت اس کے سامنے پڑھی کہ تیری اس وقت کی آزادی، فتح مندی، آسائش اور قوت اس وجہ سے ہے کہ تیرے گناہوں کا بوجھ زیادہ ہو جائے اور بنیادی طور پر یہی عارضی عیش تیرے لیے عذاب کا بہترین وسیلہ ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ ہم لوگوں کو زیادہ آسائش بہم پہنچاتے ہیں تاکہ وہ اس کے خوب عادی ہو جائیں پھر ہم انھیں یکایک پکڑ لیتے ہیں تاکہ حسرت میں جلتے رہیں:

چونکہ جس بات کی ہم نے انھیں نصیحت کی تھی جب وہ اسے بھول گئے تو ہم نے ان پر ہر طرح کی دنیاوی نعمتوں کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ جو نعمتیں انھیں دی گئی تھیں وہ ان کو پاکر خوش ہو گئے۔ تب ہم نے انھیں

ناگہاں سے ڈالا تو اس وقت وہ ناامید، حیران اور غمگین ہو کر رہ گئے۔ (سورۂ انعام - آیت ۴۴)۔ اس قسم کے لوگ اس شخص کے مانند ہیں کہ درخت پر جتنا چڑھتا ہے اپنے آپ کو اتنا ہی زیادہ کامیاب سمجھتا ہے لیکن اس کے گرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر جانا اس کے لیے عذاب کا آغاز تھا البتہ جیسا کہ خدا بعض لوگوں سے اس قسم کا معاملہ کرتا ہے مگر ایک دوسرے گروہ کے بارے میں جو اصلاح کی صلاحیت رکھتا ہے اور جس میں امید کی کرن باقی ہے کہتا ہے:

خدا ان کو ان کے بعض کرتوتوں کا مزا چکھا دیگا تاکہ یہ لوگ اب بھی باز آجائیں۔ (سورۂ روم - آیت ۴۱)

اس سوال کے جواب میں کہ کچھ لوگ حکمِ خدا کی مخالفت کے باوجود کس لیے آسائش میں ہیں اور کچھ لوگ خلاف کاری کے باعث کیوں سزا پاتے ہیں اتنی آیتیں کافی ہوں گی۔ اس مرحلے پر ہم موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو خبردار کرتی ہیں کہ اگر تم مسلسل گناہ کرتے رہے اور اپنی زندگی میں تم نے خدا کا قہر و غضب نہیں دیکھا تو ڈرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات اصلاح اور تنبیہ کی حد سے نکل جائے اور پھر مداوا صرف عاقبت کی خرابی اور دوزخ سے ہو۔ کبھی کبھی مریض کا حال اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں طبیب اسے چھوڑ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ کیسا پرہیز! اب یہ جو چاہے اسے کھانے دو اور پھر وہ مریض کے لیے کوئی ہدایت نہیں دیتا۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بہت زیادہ گناہ کر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ خدا کا رویہ اس شخص کی طرح ہے جو غصہ میں آ کر کہتا ہے:

اب تم جو چاہو کرو۔ (سورہ حٰم سجدہ - آیت ۴۰)

پیغمبر بھی جب لوگوں کی اثر پذیری سے مایوس ہو جاتے تھے تو کہتے تھے:

اے میری قوم! تم اپنی جگہ جو چاہو کرو۔ (سورہ ہود - آیت ۹۳)

ائمۂ اہلبیتؑ سے جو دعائیں مروی ہیں ان میں ہم جا بجا پڑھتے ہیں: "اے خدا! مجھے میرے حال پر نہ چھوڑ۔" مختصر یہ کہ کبھی خدا کا قہر اس آسائش اور خوشی کے وسیلے سے نازل ہوتا ہے جو ظالموں کو متنبہ ہونے سے روکتی ہے اور قیامت کی پاداش ان کی گھات میں ہوتی ہے۔

چوتھا نکتہ

کبھی انسان اس کے باوجود کہ کوئی گناہ اور تقصیر نہیں کرتا یکسر مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ عدلِ الٰہی کے متعلق ان مصیبتوں کا قرآنی تجزیہ کیا ہے؟

جواب

قرآن مجید میں خدائی امتحان کے مسئلے کا تقریباً بیس بار ذکر آیا ہے چنانچہ انسان کے بارے میں خدا کے یقینی رویوں اور طریقوں میں سے ایک انسان کے امتحان کا مسئلہ ہے اور ایسی مصیبتیں خود خدائی امتحان کا ذریعہ ہیں۔ اسی طرح خوشیاں بھی اس امتحان کا دوسرا وسیلہ ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

ہم تمہیں خوف اور بھوک سے اور مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے اور اے رسولؐ! صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیدو۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۱۵۵)

اس جگہ چند باتیں قابلِ غور ہیں :

۱۔ کیا خدا یہ نہیں جانتا کہ کون سا آدمی کس درجے کا ہے جو وہ مصیبتوں سے اس کا امتحان لیتا ہے؟

۲۔ امتحان کا ذریعہ کیا ہے؟

۳۔ ناخوشگوار حوادث کے مقابلے میں لوگوں کا ردِّ عمل۔

۴۔ مشکلات پر قابو پانے کا طریقہ۔

پہلا مسئلہ

ظاہر ہے کہ خدائی امتحان ہماری حالت، ذہنیت اور ردِّ عمل سے واقفیت اور علم حاصل کرنے کے لیے نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہمارے ہر خیال اور ہر عمل سے پہلے ہی جانتا ہے کہ ہم کس طرح سوچیں گے اور کس طرح عمل کریں گے تاہم اس امتحان کا مقصد یہ ہے کہ ہم سے کوئی عمل ظاہر ہو اور اس کے وسیلے سے ہمیں جزا اور سزا کا استحقاق مل جائے کیونکہ خدا کسی شخص کی اچھائی برائی کا اپنے علم کی بنا پر (جب تک کہ اس نے کوئی عمل انجام نہ دیا ہو) جزا یا سزا نہیں دیتا۔[1]

دوسرا مسئلہ

اس کے متعلق بھی ہم نے کہا تھا کہ تمام خوشگوار اور ناخوشگوار حوادث انسان

[1] ہم نے یہ نکتہ نہج البلاغہ میں امیر المومنین امام علی علیہ السلام سے پایا ہے تفسیر نمونہ جلد اوّل۔

کے امتحان کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

ہم تمھیں مصیبت اور راحت میں آزماتے ہیں۔ (سورۂ انبیاء آیت ۳۵)

یقیناً تمھارے مالوں اور جانوں سے تمھیں آزمایا جائے گا۔

(سورۂ آل عمران آیت ۱۸۶)

تیسرا مسئلہ

ہمارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ حوادث کا مقابلہ کرنے والے چار طبقوں میں بٹے ہوتے ہیں:

ایک طبقہ جب ناخوشگوار حادثات سے دوچار ہوتا ہے تو فریاد کرنے لگتا ہے۔ خدا کے عدل، اس کے لطف، حکمت اور کائنات میں اس کے نظام کو برا بھلا کہنے لگتا ہے۔ قرآن اس طبقے کا ذکر یوں کرتا ہے:

جب اسے تکلیف چھو بھی گئی تو گھبرا گیا۔ (سورۂ معارج آیت ۲۰)

یعنی جیسے ہی اس طبقے کے لوگوں کو مشکلوں اور سختیوں کا سامنا ہوتا ہے رونے پیٹنے لگتے ہیں۔

دوسرا طبقہ ایسے لوگوں کا ہے جو ثابت قدمی اور اولوالعزمی کے ساتھ سختیاں جھیلتے ہیں اور دل و جان سے کہتے ہیں:

ہم خدا کے لیے ہیں اور اسی کی طرف پلٹیں گے۔ (سورۂ بقرہ آیت ۱۵۶)

تیسرا طبقہ اس راہ میں دوسرے طبقے سے بھی آگے بڑھ گیا ہے کیونکہ یہ لوگ مصیبتوں پر نہ صرف صبر و تحمل ہی کرتے ہیں بلکہ خدا کا شکر بھی کرتے ہیں۔ زیارت عاشورا میں ہم پڑھتے ہیں:

"اے خدا! میں تیرا ایسا ہی شکر ادا کرتا ہوں جیسا امام حسین علیہ السلام کے اصحاب نے کیا تھا۔"

ہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی سب سے بڑی مراد خدا کی راہ میں سختی اور شہادت کو قبول کرنا ہے اور جب وہ اپنی مراد پا لیتے ہیں تو خدا کا شکر کرتے ہیں۔

چوتھا طبقہ جو تیسرے طبقے سے بھی زیادہ بلند مقام پر ہے ان لوگوں کا ہے جو مشکلات سے دوچار ہونے پر نہ صرف خدا کے عدل اور لطف کی برائی نہیں کرتے اور نہ صرف صبر یا شکر کرتے ہیں بلکہ نہایت اشتیاق سے مشکلات اور مصائب کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض صحابہ آپ کی خدمت میں پہنچے اور لڑائی میں شریک ہونے کے لیے امداد اور وسائل جہاد کے طلبگار ہوئے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی سامان حرب (تلوار اور گھوڑا) نہیں ہے جو میں تمہاری مدد کر سکوں۔ وہ لوگ روتے ہوتے چلے گئے کہ ہم خود کیوں لشکر میں پہنچ کر اسلام کے لیے جان نہ دے سکے۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۹۲)

ہاں حوادث کے مقابلے میں لوگوں کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔ آپ چرپری پیاز کسی بچے کو دیدیتے ہیں۔ جیسے ہی وہ اس پر دانت لگاتا ہے شور مچانے لگتا ہے، اسے دور پھینک دیتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں لیکن اس کا باپ یہی پیاز تلاش کرتا اور قیمت دیکر خریدتا ہے۔ زندگی کی سختیاں بھی اسی طرح کی ہوتی ہیں ایک ان سے بھاگتا ہے اور دوسرا ان کا خیر مقدم کرتا ہے۔

چوتھا مسئلہ

ہم نے کہا ہے کہ خدا عادل ہے۔ مشکلیں اور سختیاں کبھی کبھی ہماری آزمائش کے لیے بھی ہوتی ہیں تاکہ ہماری باطنی صلاحیتیں تکمیل پائیں۔ آئیے اب ہم ذرا یہ معلوم کریں کہ حوادث میں کامیاب ہونے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس بارے میں بھی پہلے کی طرح ہم قرآن کے سائے میں راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ قرآن جو راستے دکھاتا ہے وہ اس طرح کے ہیں:

۱۔ الہی جہاں بینی رکھنا: قرآن صابر لوگوں کی تعریف میں کہتا ہے:

یہ لوگ دنیا کو خدائی نظام کے ماتحت سمجھنے کی وجہ سے حوادث میں کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے لیے ہیں۔ ہمیں از خود کوئی استقلال حاصل نہیں ہے۔ ہم اس سے کوئی مطالبہ نہیں رکھتے۔ ہمارا دنیا میں آنا، ہمارا وجود اور یہ نعمتیں سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔ ہم صرف اس کے امانتدار ہیں اور دنیا ہماری دائمی جائے سکونت نہیں محض گزرگاہ ہے۔ موت آنے پر ہم اس کی طرف چلے جائیں گے لیکن بالکل فنا نہیں ہونگے۔ ہم اس وقت موجود ہیں۔ موت کے بعد بھی ہمارے وجود میں فرق نہیں آئے گا۔ ہماری رہنے کی جگہ بدل جائے گی لیکن ہم مٹیں گے نہیں۔ یہ نظریہ اور جہاں بینی انسان کو حوادث سے صحیح قسم کے مقابلے پر آمادہ کرتی ہے اور ان کا یہ نظریہ اور جہاں بینی "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۶) کے جملے سے ظاہر ہوتی ہے۔

۲- خدا کے طریقوں سے واقفیت

قرآن کہتا ہے کہ کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تکلیف، محنت اور جدوجہد کے بغیر بہشت میں پہنچ جاؤ بلکہ تمھیں بھی دوسری قوموں اور شخصیتوں کیطرح نہایت دشوار حوادث میں صبر کرنا چاہیے۔ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ بہشت میں پہنچ جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی تک تمھیں اگلے زمانے والوں کی سی حالت پیش نہیں آئی۔ انھیں طرح طرح کی تکلیفوں (فاقہ کشی، محتاجی) اور بیماریوں نے گھیر لیا اور زلزلے میں اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ آخر عاجز ہو کے پیغمبر اور وہ ایمان والے جو ان کیساتھ تھے کہنے لگے دیکھیے خدا کی مدد کب آتی ہے۔ ہاں گھبراؤ نہیں خدا کی مدد یقیناً بہت قریب ہے۔ (سورۂ بقرہ - آیت ۲۱۴)

یہ آیت بتاتی ہے کہ تاریخ کی طویل مدت میں اہل حق سخت ترین مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اب تمھاری باری ہے اس لیے نہ مصیبتیں نئی ہیں اور نہ صرف تمھیں وہ لوگ ہو جو ان سے دست و گریباں ہو۔ تاریخ کا یہی ایک کلیہ اور دستور ہے جو پورا ہونا چاہیے۔ قرآن بار بار پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہتا ہے کہ فلاں شخصیت یا گروہ کی تاریخ دیکھو تاکہ تم یہ خیال نہ کرو کہ مصیبتیں تمھارے لیے ہی ہیں۔[1] بے شک اگر انسان جان لے کہ سختیاں بھی

---

[1] سورۂ مریم آیت ۴۱ (اور اے رسول!) قرآن میں ابراہیم کا بھی تذکرہ کرو، اور سورۂ مریم۔ آیت ۵۱ (اور اے رسول!) قرآن میں موسیٰ کا بھی تذکرہ کرو۔ وغیرہ تمام آیتوں میں تاریخ کی اسی سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔ ہم سورۂ احقاف آیت ۳۵ میں پڑھتے ہیں: آپ بھی دوسرے اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کریں۔

ایک عمومی اور کلی قانون اور سنت ہیں تو اس ہیں ان کے تحمل کے لیے زیادہ آمادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ ماہ رمضان میں جبکہ سبھی روزہ رکھتے ہیں بڑی آسانی سے روزہ رکھ لیتے ہیں اس لیے کہ یہ ایک عام عمل ہوتا ہے لیکن ماہ رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں جب کوئی بھی روزہ نہیں رکھتا تو آپ کا اکیلے روزہ رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

قرآن جو روزے کا حکم دیتا ہے کہتا ہے کہ اے مسلمانو! یہ نہ سمجھنا کہ یہ دستور تمہیں سے مخصوص ہے بلکہ تمام پچھلی قومیں بھی روزہ رکھتی تھیں[۱]۔ بیشک پچھلی تاریخ کا علم انسان کے صبر اور بردباری میں بہت معاون ہے۔ اسی طرح مستقبل کے بھیدوں کا علم بھی صبر اور برداشت کو تقویت پہنچاتا ہے۔ حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا: جب آپ میرے کاموں کی حقیقت سے بے خبر ہیں تو پھر آپ کیونکر صبر کر سکتے ہیں؟[۲] (سورۂ کہف آیت ۶۸)

دوسری بات جو انسان کی قوت برداشت کو بڑھاتی ہے صابر لوگوں اور ان کے صبر کے طریقے سے واقفیت ہے۔ پچھلوں کی ثابت قدمی سے

---

[۱] تم سے پہلی امتوں پر بھی روزے فرض کیے گئے (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۸۳)۔ [۲] حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت اور ہمراہی کا واقعہ سورۂ کہف میں آیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میرے کچھ کام غیر معمولی ہوتے ہیں اور آپ ان کے اسباب سے ناواقف ہیں اس لیے برداشت نہیں کر پائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: انشاء اللہ میں صبر کروں گا لیکن تجربے نے ثابت کر دیا کہ اسباب سے ناواقفیت کی وجہ سے ان کے صبر کا پیمانہ بھر گیا اور آخر میں انھیں حضرت خضر علیہ السلام سے جدا ہونا پڑا۔

واقفیت، حوادث سے کامیاب مقابلے کا راز ہے۔ قرآن نے اس باب میں بہت سی باتیں کی ہیں اور بہت سے لوگوں اور قوموں کے صبر اور ثابت قدمی کے نمونے پیش کیے ہیں۔ خدا کے پیغمبر اپنے سخت ترین مخالفوں کے مقابلے میں کہتے ہیں:

ہم تمہارے ظلم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے۔

(سورۂ ابراہیم۔ آیت ۱۲)

جب ان جادوگروں نے جو فرعون کے بلانے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسوا کرنے کے لیے آئے تھے، ان کی حقانیت دیکھی تو ان پر ایمان لے آئے اور فرعون کی دھمکیوں کے باوجود کہنے لگے:

جو تجھے کرنا ہو کر گزر تو بس دنیوی زندگی پر حکومت کر سکتا ہے۔

(سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۷۲)

یعنی تو نے ہمارے لیے جو ارادہ اور فیصلہ کیا ہے اسے نافذ کر۔ ہم نے اپنا راستہ پا لیا ہے اور اب ہم راہ حق سے نہیں ہٹیں گے۔

۳۔ خدا کی طرف توجہ

خدا کی یاد اور یہ دھیان کر وہ میری بات سنتا ہے، میرا کام دیکھتا ہے اور میری مشکلات کو آسان کرتا ہے۔ خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہتا ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ اور اپنی بات کہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے عمل کو دیکھتا ہوں اور تمہاری گفتگو سنتا ہوں۔ (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۴۶)

خدا نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ ہمارے زیرِ نظر رہ کر کشتی بناؤ۔ (سورۂ ہود۔ آیت ۳۷) جیسے ہی حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنانا شروع کیا کفار کے وہ گروہ جو ادھر سے گزرتے تھے ان کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے۔ تم پیغمبر کیا ہوئے کہ بڑھئی ہو گئے! لیکن ان طعنوں کے مقابلے میں جو بات حضرت نوح علیہ السلام کی استقامت کا سبب بنی رہی وہ خدا کا وہی جملہ تھا کہ تم ہماری نظر کے سامنے ہو۔ ہم تمہارے کام کے نگراں ہیں۔ ایسا ایمان اور گہری نظر انسان میں ثابت قدمی اور استقامت کی روح پھونک دیتی ہے۔

۴۔ جزا و سزا کا نظریہ

چوتھی چیز جو انسان میں ثبات قدم پیدا کرتی ہے وہ جزا و سزا کا خیال ہے کیونکہ سختیوں کی برداشت انسان کو آخرت کا سب سے بڑا انعام مہیا کرتی ہے۔ ان اعزازات کی مثالیں پورے قرآن میں نظر آتی ہیں۔

۵۔ صبر اور نماز سے مدد لینا

پانچویں بات جو انسان میں ثابت قدمی پیدا کر سکتی ہے وہ نماز، دعا اور صبر سے مدد لینا ہے۔ قرآن کہتا ہے صبر اور نماز کا سہارا پکڑو۔[1]

---

[1] سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۵ اور ۱۵۳۔ نیز سورۂ اعراف میں ہے: خدا سے مدد مانگو (آیت ۱۲۸)

ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ مشکلات پیش آنے کے وقت امیر المومنین امام علی علیہ السلام نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ نماز نہایت چھوٹے کو بہت بڑے سے اور کمزور کو بے حد قوی سے قریب کر دیتی ہے اور دل کو طمانیت بخشتی ہے۔ قرآن میں ہے خدا کی یاد سے دلوں کو تسلی ہو کرتی ہے (سورۂ رعد۔ آیت ۲۸)

اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا عادل ہے اور جو سختیاں ہمیں پیش آتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہماری آزمائش کے لیے ہوتی ہیں اور ان مشکلات کا مقابلہ کرنے والے انسان چار طبقوں میں منقسم ہیں۔ جو طریقے ہم کو ان آزمائشوں میں کامیاب کرتے ہیں وہ بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔

پانچواں نکتہ

عدلِ الٰہی کے بارے میں اکثر شبہات ہماری کج فہمیوں اور غلط نتائج اخذ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم غور کیے بغیر اپنے اعتراضات کا رُخ خدا کی طرف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ہم خیال کرتے ہیں کہ موت انسان کی فنا ہے اور پھر اعتراض کرتے ہیں کہ اے خدا! فلاں کیوں مر گیا؟ ہم یہ تصور کر لیتے ہیں کہ دنیا ہمیشہ کے لیے رہنے کی جگہ ہے اور پھر کہتے ہیں کہ لوگ سیلاب، زلزلے یا فلاں بیماری سے کیوں مر گئے؟ ہم سوچتے ہیں کہ دنیا آرام کی جگہ ہے اور پھر کہتے ہیں کہ اس میں سختیاں کیوں ہیں؟

ہماری مثال ایسے شخص کی سی ہے جو کچہری ہال میں آتا ہے اور پھر اعتراض کرنے لگتا ہے کہ چائے کیا ہوئی؟ کھانا کیوں نہیں لاتے؟ بستر کیوں نہیں ہے؟ کیوں اور کیوں! یہ تمام سوالات اور اعتراضات صرف ایک خیال کی وجہ سے ہیں۔ ٹیڑھا خیال اور غلط سوچ۔ اس نے سوچا کہ یہ خیر مقدم کا ہال ہے۔ اب اگر ہم اسے ایسے خیال سے الگ کر لیں اور بتا دیں کہ یہ سبق پڑھانے کا ہال ہے، خیر مقدم کا نہیں ہے تو وہ اپنے تمام اعتراضات واپس لے لیگا اور معذرت کرے گا۔

ہمیں دنیا کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسی وہ ہے اور اپنی پیدائش کا مقصد جان لینا چاہیے۔ اس صورت میں ہمارے اعتراضات خود بخود دور ہو جائینگے۔ ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ دنیا ہمارے لیے ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ ایک گزرگاہ ہے۔ اگر ہم نے یہ یقین کر لیا تو تمام اعتراضات (مثلاً اگر خدا عادل ہے تو لوگ موت، زلزلے، بیماری اور سیلاب سے گروہ گروہ کر کے کیوں ختم ہوتے چلے جاتے ہیں) دُور ہو جائیں گے کیونکہ ہم یہاں رہنے کے لیے نہیں بلکہ یہاں سے جانے کے لیے آئے ہیں۔ اب ہم چاہے کسی دروازے سے جائیں سیلاب، زلزلے یا کسی اور طریقے سے۔

مثال

ایک گلاس بیچنے والے نے اپنی دکان پر گلاس اوندھے کر کے سجا رکھے تھے۔ اس نے ایک گاہک کو دیکھا جو گلاسوں کو پہلے تو گھورتا رہا پھر ان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اعتراض کرنے لگا کہ جناب اس گلاس کا منہ بند کیوں ہے؟ اس نے گلاس کو اسی حالت میں اٹھا لیا اور بولا: ارے! اس گلاس کا تو پیندا بھی نہیں ہے! دکاندار ہنسا، اس نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے سیدھا کر کے بولا سرکار! اس گلاس کا پیندا بھی ہے اور منہ بھی کھلا ہوا ہے۔

نظامِ تخلیق پر ہمارے بہت سے اعتراضات ہماری غلط بینی اور ناسمجھی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ سرخ رنگ کی عینک لگانے والے کو لامحالہ ہر شلجم چقندر ہی نظر آئے گا۔

مختصر بات یہ ہے کہ ہمارے سب کے سب اعتراضات انسان، اس کے نصب العین اور دنیا کی غلط تشریح سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا عیش و آرام کی جگہ ہے۔ بعد میں ہم کہتے ہیں کہ یہ ناکامیاں کیوں ہیں؟ حالانکہ دنیا ترقی کی جگہ ہے۔ یہ بیج بونے اور فصل اگانے کی جگہ ہے۔ قدرتی طور پر اگنے بڑھنے کا میدان، محنت، تکلیف اور پسینہ بہانے کی جگہ ہوتا ہے۔

اختلافات سے سماج بنتا ہے

اگر ہم چند باتیں تسلیم کر لیں تو سمجھ سکیں گے کہ ہمارے فطری اختلافات کا ہماری زندگی میں کتنا اہم حصہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انسانی زندگی اجتماعی ہے[1] یعنی ہم خودرو گھاس کی طرح نہیں ہیں کہ اپنے آپ ہرے ہو جائیں یا سوکھ جائیں اور دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہ رکھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اجتماعی زندگی باہمی تعاون کے بغیر جاری نہیں رہ سکتی اور ظاہر ہے کہ تعاون صرف "اختلافات" کی صورت میں ہی ہوتا ہے کیونکہ ایک شخص کسی ایک پیشے، ہنر اور شعبے میں پختہ اور دوسرے شعبوں میں کچا ہوتا ہے۔ قوتوں، سلیقوں اور حوصلوں کا فرق ضرورت کو جنم دیتا ہے اور ضرورت سماج کی تشکیل کا سبب بنتی ہے تاکہ ایک فرد اور گروہ دوسرے کی ضرورت پوری کرے۔ اس بنا پر "اختلافات"

---

[1] فلسفے میں انسان کے مدنی الطبع ہونے کے متعلق دو نظریے ہیں۔ پہلا یہ کہ جبر انسان کو سماجی زندگی کی ترغیب دیتا ہے اور دوسرا یہ کہ انسان بلا جبر فطری طور پر اجتماعی زندگی کی طرف رغبت رکھتا ہے اور انفرادی زندگی سے متنفر ہوتا ہے۔

ضروریات پیدا کرتے ہیں اور ضروریات سماج کی تشکیل کرتی ہیں اور انسانی ترقی سماج کے سائے میں ہوتی ہے۔

شخصی تعمیر میں مشکلات کا اثر

قرآن کہتا ہے کہ ناخوشگوار حادثات اور پریشانیوں کا پیش آنا انسان کو چونکا دینے والی گھنٹی ہے۔ یکساں زندگی انسان کو کاہل اور آرام طلب بنا دیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر راستا صاف، ہموار اور سیدھا ہوتا ہے تو گاڑی ہانکنے والا سو جاتا ہے۔ ہم اسلامی قصوں میں پڑھتے ہیں کہ خدا اپنے نیک بندوں کو سختیوں میں مبتلا کرتا ہے۔

سخت ترین مصائب انبیاؑ کو پیش آتے ہیں اور پھر انبیاؑ کے حامی اور وہ لوگ جو ان سے نظریاتی تعلق رکھتے ہیں زیادہ سختی میں مبتلا ہوتے ہیں۔[1] ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ خدا اپنے باایمان بندوں کی دشواریوں اور مصیبتوں کے ذریعے اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح ماں اپنے بچے کو دودھ پلا پلا کر پالتی ہے۔

دشواریاں نہ صرف اپنے پیش آنے کے وقت ہی انسان کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرتی ہیں بلکہ پچھلی تکلیفوں کا خیال اور ان کی یاد بھی سیرت کی تعمیر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہم قرآن میں پڑھتے ہیں:

> کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم نے تجھے یتیم پایا تو پناہ دی اور تجھے غیر معروف پایا تو رہبری کی اور تجھے محتاج دیکھا تو غنی کر دیا۔[2]

---

[1] بحار الانوار، علامہ مجلسی جلد ۸۱ صفحہ ۱۹۵ [2] سورۂ ضحیٰ۔ آیات ۶-۷-۸

اس لیے اب جو آپ کو قوت ملی ہے تو یتیم پر تسلط نہ جماتا، غصہ نہ کرنا اور فقیر سے رکھائی نہ برتنا۔ اس بنا پر خدا انسانوں کی فعالیت، تربیت اور ترقی کے لیے گزری ہوئی سختیوں کی یاد کو مفید سمجھتا ہے۔

قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ سختیاں خدا سے دعا مانگنے اور دل کا زنگ دُور کرنے کے لیے ہوتی ہیں: ہم نے تم سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی رسول بھیجے اور انہیں تنگدستی اور سختی میں گرفتار کیا تاکہ وہ گڑگڑا کر دعا مانگیں۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۴۲) ایسی ہی بات سورۂ اعراف کی آیت ۹۴ میں کہی گئی ہے کہ مصائب کا ایک نتیجہ اور فائدہ خدا کی یاد ہے۔ ہم حدیث میں پڑھتے ہیں: اگر مفلسی، بیماری اور موت نہ ہوتی تو کوئی طاقت انسان کا سر نہیں جھکا سکتی تھی (توحید صدوق۔ صفحہ ۴۰۲) اور وہ بدستور اپنی بغاوت پر نازاں رہتا۔ واقعی آرام و خوشی انسان کو بے عزم و ارادہ بنا دیتی ہے۔ امیرالمومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

> ان درختوں کی لکڑی زیادہ مضبوط ہوتی ہے جو خشک بیابانوں میں اگتے اور بڑھتے ہیں (نہج البلاغہ مکتوب ۴۵)۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام جو فرماتے ہیں کہ بلاؤں کی فطرت میں اچھائیاں ہوتی ہیں (بحار الانوار جلد ۷، صفحہ ۳۷۴) تو اس سے ان کی مراد بھی یہی ہوگی کہ بلائیں ایک طرف تو ہمارے اور خدا کے درمیان تعلق قائم کرتی ہیں اور دوسری طرف ہمارے خیال کو کام اور کوشش میں لگاتی ہیں۔ بلاؤں میں جسم پر دباؤ پڑتا ہے اس کی بدولت روح قوت پکڑتی ہے مثلاً ایک شخص کی مہمانی کے باعث میزبان کو تکلیف ہوتی ہے لیکن اس کی شخصیت پختگی

حاصل کرتی ہے کہ یہی اس کی سخاوت کی روح اور کمال ہے اور ہم جو کہتے ہیں کہ بلائیں کردار کی تعمیر اور شخصیت کی پختگی میں معاون ہوتی ہیں تو ہمارا مقصد یہی ہوتا ہے۔

ہم حدیث میں پڑھتے ہیں: سختیاں عام لوگوں کے لیے تنبیہ کا ذریعہ اور چونکا دینے والی گھنٹی، مومنوں کے لیے آزمائش اور ترقی کا ذریعہ اور اولیاء اور صلحاء کے لیے مرتبہ و منزلت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں (بحار الانوار جلد ۸۱ صفحہ ۱۰۸)

مثال

فوجی دفتر میں سپاہی کو کام پر مجبور کرنے کے تین اسباب ہوتے ہیں:

۱۔ کبھی سپاہی خلاف ضابطہ کام کرتا ہے تو اسے کوئی دشوار ڈیوٹی دے دیتے ہیں اس لیے کہ مصیبت ظالم کے لیے سزا ہے۔

۲۔ کبھی چاہتے ہیں کہ تربیت سے اس کی صلاحیت کو ترقی دیں کیونکہ مصیبت مومن کی آزمائش ہے۔

۳۔ کبھی چاہتے ہیں کہ اس کے درجے اور مرتبے کو بلند کریں یا اس کو کچھ دن کی چھٹی دیں تو اسے دشوار کام دے دیتے ہیں تاکہ اسے رخصت یا درجے اور رتبے کا استحقاق حاصل ہو جائے۔ اوپر کی حدیث یہی بات بیان کرتی ہے۔

اس بنا پر خدا کی دی ہوئی نعمتیں کسی کی عزت، شرافت اور خوبی کا ثبوت نہیں ہوتیں کبھی سب سے اچھے اور مقدس انسان سخت ترین تکلیف میں

گرفتار ہو جاتے ہیں تاکہ یہ اللہ والے ان سختیوں میں مناسب تاؤ پا کر کمالات حاصل کریں کیونکہ جب تک عود کی لکڑی جلائی نہ جائے اس کی خوشبو دماغ میں نہیں پہنچتی۔ یہ زیر و زبر ہونا تمام موجودات کے کمال حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ دھاتیں جب تک بھٹی میں نہ ڈالی جائیں صاف نہیں ہوتیں۔ مٹی جب تک ہل سے الٹ پلٹ نہیں ہوتی سرسبز ہونے کے قابل نہیں بنتی۔ گھاس جب تک بکری کے دانتوں میں پس نہیں جاتی گوشت نہیں بنتی۔ بکری کا گوشت جب تک آگ پر پکایا نہیں جاتا انسان کے کھانے کے قابل نہیں ہوتا اور آدمی کے خلیوں کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ چنانچہ انسان بھی اس دنیا میں جب تک سختیوں سے نبرد آزما نہیں ہوتا اور مصیبتوں سے پنجہ نہیں لڑاتا اس کی روح مناسب تاؤ نہیں پاتی اور کمال کو نہیں پہنچتی۔ ہماری انسانیت کھانے اور سونے ہی سے عبارت نہیں ہے کیونکہ ان کاموں میں تو حیوان بھی ہمارا شریک ہے۔ ہمارا انسان ہونا ہمارے صفات اور کمالات رکھنے کی وجہ سے ہے مثلاً خدا کی یاد، انسان دوستی اور ایثار و بخشش۔ ظاہر ہے کہ ان صفات کا تکملہ اور ظہور دشواریوں کے بغیر نہیں ہوتا۔

انسان کی اختراعات میں مشکلات اور دشواریوں کا حصہ

اگر آپ مشکلوں اور ضرورتوں کے دائرے میں نہیں آئیں گے تو آپ کی قوتِ اختراع بھی کم ہوگی۔ اگر بیماریاں نہ ہوتیں تو دواسازی کا علم بھی نہ ہوتا۔ اگر سردی گرمی نہ ہوتی تو سرد اور گرم رکھنے کے وسیلے بھی نہ بنائے جاتے۔ طب، سپہ گری اور صنعت کے شعبوں میں علم و ہنر کی تمام ترقی ضرورتوں کے تحت

اور سختیوں سے لڑنے میں ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لیے کسی دلیل اور وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

چھٹا نکتہ

انسان کو فیصلہ کرتے وقت صرف منفی پہلوؤں پر ہی توجہ نہیں رکھنا چاہیے۔ ایک عالم کا کہنا ہے کہ جب ایک کھٹا نیبو تمھارے ہاتھ آجائے تو اسے کھٹا اس کی وجہ سے دور مت پھینکو بلکہ اسی کھٹا س سے لیموں نیڈ تیار کر لو اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا۔ اس کے بعد کسی قافلے والوں کی ایک جماعت نے انھیں اس کنوئیں سے نکالا اور غلام بنا کر بیچ دیا۔ مصر میں ان پر نامناسب الزام لگایا گیا اور انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ ان تمام دشواریوں کے بعد وہ مصر کے بادشاہ بن گئے۔ ایک مدت بعد جب آپ اپنے والد ماجد کی ملاقات سے مشرف ہوئے تو انھوں نے پوچھا کہ تمہارے بھائیوں نے تم سے کیا سلوک کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: بھائیوں کے عمل کے بارے میں نہ پوچھیے بلکہ خدا کی مہربانی کے متعلق سوال کیجیے کہ اس نے ان پے در پے مشکلوں یعنی سازش، غلامی، تہمت اور قید خانے میں کس طرح میری حفاظت کی اور مجھے سب پر غلبہ عطا فرمایا۔

یہ بھی ایک طرز فکر ہے کہ انسان ہمیشہ کسی چیز کے منفی پہلوؤں ہی کی طرف توجہ نہیں دیتا بلکہ اس کے مثبت پہلوؤں پر بھی غور کرتا ہے۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے ہم نے جو حدیث نقل کی ہے اسے ہم نہیں بھولتے۔ آپ نے فرمایا: کوئی بلا ایسی نہیں ہے جس کی تہ میں خدا نے وہ خوبی نہ رکھی ہو جو اس بلا کو گھیرے ہیں لیے ہوئے ہے۔ (بحار الانوار۔ جلد ۷۸، صفحہ ۳۷۴)
خدا کے عدل پر بعض لوگوں کا اعتراض اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ مسائل کو صرف ایک ہی نظریے اور زاویے سے جانچتے ہیں۔ یہاں میں ایک عالم کی بیان کردہ مثال پیش کرتا ہوں:

سورج چمکتا ہے اور سمندر سے بخارات اٹھاتا ہے۔ بخارات سے بادل اور پھر بارش بنتی ہے۔ زمین کی کشش ان بارشوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ قطرے باہم مل کر زمین پر پانی کی ندیاں بنا دیتے ہیں، ان ندیوں سے دریا بن جاتے ہیں، انسان ان پر پشتے بناتا ہے، پانی کو قابو میں کر لیتا ہے پھر اس سے بجلی پیدا کرتا ہے اور زراعت کو ترقی دیتا ہے۔ اب اگر کسی نے کاہلی یا نادانی سے بجلی کا تار چھو لیا اور مر گیا یا کھیت جوتتے میں چیونٹی کا بل تباہ ہو گیا تو کیا آپ اس انسان اور اس چیونٹی کو اعتراض کا حق دینگے؟ کیا آپ اجازت دینگے کہ انسان اڈیسن کو برا کہے کہ اس نے بجلی کی قوت کیوں دریافت کی اور اسے مفید کیوں بنایا؟ کیا چیونٹی کو یہ حق ہے کہ وہ بددعا کرے کہ سورج اور سمندر کا برا ہو، بادل، بارش، انسان اور کھیتی کا ستیاناس ہو کہ ان سب نے میرا گھر ڈھا دیا؟ کیا اس قسم کے اعتراضات ایک طرح کی خود پسندی اور خود غرضی کی وجہ سے نہیں ہیں؟ کیا اس قسم کا اعتراض اس لیے نہیں ہے کہ ہم مسائل کو صرف ایک ہی زاویے سے دیکھتے ہیں اور فقط ایک ہی نہج پر سوچتے ہیں اور اس کا مرکزی نقطہ بھی فقط اپنے ذاتی فائدے کو قرار دیتے ہیں؟ گویا تمام کائنات کو چاہیے کہ وہ میرے ذاتی رجحان کے مطابق اور میرے ذاتی فائدے اور

وہ بھی میرے آج کے ذاتی فائدے کے لیے حرکت کرے کیونکہ کبھی کبھی مشکلات ہمارے کل کے لیے بہتر ہوتی ہیں لیکن ہم اس وقت تک راضی نہیں ہوتے جبتک ان سے آج ہی کے لیے فوری اور وقتی نتیجہ نہ نکلتا ہو۔

ایک اور تعبیر

ناخوشگوار واقعات کے سلسلے میں خدا کے عدل سے متعلق ایک دوسری تعبیر یہ ہے کہ ہم کو کائنات کے بارے میں دو نظریات میں سے ایک کو قبول کرلینا چاہیے: یا تو دنیا کے لیے ایک نپے تلے نظام کو مان لیں یا اسے بے ترتیب اور بے اندازہ قرار دیں۔ اگر کائنات میں ترتیب، حساب اور کلیے کام کر رہے ہیں تو پھر ناخوشگوار واقعات بھی ہوں گے ورنہ پھر اس میں کسی بدنظمی کا پتا لگانا چاہیے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ آپ کسی تلخ حادثے پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسے ایسے مکمل قواعد اور باریک کلیوں نے پیدا کیا ہے کہ انھیں مان لینا ان ناخوشگوار واقعات کو گوارا کرنے کے برابر ہوگا مثلاً ایک مکان اپنے مکینوں کے سر پہ گر پڑتا ہے۔ اب ہم اس حادثے پر غور و فکر کرنے اور اس بات کا اندازہ لگانے بیٹھتے ہیں کہ خرابی کی وجہ کیا ہے؟

۱۔ گلی کے بچوں کی گیند کھیلتے میں پڑوسی کی چھت پہ جا گری۔

۲۔ گیند لڑھک کر پرنالے کے سوراخ میں جا پھنسی اور بارش کے پانی کا نکاس بند ہوگیا۔

۳۔ بارش ہوئی تو پانی مٹی کی چھت پہ جمع ہوگیا اور مکینوں کو اس کی خبر نہیں ہوئی۔

۴۔ بارش کا پانی چھت میں جذب ہوا اور اس نے اینٹیں بھگو دیں۔
۵۔ مکین چھت کے نیچے سو رہے تھے کہ اینٹوں کی چھت جو بارش کے پانی سے بھاری ہو گئی تھی بیٹھ گئی اور اس کے نیچے کچھ لوگ دب کر مر گئے۔
ان حوادث کو حساب کے مطابق پیش آنا چاہیے کیونکہ خود گیند' اس کا ڈھلکنا' چھت کی ڈھلان' پرنالے کے سوراخ کی تنگی' پانی کا وزن' اینٹ کی قوت اور چھت کا دباؤ' چھت اور ان لوگوں کے سر کے درمیان کا خلاء جو اس کے نیچے سو رہے تھے اور بدن کی ہڈیوں کی بناوٹ ان میں سے ہر ایک حساب' ترتیب اور کلیہ رکھتا ہے۔
اب اگر آپ دنیا کو حساب پر قائم مانتے ہیں تو گھر والوں کے لیے ناخوشگوار واقعہ بھی آپ کو گوارا کر لینا چاہیے اور اگر آپ یہ چاہتے تھے کہ ناخوشگوار واقعات پیش نہ آئیں تو پھر چاہیے کہ بے نظمی ہو اور پہلے کا تمام حساب گڑبڑ ہو جائے مثلاً:
۱۔ گیند اتنی بھاری ہو کہ پڑوسی کی چھت پر نہ جائے۔
۲۔ یا بچوں کا بازو گیند پھینکنے میں کمزور ہو یعنی قدرتی حالت میں نہ ہو۔
۳۔ یا پڑوسی کے پرنالے کا سوراخ بڑا ہو تاکہ گیند اس کے پار بآسانی نکل جائے۔
۴۔ یا بارش کے اصول اور رفار مولے جنھوں نے موقع فراہم کر دیا کہ اس رات کو بارش ہو گئی' درہم برہم ہو جائیں اور پانی نہ برسے۔
۵۔ یا پانی اپنی قدرتی خاصیت چھوڑ دے اور اینٹ میں جذب نہ ہو۔
۶۔ یا اینٹیں اتنی سخت ہو جائیں کہ پانی کو جذب نہ کر سکیں۔
۷۔ یا زمین کی کشش ثقل اس رات کو رک جائے اور بھیگی ہوئی چھت کو اپنی طرف نہ کھینچے۔

۸- یا چھت کے نیچے سونے والوں کی ہڈی اور بدن فولاد کے بن جائیں کہ چھت کے گرنے کا ان پر اثر ہی نہ ہو یا ہلکی ہوئی اور بھاری چھت روئی جیسی کسی ہلکی چیز میں بدل جائے کہ گرے بھی تو چوٹ نہ آئے۔

دیکھیے اگر ہم ترتیب اور حساب کے قائل ہوں اور سبب اور مسبب کے دائرے میں چلیں تو ناخوشگوار واقعات فطری زندگی کے لیے ضروری ہیں اور ایک لازمی ناگواری کو مٹانا ایسے دسیوں قانونوں اور فارمولوں کو توڑنا ہے جنھیں خدا کے حکیمانہ ہاتھ نے دنیا میں جاری کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر یہ دنیا حساب رکھتی ہے تو بلائیں بھی رکھتی ہے اور اگر یہ طے ہو جائے کہ بلا نہ رہے تو پھر حساب بھی نہیں رہنا چاہیے لیکن یاد رہے کہ پھر بے نظمی اور انتشار خود سو بلاؤں کی ایک بلا ہو گا۔

ضروری توجہ

خدا کے عدل اور لوگوں کی صلاحیتوں کے تفاوت کی بحث کے سلسلے میں اس نکتے پر بھی دھیان دینا ضروری ہے کہ جو لوگ اپنے آپکو کم قابلیت کا مالک سمجھتے ہیں ممکن ہے کہ بہت سے دوسرے شعبوں میں سلیقہ اور صلاحیت رکھتے ہوں۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو لالچ، نفع یا دشمنی کی وجہ سے کسی پیشے یا ہنر کو اختیار کرتے ہیں لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوتے اور اپنے آپ کو ناکام اور ہارا ہوا پاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کائنات کو برا کہتے ہیں اور الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی ایسے آدمی کو نالائق سمجھتے ہیں اور ہر طرف اسے ذلیل کرتے

ہیں حالانکہ اکثر اوقات یہی شخص دوسرے شعبوں میں قابل فخر، ماہر اور کامیاب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ڈارون کا باپ معالج تھا اور چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی اس کا ہم پیشہ ہو لیکن ڈارون شعبۂ علاج میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے باپ کو دکھ ہوا اور اس نے اسے مذہبی علوم کے شعبے میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجبور کیا تاکہ وہ کلیسا کے لیے ایک اچھا پادری بن جائے لیکن وہ اس شعبے میں بھی ناکام ہو گیا چنانچہ ان دونوں شعبوں میں ناکام رہنے کے بعد ڈارون طبیعیات کے شعبے میں چلا گیا، اس علم میں وہ ایک نظریے کا موجد بنا اور بڑا کامیاب ثابت ہوا۔[1]

ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ اگر آپ کو ایک کام میں ناکامی ہو گئی تو فوراً اپنا کام اور پیشہ بدل دیجیے۔ کیا عجب کہ دوسرے شعبے میں آپ امتیاز اور کمال حاصل کر لیں۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ایک دلچسپ بات بیان فرماتے ہیں: ہر کمال کے پہلو میں نقص اور ہر نقص کے پہلو میں کمال ہوتا ہے۔ جو لوگ بلند قامت ہوتے ہیں وہ کوتاہ ہمت ہوتے ہیں۔ بعض کا چہرا بھدا لیکن کردار اچھا ہوتا ہے اور چرب زبان سنگدل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر کامیاب شخص نہ تمام شعبوں میں کامیاب ہوتا ہے اور نہ ہی کسی ایک شعبے میں ناکام آدمی اپنے تمام منصوبوں میں ناکامی کا منہ دیکھتا ہے (نہج البلاغہ فیض الاسلام، صفحہ ۱۲۱۷، ۲۲)۔

---

[1] ہر صاحب نظریہ اعتراضات کا ہونا ممکن ہے لیکن ان کی وجہ سے اسکی فطانت اور صفت اختراع سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو رقابت کی بنا پر کسی شعبے میں داخل ہوجاتے ہیں (حالانکہ وہ اس کام میں دلچسپی اور ذہنی مناسبت بھی نہیں رکھتے) اور ناکام ہوجاتے ہیں۔ پھر خدا کے عدل پر اعتراض کرتے ہیں کہ اے خدا! فلاں شخص کامیاب اور میں ناکام کیوں ہوگیا؟ اگر ایسا شخص دوسرے شعبے میں (جس سے اسکی صلاحیت اور ذوق ہم آہنگ ہوتا) داخل ہوتا تو ممکن تھا کہ کامیاب ہوجاتا اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ شخص ناکام ہوتا ہے جو ابھی اپنے منتخب کیے ہوئے شعبے کے لیے اپنے ذوق، صلاحیت اور ذہنی مناسبت کو نہیں پہچان پایا ہے اور جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ وہ کامیاب ہیں اگر ہم غور کریں تو ان کی کامیابی کے پہلو میں طرح طرح کی کمزوریاں، ناکامیاں اور خامیاں بھی نظر آجائیں گی۔

عدل الٰہی کے مسئلے پر بحث کے آخر میں کچھ دوسرے خیالات بھی ابھرتے ہیں؛

پہلا سوال

کیا ابلیس کا پیدا کرنا خدا کی حکمت اور عدل سے مناسبت رکھتا ہے؟ کیا انسان کی تخلیق سے خدا کا مقصد عبادت نہیں تھا۔ اس لحاظ سے ابلیس جیسی مخلوق کا پیدا کرنا اس مقصد کے برخلاف ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ انسان بڑی مشقت اٹھا کر ایک عمل کرتا ہے لیکن مختلف غلطیاں اور وسوسے اس عمل کو تین طریقوں سے اکارت کردیتے ہیں۔ یا تو یہ عمل دکھاوے کا ہونے کے باعث اپنی ابتدا ہی سے خدا کی بنائی ہوئی شکل اختیار نہیں کرپاتا یا درمیان میں غرور اس عمل کو ناکام بنا دیتا ہے یا انجام دہی کے بعد دوسرے گناہوں کی وجہ سے تمام اعمال رائیگاں اور برباد ہوجاتے ہیں۔ اس صورت میں کیا شیطان کی تخلیق خدا کے عدل اور حکمت سے میل کھاتی ہے؟

جواب

خدا نے ابلیس کو وجود اور قوتیں عطا کیں وہ سب کی سب اچھی تھیں اور وہ بھی برسوں تک عبادت میں مشغول رہا' اس کی بدی خدا کے حکم کی سرتابی تھی لیکن سرتابی کے گناہ سے بھی بدتر یہ بات تھی کہ اس نے توبہ اور استغفار بھی نہیں کی اور نہ ہی پچھتایا بلکہ بہت زیادہ گھمنڈ سے خدا کے حکم کو غلط سمجھا اور کہنے لگا کہ یہ حکم درست نہیں ہے کیونکہ میری پیدائش جو آگ سے ہے' آدم کی پیدائش پر جو مٹی سے ہے برتری رکھتی ہے اس لیے شیطان کی سرکشی اور غرور خدا سے نہیں' خود اسی سے متعلق ہے۔

پھر بھی انسان کے لیے اس کے وسوسے ایسے نہیں ہیں جو اسے گناہ پر مجبور کر ہی دیں۔ وسوسے کی استعداد ایک دعوت (بلاوے) کی حد تک ہے لیکن وسوسوں سے ہمارا ارادہ ختم نہیں ہو جاتا اور اصولی طور پر ان وسوسوں کا ایک مفید پہلو بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ہماری تربیت اور پختگی صرف دلی خواہشات اور شیطانی وسوسوں کی مخالفت میں مضمر ہے۔ اگر ایک شخص گونگا ہے اور اس نے غیبت نہیں کی تو یہ اس کی کوئی خوبی نہیں ہے۔ ہم خود ایسے لوگوں کو پہلوان کا لقب دے دیتے ہیں جو بھاری بوجھ اٹھا لیتے ہیں کیونکہ ان کا یہ عمل زمین کی کشش کے خلاف ہے۔ بیشک پہلوان ہونے کی پہچان کشش اور کھنچاؤ کی مخالفت ہے۔ پیغمبرؐ خدا نے فرمایا کہ اگر غصے نے تجھے برائی کی طرف کھینچا اور تو نے اپنے آپکو قابو میں رکھا تو تو (معنویت اور انسانیت کے میدان میں) پہلوانی کے مقام پر پہنچ گیا۔

ان سب باتوں سے قطع نظر فرض کیجیے کوئی شخص وسوسوں کے سامنے جھک

گیا ہے تو اسکے لیے توبہ و استغفار کی راہ آخری فیصلے تک کھلی ہوئی ہے اور وہ توبہ کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر صرف ہم ہوتے اور شیطانی وسوسے تو دشواری کا مقام ہوتا لیکن اس کے وسوسوں کے مقابلے میں انبیائے کرامؑ کی دعوت اور عقل کی رہنمائی بھی موجود ہے جو سیدھی راہ پر چلنے میں ہماری بہترین مدد کر سکتی ہے۔ یہ سب باتیں ایک طرف اور دوسری طرف شیطانی وسوسہ خود ہماری گمراہیوں کے پیچھے پیچھے ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہی ہمیں اپنے پیچھے کھینچتا ہے بلکہ ہم بھی اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اس لیے قرآن اس عیاش عالم کے قصے میں کہتا ہے:

> اور (اے رسولؐ) تم ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کی تھیں پھر وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان نے اس کا پیچھا پکڑا اور آخر کار وہ گمراہ ہو گیا۔
>
> (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۷۵)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ایسے لوگوں کے پاس پہنچتا ہے جو خود اپنے اعمال سے اس کے لیے آمادگی کا اعلان کرتے ہیں۔ اس آیت میں جو شخص مدِّ نظر ہے وہ بلعم باعور نامی ایک عالم تھا جو بنی اسرائیل میں سے تھا۔ خدا نے اسے چند علمی باتیں سکھا دی تھیں جن کی وجہ سے اس کی دعا قبول ہو جاتی تھی لیکن اس نے دربارِ فرعون سے تعلق پیدا کر لیا چنانچہ مال و منصب کے لالچ نے اسے خدا کی نشانیوں اور ان علوم سے جو اسے حاصل تھے جدا کر دیا اور پھر شیطان نے اس کا پیچھا پکڑا۔

ہم دوسری آیت میں پڑھتے ہیں:

اس کا بس چلتا ہے تو بس انھیں لوگوں پر جو اسے اپنا دوست بناتے ہیں۔

(سورۂ نحل۔ آیت ۱۰۰)

جب تک ہم ہیں اس کے ہمراہ چلنے کی خواہش نہیں ہوگی وہ ہماری رہبری کا ذمہ نہیں لے گا اس لیے قرآن کہتا ہے:

اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ایماندار ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں ان پر اس کا قابو نہیں چلتا۔

(سورۂ نحل۔ آیت ۹۹)

قابو نہ چلنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ لالچ بھی نہیں دیتا بلکہ مراد یہ ہے کہ شیطان کو پہچاننے والے یہ سچے مومن ہیں جو اس کے وسوسوں سے ٹکر لیتے ہیں اور اس سے پہلے کہ اس کے اثر اور غلبے میں آئیں چوکنّا ہو جاتے ہیں۔ قرآن شیطان کیساتھ مومنین کے تصادم کے طریقے کو اس طرح بیان کرتا ہے:

پرہیزگار لوگ وہ ہیں کہ جیسے ہی کوئی شیطانی گروہ ان سے چھو جاتا ہے وہ چوکنا ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں۔

(سورۂ اعراف۔ آیت ۲۰۱)

اس لیے شیطان سے مومن کا تعلق تصادم کا ہے لیکن شیطان سے فاسق کا تعلق وہ ہے جو کسی انسان کا اپنے پاس بیٹھنے والے سے ہوتا ہے:

اور جو شخص خدا کی یاد سے اندھا بنتا ہے ہم (گویا خود) اس کے واسطے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہی اسکا ساتھی ہے۔

(سورۂ زخرف۔ آیت ۳۶)

مختصر یہ کہ شیطان ایسی مخلوق ہے جو اپنی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکتا تھا لیکن اس نے غرور اور ضد کی وجہ سے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ اس کی تباہی کا تعلق اس کی ذات سے تھا۔ شیطانی وسوسے ہمیں بے بسی اور گمراہی پر مجبور نہیں کر سکتے۔ دھوکا کھانے والوں کے لیے توبہ کا راستا کھلا ہوا ہے اور شیطان کے اثر و رسوخ کی راہ ہموار کرنا بھی خود ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شیطان کا پیدا کرنا خدا کے عدل کے خلاف ہے۔

دوسرا سوال

ایک بات جو عدل الٰہی کی بحث میں بہت زیادہ پوچھی جاتی ہے وہ ناقص الخلقت افراد کا مسئلہ ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر خدا عادل ہے تو یہ ناقص الخلقت انسان جو پوری عمر تکلیف میں گزارتے ہیں اور لوگوں کی طرف سے توہین کا نشانہ بنتے ہیں کس لیے پیدا کیے گئے ہیں؟

جواب

اس سوال کا جواب پچھلی بحثوں سے مل سکتا ہے۔ ہم وہاں کہہ چکے ہیں کہ بہت سے ناخوشگوار واقعات کے وجود میں آنے کا سبب ہم خود ہیں۔ ناقص الخلقت افراد بھی ہماری اسی کاہلی کا ثبوت ہیں۔ یہ والدین ہیں جنھیں حفظان صحت کے اصولوں اور نفسیات کے مسائل کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ کاہلی برتنے سے ناقص بچہ پیدا ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے معصوم پیشواؤں کی

روایات میں ان مسائل کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ نشے، حیض یا فوڈ پوائزن کی حالت یا پریشانی میں ہم بستری نومولود پر برے اثرات ڈالتی ہے۔ امید ہے کہ بھائیوں اور بہنوں کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کے مرکز میں کلاسیں لگائی جائیں گی تاکہ وہاں اسلامی فرائض، ہر ایک کے حقوق، بچے کی تربیت، ہم بستری کے مسائل اور دوسرے اسلامی احکام اور طریقے پڑھائے جائیں۔

بچے کا گناہ کیا ہے؟

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچے کا گناہ کیا ہے؟

ہمارا جواب صرف ایک جملہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کا گناہ کیا ہے؟ یہاں نومولود بچہ بھی بے قصور اور خدائے پاک بھی بری ہے۔ قصور وار صرف والدین ہیں لیکن اس کی تکلیف بچے کے لیے ہے۔ یہ بات صرف نومولود سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام مظالم میں قصور ظالم کا ہوتا ہے اور تکلیف مظلوم کے سر پڑتی ہے۔

اگر میں نے ایک پتھر آپ کی طرف کھینچ مارا اور آپ کا ماتھا زخمی ہو گیا تو نہ آپ گنہگار ہوئے نہ خدا۔ گناہ تو میرا ہے کہ میں نے پتھر مارا لیکن اس گناہ کی ایذا آپ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ جب سوال کیا جاتا ہے کہ والدین نے غلطیاں کی ہیں تو بچے کا کیا گناہ ہے؟ اسی طرح کا سوال تمام ظلموں کے متعلق کیا جا سکتا ہے کہ ظالموں نے قصور کیا ہے تو مظلوموں کا کیا گناہ ہے؟

اگر آپ نمکین یا کڑوا خمیر نانبائی کے پاس لے گئے اور اس نے نمکین یا کڑوی روٹی دیدی تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ نانبائی ظالم ہے؟ اگر آپ نے

تربوز کا بیج بویا اور تربوز توڑا تو کیا کوئی اعتراض کی گنجائش رہ جاتی ہے ؟ اگر آپ جنوب کی راہ پر چلے تو کیا آپ کو یہ توقع رکھنا چاہیے کہ آپ شمال کے شہروں میں پہنچ جائیں گے۔

ہر غذا اور ہر جبلت فطری اور ذاتی اثرات رکھتی ہے جن سے بچنے کے لیے موجودات کے تمام طبعی قوانین کی شکست لازم آتی ہے۔ چنانچہ پھل کے ہر بیج اور ہر نطفے کا ایک نتیجہ ہوتا ہے جس کے خلاف امید باندھنا غلط ہے اور یہ جو پوچھتے ہیں کہ والدین کی غلطی تو وقتی تھی لیکن اس ناقص الخلقت بچے کی تکلیف دائمی ہے تو اس بات کا تعلق بھی غذا سے نہیں ہے۔ آپ اپنی آنکھ کو چاقو سے ایک لمحے میں اندھا کر دیتے ہیں اور ستر سال تک اندھے ہی رہتے ہیں غلطی تو ایک لمحے میں ہوئی اور اس کا اثر تا زندگی رہا۔ آپ چند لمحوں میں کانچ پہ پتھر مار دیتے ہیں لیکن کانچ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ نفسیاتی مسائل بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ آپ ایک آدمی کو گالی دیتے ہیں تو آخر عمر تک کے لیے دوستی ختم ہو جاتی ہے، جس طرح چند منٹ کی معذرت برسوں کی رنجشوں کو ختم کر سکتی ہے۔ میں نے قبل ازیں اعمال کے رائیگاں ہونے کی بحث میں ایک مثال دی تھی کہ ایک انسان عمر بھر صحت کا خیال رکھتا ہے لیکن آخر میں ایک چمچہ بھر زہر اس تمام احتیاط کو بے اثر کر دیتا ہے۔

اس مقام پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ والدین کو خبر نہیں تھی کہ ان کا یہ عمل قوانین الٰہی کے تحت نومولود بچے پر برا اثر ڈالے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ماں باپ کا جاننا نہ جاننا اشیاء کے قدرتی خواص پہ اثر نہیں ڈالتا۔ ہم یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ فلاں تار میں بجلی کی رو دوڑ رہی ہے اور

اس پر ہاتھ رکھ دیں تو بجلی ہمیں مار ڈالے گی۔ بجلی یہ معلوم کرنے کے لیے رکتی نہیں کہ اگر ہم اس کی موجودگی سے ناواقف ہیں تو وہ ہمیں زندہ چھوڑ دے۔ اگر ہم پانی کے دھوکے میں شراب پی جائیں تو ہمیں نشہ ہو جائے گا کیونکہ مست کر دینا شراب کے قدرتی خواص میں شامل ہے چاہے ہم اسے پانی سمجھیں یا کچھ اور، اس لیے والدین کی بیگناہی ان معنوں میں ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر گناہ نہیں کیا تاہم کسی عمل کے قدرتی اور ذاتی اثرات بدستور اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔

دوسرا سوال پیدائشی اپاہج افراد کی توہین کے بارے میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ لوگوں کا ان کی توہین کرنے کا تعلق نہ خدا سے ہے نہ کسی اور سے بلکہ یہ فعل ان لوگوں کی سمجھ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمیں پیدائشی اپاہج افراد کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے، اس بارے میں اسلام کے مقدس آئین میں کافی ہدایات دی گئی ہیں۔ آخری مسئلہ جو حکومت کی ذمہ داری سے تعلق رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ حکومت احترام کے ساتھ ان معذور افراد کی زندگی کی حفاظت کرے اور ہر ایک کے لیے اس کی دلچسپی، صلاحیت اور طاقت کے مطابق آسان کام اس کی آسائش کی حد تک آمدنی کے ساتھ مہیا کرے اور اس وسیلے سے ان بھائیوں اور بہنوں کی محنتوں اور مشقتوں کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرے۔

ہم اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہیں اور محترم پڑھنے والوں سے ایک درخواست کرتے ہیں:

ایک درخواست

ہمیں چاہیے کہ ہم جو فکری اور اعتقادی مسائل رکھتے ہیں (یعنی ہمارے

اصول دین اور ہماری آئیڈیالوجی جو عام یا علمی استدلال پر مبنی ہیں) ان میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رکھیں اور جس وقت کوئی اعتراض سامنے آئے تو فوراً کسی اسلام شناس سے پوچھ لیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم کسی دانشگاہ، مدرسے، کارخانے بازار، شہر یا گاؤں میں سے جہاں بھی ہوں اپنے ٹیلیفون کے نمبروں کے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ علمائے دین کے فون نمبر بھی نوٹ کر رکھیں کیونکہ جس طرح ایک چھوٹا سا بلیڈ پاؤں میں گھس کر انسان کو چلنے سے معذور کر دیتا اور زندگی تلخ بنا دیتا ہے، اسی طرح کبھی کبھی ایک چھوٹا سا اعتراض بھی ذہن میں اتر جاتا ہے جو ہم کو سوچنے اور پر امید رہنے سے روک دیتا ہے۔ وہ ہماری زندگی کو اجیرن کر دیتا ہے۔ خاص طور پر ہمارے نوجوان جو مختلف اعتراضات میں گھر جاتے ہیں وہ ضرور ایک فاضل، باخبر اور پرہیزگار انسان سے رابطہ رکھیں اور دیگر تمام دوستوں سے بھی ہماری یہی درخواست ہے۔

ایک دلچسپ یاد

ایک دفعہ میری چند دوستوں سے ملاقات ہو گئی جو کہتے تھے کہ اسلام کے قوانین تمدن کی روح سے میل نہیں کھاتے کیونکہ اسلام کہتا ہے کہ چور کی چار انگلیاں کاٹ دیں لیکن اشتمالیت کہتی ہے کہ اگر ہم اپنا اقتصادی نظام بدل دیں اور چور کا پیٹ بھر دیں تو چور پیدا ہی نہیں ہوگا۔ میں جب ان سے گفتگو کرنے بیٹھا تو پتا چلا کہ انھیں یہ بات ایک سوشلسٹ استاد نے بتائی ہے اور ان لوگوں نے اس کے لکچر کے دوران میں یہ بات سن کر دل میں بٹھا لی ہے۔ میں نے کہا کیا آپ جانتے ہیں کہ اسلام ہر چور کا ہاتھ نہیں کاٹتا بلکہ اسلام میں

ہاتھ کاٹنے کے لیے تقریباً بیس شرطیں رکھی گئی ہیں۔ آپ میں سے کون کون یہ شرائط جانتا ہے۔ سب نے کہا ہمیں نہیں معلوم۔ میں نے کہا اگر آپ اسلام کے مسائل سے واقف ہوتے تو کلاس میں اپنی جگہ کھڑے ہو کر استاد سے کہتے کہ اسلام نے جو چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے اس کے لیے تقریباً بیس شرائط بھی مقرر کی ہیں۔ استادِ محترم! اگر آپ کو ان شرائط کا علم نہیں ہے تو براہِ کرم پھر اس میں دخل بھی نہ دیجیے یا کم از کم آپ اسے آزاد بحث کی دعوت دیتے یا ٹیلیفون پر وہ شرائط کسی عالم سے پوچھ لیتے اور اسلام کی حمایت کرتے۔ پھر میں نے ان میں سے کچھ شرائط انھیں بتائیں تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ہم اپنی اپنی راہ پر ہو لیے۔

میرے محترم قارئین! قرآن کے بار بار کے دعووں کے مطابق اسلام کو آخر میں فتح ہو گی اور دنیا بھر کے لوگ آئندہ زمانے میں اسلام کے پیرو ہوں گے۔ حضرت امام مہدی علیہ السلام کی حکومت قائم ہو گی۔ ان وعدوں کے ساتھ بھی کچھ شرطیں ہیں:

۱۔ اسلام کی طرف دنیا والوں کی توجہ

۲۔ اسلام کی پہچان

۳۔ اسلام کی طرف میلان

اسلامی انقلاب کے شہیدوں نے لوگوں کی توجہ اسلام کی طرف پھیر دی ہے اور اس طرح گویا پہلا قدم اٹھایا گیا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ دوسرا قدم اٹھائیں۔ وہ اسلام کو پہچاننے اور پہنچوانے کا کام ہے اور تیسرا قدم خود دنیا والوں سے تعلق رکھتا ہے جو مختلف نظریات اور ان کے ماننے والوں

سے مایوس ہوکر اسلام کی تلاش میں آئیں گے۔

اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہر ہفتے میں کم از کم ایک مفید کتاب ضرور پڑھ لیا کریں تاکہ ہماری اسلامی معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔ حضرت امام رضاؑ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ ہمارے طرزِ فکر، کلام اور تحریر سے واقف ہو جائیں تو پھر ان سے رغبت بھی پیدا کریں گے۔

مطالعاتی سفر میں پہلا قدم اعتقاد اور جہاں بینی کی کتابوں کے مطالعے سے اٹھانا چاہیے کیونکہ ہمارے اعمال کی بنیاد میں ہمارا سوچ کارفرما ہوتا ہے اس لیے مضبوط دلیلوں کے ساتھ، فطرت کی رہنمائی کے مطابق اور تمام مکاتبِ فکر پر نظر رکھتے ہوئے ہمیں اپنے راستے کا انتخاب کرنا چاہیے۔

عدل الٰہی کے متعلق اس باب کے آخر میں ہم ایک بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ یہ ہے:

درجہ بندی

خدا کی پہچان کا ذریعہ ہے

جس طرح تبعیض (ناروا ترجیح) ظلم ہے، اسی طرح حکیمانہ تفاوت (درجہ بندی)[1]

[1] ہم نے تبعیض و تفاوت میں فرق بتایا ہے تبعیض یعنی یکساں خصوصیات کے افراد اور مخلوقات کے مابین فرق روا رکھنا، ظلم ہے لیکن تفاوت اختلافِ خصوصیات سے متعلق ہوتا ہے مثلاً اگر ایک کلاس کے طالب علموں نے استاد سے ایک سبق پڑھا اور استاد انکے نمبروں میں فرق رکھتا ہے تو یہ تبعیض اور ظلم ہے اور اگر استاد کے دیئے ہوئے نمبروں میں تفاوت اس وجہ سے ہے کہ شاگردوں کی سبق سے واقفیت میں بھی تفاوت ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

عین عدالت ہونے کے ساتھ ساتھ خدا کی پہچان کا ذریعہ بھی ہے ۔ قرآن فرماتا ہے:

اور اسکی قدرت کی نشانیوں میں آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمھاری زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف بھی ہے۔ (سورۃ روم ۔ آیت ۲۲)

اگر نقشہ نویس ہمیشہ ایک ہی طرح کا نقشہ بنائے، معمار اور انجنیئر ایک ہی قسم کی عمارت بنائے، شاعر ایک ہی طرز کا شعر کہے تو یہ اس کی کمزوری اور کم علمی کی دلیل ہے اور اگر وہ ہر روز اور ہر لحظہ نیا ڈول ڈالے تو یہ اس کی قوت تخلیق کا ثبوت ہے۔

سماجی انصاف

قبل ازیں ہم عدل الٰہی پر بحث کر چکے ہیں اور اب سماجی انصاف کے موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ بحث اپنے اندر بڑی وسعت رکھتی ہے اس لیے ہم نے خلاصے کے طور پر قرآن مجید، نہج البلاغہ اور روایات میں سے اس عنوان سے متعلق مضامین جمع کر کے ہر آیت اور حدیث کی قدرے وضاحت بھی کر دی ہے۔ یہ مطالب ہمارے مکتب فکر کا تعارف کرانے والے ہیں، اور ان سے واقفیت عوام کے لیے مفید ہے۔

سماجی انصاف کی بحث سے ہمارا مقصد ان آیتوں اور روایتوں کو بیان کرنا ہے جن میں قرآن کریم اور ہمارے معصوم پیشواؤں نے حقوق کی حفاظت، قانون کی نظر میں تمام انسانوں کی برابری کا درس دیا ہے اور ناروا امتیاز، استحصال اور ظلم کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ ہم

اس ضمن میں دولت کی منصفانہ تقسیم اور اسلامی بھائی چارے کے سلسلے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی روش کے مختلف نمونے آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

تمام اسلامی قواعد میں انصاف

اسلام عدل اور اعتدال کا مکتب ہے۔ یہ ایک سیدھا راستہ ہے اور مسلمان قوم میانہ روی اور اعتدال کو اپنانے والی قوم ہے۔ اسلام کا نظام انصاف پر مبنی ہے اس میں مظلوم کے لیے آنسو ہیں تو ظالم کے خلاف تلوار بھی ہے۔ اگر یہ صحتِ جسمانی کا ضابطہ رکھتا ہے تو روحانی اور باطنی ترقی پر بھی توجہ دیتا ہے۔ اگر اس میں نماز ہے تو اس کے ساتھ زکات کا حکم بھی ہے۔ اگر اسلام میں اولیاء اللہ سے محبت اور عقیدت (تولّیٰ) ہے تو یہ اللہ کے دشمنوں سے بیزاری اور دوری (تبرا) بھی چاہتا ہے۔ اگر اسلام علم کی حمایت کرتا ہے تو اس کے ساتھ عمل کو بھی لازمی سمجھتا ہے۔ اگر اسلام خدا پر بھروسا رکھنے کا حکم دیتا ہے تو سعی و تلاش پر بھی ابھارتا ہے۔ اگر یہ مالکیت کا احترام کرتا ہے تو مالکیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور ضرر رسانی کی ممانعت بھی کرتا ہے۔ اگر اسلام مجرم کو معاف کردینے کی ہدایت دیتا ہے تو جرائم کی مقرر کردہ سزائیں دینے کا فیصلہ کرنے اور اسے نافذ کرنے میں نرمی نہ برتنے کا حکم بھی دیتا ہے۔

امام علیہ السلام کی خدمت میں لوگ جب عرض کرتے ہیں کہ فلاں شخص حضور خلب سے نماز پڑھتا ہے تو آپ پوچھتے ہیں کہ اس کے سوچ کا انداز کیسا ہے؟ یعنی اگر کوئی شخص عبادت میں کمال رکھتا ہے تو اسکے طرز فکر پر بھی غور کرنا چاہیے۔

سماجی انصاف کا
الٰہی جہاں بینی سے تعلق

سماج میں پائے جانے والے تمام بڑے بڑے نعرے جب تک اس کی اصل جڑ سے قوت نہیں پاتے نعرے کی حد سے آگے نہیں نکلتے۔ سماجی انصاف کا نعرہ بھی انہیں نعروں میں سے ہے جنکی حمایت کا ہر حکومت دم بھرتی ہے اور اپنے آپ کو اس کا حامی گردانتی ہے لیکن آپ کو کسی عہد حکومت میں اسکا نشان نظر نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نعرے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام میں مساوات اور برابری گہری جڑیں رکھتی ہیں مثلاً:

۱۔ پوری کائنات خدائے حکیم کی نگرانی میں ہے اور غیر منظم نہیں ہے جو میں اس دنیا کا ایک جزو ہوتے ہوئے ہر کام میں اپنی من مانی کروں اور صرف اپنی ہی ذات کو آگے رکھوں۔

۲۔ ہمارا طرزِ عمل اور کردار بلکہ خیالات تک نگرانی میں ہیں اور ہمارا خدا پردۂ غیب سے انھیں دیکھ رہا ہے اور اس کے دربار میں ہم سب کی پیشی ہونا ہے۔

۳۔ ہم سب مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور آخر مٹی ہی میں مل جائیں گے۔ مٹی کے ذروں میں کوئی فرق نہیں ہے کہ میرے اور کسی دوسرے میں بھی کوئی فرق ہو۔

۴۔ سب لوگ خدا کے بندے ہیں۔ ان سے محبت رکھنا خدا کی خوشنودی

کا سبب ہے اور ان کی سب سے زیادہ بھلائی چاہنے والا سب سے اچھا آدمی ہوتا ہے۔

۵۔ موجودات اس حد اور قانونی حق سے آگے نہیں بڑھ سکتیں جو پیدا کرنے والے نے ان کے لیے مقرر کیا ہے۔

۶۔ ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔

دنیا اور انسان کی یہ تشریح اور تعبیر جو دراصل جہاں بینی ہے عدل اور انصاف کے اصول کو قبول کرنے کی سب سے زیادہ سازگار بنیاد ہے لیکن ماحول، دوست اور ہوس اس بنیاد کو ڈھانے والے ہیں۔

انصاف کی خواہش قدرتی ہے

قرآن فرماتا ہے کہ ہم نے اچھائیوں اور برائیوں کا علم انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے: پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری کو اسے سمجھا دیا ہے۔

(سورۂ شمس۔ آیت ۸)

ایک بچے کو دیکھیے جو اپنا سیب آپ کے پاس رکھوا کر چلا جاتا ہے اور جب وہ پانی پی کر واپس آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ آپ نے تھوڑا سا سیب کھا لیا ہے تو ناخوش ہو جاتا ہے اور ایسی نظر سے دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے آپ کو امانت دار سمجھ کر اپنا سیب رکھوایا تھا، پھر آپ نے امانت میں خیانت کیوں کی؟ یہ بات بچے کے ذہن میں ہے چاہے وہ اسے زبان پر لائے یا نہ لائے۔ دیکھیے خیانت کی برائی ایک ایسی بات ہے جس کے بتانے کے لیے کسی استاد یا اتالیق کی ضرورت نہیں پڑتی۔

انسان اپنے احساس اور فطرت سے خیانت کو برا جانتا ہے۔

انصاف بھی ایک ایسی ہی چیز ہے جسے انسان از خود اچھا سمجھتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ظلم کرنے والے بھی اپنے ظلم کی وجہ بیان کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنے فعل کو منصفانہ ثابت کریں۔

کبھی کچھ لوگ آپس میں مل کر اپنے عملی وسائل اکٹھے کرتے ہیں اور پھر چوری کی ایک واردات کرتے ہیں لیکن جب مسروقہ مال کے بٹوارے کا وقت آتا ہے تو کہتے ہیں کہ آؤ اب ہم مال کو آپس میں انصاف سے بانٹ لیں۔ یہ بات کبھی کبھی غیر شعوری طور پر کہہ دی جاتی ہے لیکن وہ اس بات کو زبان پر نہ بھی لائیں تو بھی دل میں منصفانہ تقسیم کو ہی پسند کرتے ہیں اور اگر ان میں سے ایک ساتھی چاہے کہ دوسروں سے زیادہ حصہ لے تو باقی لوگ بپھر جاتے ہیں۔

ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ جب کوئی شخص سماجی انصاف حاصل کرنے میں اپنی جان و مال، نظریے یا ملک کا دفاع کرنے میں مارا جاتا ہے یا ظالموں کے سامنے ڈٹ جاتا ہے تو دنیا والوں کی تعریف کا مستحق ٹھیرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ عدل کی حمایت اور ظلم کے خلاف جنگ ہر انسان کی عقل اور فطرت کا تقاضا ہے۔

منصفانہ قانون صرف انبیاءؑ کے طرزِ فکر میں ملتا ہے

شاید ہی کوئی ایسا سماج ہوگا جو حق، قانون اور انصاف کی بات نہ کرتا ہو شاید ہی کوئی ایسی انتظامیہ ہو جو اپنے آپ کو سماج کے حقوق اور اس کے

مفادات کا حامی نہ سمجھتی ہو۔ اب ہم اس سلسلے میں چند سوالات قائم کرتے ہیں مثلاً:

۱۔ کون سا قانون سو فیصدی منصفانہ ہو سکتا ہے کہ کسی ایک شخص یا ایک طبقے پر بھی زیادتی نہ کرے؟

۲۔ ایسا کون سا قانون ساز ہے کہ جس کی ذاتی ہوا و ہوس کا اس کے بنائے ہوئے قانون پر اثر نہ پڑا ہو؟

۳۔ قوانین کو کس معیار کی رو سے منصفانہ قرار دیا جاتا ہے؟

۴۔ قانون ساز کس سماجی مقام سے بات کرتے ہیں اور کس طبقے اور گروہ کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں؟

۵۔ فرض کیا کہ قانون ساز سیاسی پارٹی، قبیلے، علاقے اور نسل کی جانبداریوں سے آزاد ہیں تو وہ کس مقام سے تمام انسانوں پر توجہ دیں کہ ان قوانین کا ردعمل جلدی یا دیر سے لوگوں کے لیے ضرر رساں نہ ہو؟

ان سوالات کی رو سے ہمارا نظریہ یہی ہے کہ سماجی انصاف، عادلانہ قانون سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا امکان خدا کی راہ اور انبیاءؑ کے طرز فکر کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔

انصاف بنیادی شرط ہے

اسلام میں تمام اہم اسامیاں منصف لوگوں کے سپرد ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ جن کی سابقہ کارکردگی عوام کے نزدیک خراب نہ ہو اور جو قابلیت اور پرہیزگاری میں مشہور ہوں۔ انصاف کرنے میں قاضی سے لیکر عدالت کے اہل کار اور گواہ تک سب کو چاہیے کہ وہ جس مقام پر بھی ہوں انصاف کی بات کریں اور

لکھیں۔ نماز جمعہ و جماعت میں پیش نماز عادل ہو۔ مرجع تقلید، صدر، وزیر اعظم اور بیت المال کے ناظم سے لیکر طلاق کے معاملے میں عدالت ضروری ہے۔ خبر دینے میں صرف عادل لوگوں کی دی ہوئی خبر پر اطمینان ہو سکتا ہے مختصر یہ ہے کہ اسلام نے عدالت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اس کو سماج کے تانے بانے میں استحقاقی سماجی، خاندانی اور اقتصادی مسئلوں میں بنیادی شرط شمار کیا ہے۔

روایات میں انصاف کی اہمیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ انصاف کا ایک لمحہ ایسے ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے جن کے دن تم روزہ رکھ کر اور راتیں بیداری میں بسر کرو (جامع السعادات جلد ۲ صفحہ ۲۲۳)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک رہنما کا عوام کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک دن کا عمل کسی ایسے شخص کے سو یا پچاس سال کے عمل سے بہتر ہے جو وہ اپنے اہل و عیال کے درمیان عبادت میں مشغول رہ کر گزارے (نظام الاسلام السیاسی صفحہ ۷۱ مصنفہ باقر شریف القرشی)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ عادل رہبر کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی (نظام الاسلام السیاسی صفحہ ۷۱)

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے فرمایا "انصاف انسانوں کی بھلائی بھی ہے اور خدائی طریقے کی پیروی بھی" اور فرمایا "انصاف زندگی اور ظلم سماجی موت ہے" (قصار الجمل) ہاں! وہ لوگ جو ظلم کے سامنے جھک

جانتے ہیں وہ حقیقت میں مردہ ہیں۔

انصاف کی اہمیت

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا[1] کی تفسیر میں فرمایا ہے: زمین انصاف قائم کرنے اور حدود الٰہی کے جاری کرنے سے زندہ ہوتی ہے (قصار الجمل)

انبیاءؑ کی بعثت کے مقاصد

انصاف کا قیام

قرآن نے نبیوں کی جو ذمہ داریاں بیان کی ہیں ان میں سے ایک سماجی انصاف کا قیام ہے۔ ہم ان معصوم رہبروں کے کارناموں کی ایک فہرست اس مقام پر پیش کیے دیتے ہیں:

۱۔ خدا کی طرف بلانا

خدا کی عبادت اور طاغوتوں کی مخالفت اور ان سے دوری کے لیے لوگوں کو دعوت دینا۔ لوگوں سے تمام نبیوں کا کہنا یہ تھا:

خدا کی عبادت کرو اور طاغوتوں سے دور رہو۔ (سورہ نحل۔ آیت ۳۶)

---

[1] سورۂ روم۔ آیت ۳۰

۲۔ ڈرانا اور خوشخبری دینا

(اے رسولؐ!) ہم نے آپ کو دین حق کے ساتھ بہشت کی خوشخبری دینے والا اور دوزخ کے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۱۹)

۳۔ تعلیم و تربیت

خدا نے لوگوں کے پاس اپنے رسولؐ کو بھیجا تاکہ وہ ان کی تربیت کریں اور وہ باتیں بتائیں جن کی انہیں ضرورت ہے۔

وہی تو ہے جس نے مکہ والوں میں انھیں میں سے ایک شخص (محمدؐ) کو اپنا رسولؐ بنایا جو ان کے سامنے اسکی آیتیں پڑھتا، ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔ (سورۂ جمعہ۔ آیت ۲)

۴۔ ظالمانہ قوانین کی مخالفت

قسم قسم کی پابندیوں سے جنگ اور توہمات اور ان ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کا دور کرنا جو فضول قسم کے رسم و رواج نے انسانوں کے ہاتھ پیروں میں ڈال دی ہیں:

اور (پیغمبرؐ سخت احکام کا) وہ بوجھ جو اُن کی گردن پر تھا اور وہ پھندے جو اُن پر (پڑے ہوئے) تھے ان سے ہٹا دیتا ہے۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۵۷)

۵۔ غلط راہوں کی حقیقت کھولنا

ٹیڑھے راستوں اور اپنے زمانے کے نقلی رہبروں (فرعونوں، قارونوں اور ان کے فکروعمل) کی راہوں کی حقیقت کھول دینا اور انھیں رسوا کرنا:

اور ہم اپنی آیتوں کو یوں تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ گنہگاروں کی راہ سب پر واضح ہو جائے۔ (سورۂ انعام - آیت ۵۵)

۶۔ انصاف پسند معاشرے کی تشکیل

انبیاءؑ کا چھٹا مقصد ایسے سماج کی تشکیل ہے جس میں لوگ انصاف قائم کریں اور دوست دشمن کے ساتھ تمام خاندانی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی تعلقات میں منصفانہ رویہ رکھتے ہوں۔

انبیاءؑ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں خدا اور قیامت کا ایسا عقیدہ ابھاریں اور فرد اور سماج کے رگ و پے میں ایسے اخلاق اور خدائی سوچ کا انداز پیدا کریں کہ لوگ خود انصاف کے لیے اٹھ کھڑے ہوں:

اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

(سورۂ حدید - آیت ۲۵)

چونکہ منصفانہ سماج کا قیام معنوی قوت کا بھی محتاج ہوتا ہے اور مادی قوت کا بھی اس لیے اوپر کی آیت میں دونوں قوتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی "بَیِّنَاتِ، کتاب اور میزان"۔ ان میں سے ہر قوت اور معنوی حمایت عدل قائم کرنے کے لیے ہے اور جملہ (وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ)

جو آیت کے آخر میں ہے، مادی قوت کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ خلاف ورزی کرنے والے جان لیں کہ وہ جب ضد اور تخریب کاری کریں گے تو قوت سے کچل دیے جائیں گے۔

چنانچہ نبیوں کا ایک مقصد سماجی عدل کا قیام ہے۔

مساوات کے لیے امام علیؑ کی دلیل

جب لوگ امیرالمومنین امام علی علیہ السلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ آپ مال کو برابر کیوں تقسیم کرتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں:

۱۔ اگر یہ میرا ذاتی مال ہوتا تب بھی میں اسے برابر تقسیم کرتا چہ جائیکہ یہ مال خدا کا ہے اور عوام سے متعلق ہے اس لیے اس میں سبھی لوگوں کا حق ہے (نہج البلاغہ، مترجمہ مفتی جعفر حسین۔ خطبہ ۱۲۴)۔

۲۔ دیکھو بغیر کسی حق کے داد و دہش کرنا بے اعتدالی اور فضول خرچی ہے (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۴)۔ قرآن کہتا ہے: فضول خرچ لوگ یقیناً شیطان کے بھائی بند ہیں۔[1]

۳۔ غیر مساوی تقسیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لالچی لوگوں کی ایک ٹولی انسان کو گھیر لیتی ہے اور چاپلوسی اور بیجا تعریف سے مال حاصل کر لیتی ہے اور اس طرح انسان کو عدلِ الٰہی کے قانون کے سامنے شرمندہ کر دیتی ہے۔

اس کے بعد امام علیہ السلام مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر انسان اپنا مال بغیر استحقاق کے نااہل آدمی کو دے گا تو خدا اسے ان لوگوں کے شکریے سے بھی محروم رکھے گا جنھوں نے اس کا مال ناحق حاصل کیا ہے۔ جلدی یا دیر سے

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۲۷

ورق الٹ جاتا ہے، منظر بدل جاتا ہے اور وہی تعریف کرنے والے لوگ اس شخص سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور کسی دوسرے کا دم بھرنے لگتے ہیں۔

ایسا شخص نہ عدل الٰہی کے قانون کے سامنے عزت پاتا ہے اور نہ وہ لالچی لوگ اس سے محبت کرتے ہیں جنھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اس کی ناانصافی اور داد و دہش سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا تھا۔ اگر اس پر برا وقت پڑ جائے تو وہ اسے تنہا چھوڑ کر اس کے بدترین دوست ثابت ہونگے (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۴)۔

جہانِ اسلامی انصاف مال ضبط کر لیتا ہے

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا عوام اسلام کے سماجی انصاف سے دور ہوتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت عثمان اپنے دوستوں اور خاندان کو بے حساب مال بخشنے اور جاگیریں عطا کرنے لگے۔ انھی بے جا امتیازات اور ناہمواریوں نے لوگوں کو اتنا ناراض کر دیا کہ انھوں نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا اور امیرالمومنین امام علیؑ سے بیعت کر لی۔

اب امیرالمومنینؑ کی حکومت ہے تو غلط رسمیں مٹنا چاہئیں۔ سابقہ دور کے منظورِ نظر لوگوں کا مال ضبط ہونا چاہیے اور بیجا تقرریوں اور جاگیروں کی اصلاح اور تنظیم نو ہونا چاہیے۔ یہ تھا امام علیؑ کا دھماکا خیز اور انقلابی لائحہ عمل اور یہ رہا آپ کا قول:

خدا کی قسم! اگر مجھے کہیں ایسا مال بھی نظر آتا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر خرچ ہوا ہوتا تو میں اسے بھی واپس لے لیتا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵)۔

عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں ہے

دو عورتیں بیت المال سے اپنا حصہ لینے امیرالمومنینؑ کی خدمت میں آئیں۔ ان میں سے ایک عرب تھی اور دوسری غیر عرب۔ امیرالمومنینؑ نے حسبِ معمول اپنے انصاف کے مطابق برابر حصہ دیا۔ جو لوگ ابھی تک اسلامی تعلیم کو سمجھ نہیں پاتے تھے اور اس انصاف کی برداشت نہیں رکھتے تھے انھوں نے اعتراض کر دیا اور کہا کیا آپ عربی اور عجمی کو برابر حصہ دیتے ہیں؟

امیرالمومنینؑ نے فرمایا:

مجھے ان میں کوئی فرق نظر نہیں آیا (وسائل الشیعہ جلد ۱۱ صفحہ ۸۱)۔

امیرالمومنینؑ پر اس مساوات کی وجہ سے جو آپ لوگوں کے مختلف طبقوں میں ملحوظ رکھتے تھے خود غرض اور طاغوتی لوگ اعتراض کرتے رہتے تھے لیکن یہ نکتہ چینیاں آپ کو توحید اور انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی تھیں۔ آپ ان لوگوں میں سے تھے جن پر لوگوں کی بے جا ملامتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بقول قرآن:

اور وہ کسی ملامت کرنے والے کی کچھ پروا نہیں کریں گے۔ (سورہ مائدہ۔ آیت ۵۴)

مُردوں کی گنتی

ایام جاہلیت میں قبیلے کا بڑا ہونا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں میں قبیلے کے افراد کی گنتی پر جھگڑا یہاں تک بڑھا کہ لوگ کہنے لگے ہم قبیلے کے مُردوں کی بھی گنتی کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو کہ کس قبیلے کی جمعیت زیادہ ہے۔ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی:

نسل اور مال کی بہتات نے تم لوگوں کو غافل بنا رکھا ہے
یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھیں۔ (سورۂ تکاثر۔ آیات ۱، ۲)

یعنی کثرت اور بہتات نے تم کو اس قدر سرگرم کر دیا کہ تم مُردوں کی قبروں پر پہنچ کر ان کی گنتی بھی کرنے لگے اور ان کی تعداد پر فخر کرنے لگے۔ امیرالمومنینؑ نے اپنے ایک خطبے میں اس آیت کی تلاوت کرنے کے بعد اس سوچ کو برا بتایا ہے (نہج البلاغہ خطبہ ۲۱۸)

ایک ایسی ہی نشست میں جہاں ہر شخص اپنے قبیلے، نسل اور حسب نسب پر فخر کر رہا تھا حضرت سلمان فارسیؓ کی باری بھی آئی۔ لوگوں نے سوچا کہ چونکہ ان کا تعلق مشہور قبیلوں سے نہیں ہے اس لیے انھیں شرمندگی ہوگی لیکن حضرت سلمانؓ نے اسلامی تمدن کی تربیت پائی تھی، انھوں نے نہایت جرأت اور فخر سے فرمایا: آپ حضرات کو میرے خاندان سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں گمراہ تھا اور میں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل میں ہدایت پائی ہے اور میرے نزدیک یہی بات بہت اہمیت رکھتی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

(سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۳۴۸) انھوں نے اس نظریاتی جواب سے انکی ڈینگ ختم کردی اور بتادیا کہ نظریے کے سامنے اور خدا کے نزدیک سب برابر ہیں اور خالی خولی افتخار فضول ہے۔

امامؑ کے سامنے لوگوں کو خرید لینے کی تجویز

کچھ خیر خواہ امیر المومنینؑ کی خدمت میں پہنچے اور کہنے لگے: آپ عرب اور قریش کے سربرآوردہ لوگوں کو بڑا حصہ دیا کیجیے اور اس طرح انہیں اپنے گرد جمع کر لیجیے کیونکہ اگر آپ ان کو غلاموں اور غیر عربوں پر ترجیح نہیں دینگے تو ممکن ہے کہ یا تو وہ تخریب کاری کرنے لگیں یا آپ کو چھوڑ کر معاویہ سے جا ملیں۔

امیر المومنینؑ نے فرمایا: کیا میں بیت المال کی رقم لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے میں خرچ کروں، کیا انھیں خراج دوں؟ واقعہ یہ ہے کہ جو کوئی رقم لیکر میرا طرفدار ہوگا اسے جب دوسری طرف سے زیادہ رقم ملے گی تو وہ میرا مخالف ہو جائے گا۔ ہمیں چاہیے کہ انصاف اور نظریے کا تحفظ کریں اور لوگوں کو دھمکا کر یا لالچ دیکر اپنی طرف کھینچ لینے کا نظریہ نہ رکھیں۔ میں کبھی کسی کو کسی پہ ترجیح نہیں دونگا جس کا جی چاہے رہے جس کا جی چاہے چلا جائے۔

ہاں تو یہ ہے امام علیہ السلام کا طریقہ کہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی خاطر انصاف کے خلاف عمل کرنے کو تیار نہیں ہیں (بحار الانوار جلد ۱۶ طبع قدیم صفحہ ۱۰۸)۔

برادری کی ایک مثال

شہر بلخ کا ایک باشندہ کہتا ہے : میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھا کہ کھانے کا وقت ہوگیا۔ دستر خوان بچھایا۔ امامؑ نے اپنے تمام کالے گورے غلاموں کو بلایا اور خود بھی کسی تکلف کے بغیر ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ لوگوں نے امام علیہ السلام سے عرض کیا کہ غلاموں کے لیے الگ دستر خوان لگوایئے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا : ہمارا خدا ایک ہے۔ ہم سب ایک ماں باپ سے ہیں اور قیامت کے دن ہمیں نیکیوں اور بدیوں کا بدلہ ملے گا، پھر یہ خود پسندی کس لیے ؟ (کافی جلد ۸۔ صفحہ ۲۳۰) جس دن میں یہ دیکھوں گا کہ ہر شخص چاہے وہ جس حال میں ہو، دوسرے لوگوں کے پہلو میں کسی قسم کی تکلیف کا احساس کیے بغیر اٹھتا بیٹھتا ہے وہ دن ہمارے تمدنی انقلاب کی تکمیل کا دن ہوگا۔ اگر اسی طرح ہر مسلمان اپنے آپ کو کسی شان اور فضیلت کا حامل محسوس نہ کرے، عوام میں گھل مل جائے اور اپنے اندر اسلامی اخلاق کو زندہ کرے تو جو انسان بھی ہم سے ملے گا وہ ہم میں جذب ہو کر ہمارا ہم عقیدہ بن جائے گا۔

اسلام میں مساوات

دنیا میں صدیوں سے سیاہ فام انسانوں پر ظلم ہوتا چلا آرہا ہے۔ ان کے حمام، قہوہ خانے، اسپتال، مدرسے اور قبرستان سفید فام لوگوں سے الگ

ہیں۔ اسلام نے بڑے صاف لفظوں میں ان تفرقات پر چوٹ لگائی ہے اور کہا ہے:

خدا کے نزدیک تم سب میں عزت دار وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ (سورۂ حجرات۔ آیت ۱۳)

اور اسکی قدرت کی نشانیوں میں آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگتوں کا اختلاف بھی ہے۔

(سورۂ روم۔ آیت ۲۲)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبے میں لوگوں کو جمع کر کے فرمایا تھا: تمام مسلمان آپس میں برابر ہیں، چاہے وہ کسی قبیلے، نسل اور زبان سے تعلق رکھتے ہوں (سفینۃ البحار، جلد ۲ صفحہ ۳۴۸) آپ نے اپنے عہد میں غلاموں کو بڑے بڑے منصب عطا فرمائے۔ کالے گوروں میں شادیاں کروائیں یہاں تک کہ اپنی پھوپھی کی بیٹی کا نکاح ایک کالے غلام سے کر دیا تاکہ اپنے آپ کو برتر سمجھنے کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے۔

ایک غلط طریقے پر نکتہ چینی

خدائے بزرگ نے اس آیت میں کہ: پھر جہاں سے لوگ چل کھڑے ہوں وہیں سے تم بھی چل کھڑے ہو (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۹۹) قریش کی اس برتری کی تردید کر دی جو وہ اپنے لیے سمجھتے تھے۔

ان مفروضہ فضیلتوں کی دلیل یہ تھی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی ہیں اور اسی دلیل کی رو سے وہ حج کے مراسم ادا کرنے میں صحرائے عرفات کا جانا ترک کر دیتے

تھے اور اس کی جگہ مزدلفہ چلے جاتے تھے اور کہتے تھے ہم خدا کے حرم کے لوگ ہیں، ہم حرم سے الگ نہیں ہونگے تب یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ تم بھی وہیں جاؤ جہاں دوسرے لوگ جاتے ہیں اور اپنی اس برتری کا خیال چھوڑ دو۔

ایک نظریہ رکھنے اور کاروبار کرنے میں فرق ہے

بڑے بڑے لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے ماننے والوں کی توہین کرتے اور انہیں ذلیل اور ہیچ سمجھتے تھے۔ انھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر آپ ان غریب لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دیں تو ہم آپ کے پاس آسکتے ہیں لیکن چونکہ آپ ہمیشہ کمزوروں اور محروموں کے حامی رہے تھے اس لیے آپ نے ان کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا: میں با ایمان لوگوں کو (بڑے لوگوں کی خاطر) اپنے ہاں سے نہیں نکال سکتا۔ (سورۂ ہود۔ آیت ۲۹) ہمارے لیے جو بات اہمیت رکھتی ہے وہ سماجی انصاف اور نظریے کا تحفظ ہے۔ ہمیں لوگوں کو اس نظریے ہی کی طرف دعوت دینا چاہیے نہ یہ کہ اس کے ایک حصے کو نظر انداز کر دیں اور حق و انصاف سے اس لیے دور ہو جائیں کہ شاید اس طرح سے ہمارے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ سوچنے کا یہ انداز تجارت اور پیری مریدی کا معاملہ ہے نظریے کی حفاظت اور خدا کی عبادت نہیں ہے۔

ایک روٹی کی منصفانہ تقسیم

امیر المومنینؑ کے سامنے مسلمانوں کا کچھ مال پیش کیا گیا اور اس کے لینے کو لوگ گھر آئے۔ آپ نے اس غرض سے کہ اس میں چوری اور خیانت نہ ہو رکاوٹ کے طور پہ مال کے گرداگرد ایک رسی کھنچوا دی اور لوگوں سے فرمایا کہ مال سے دور رہیں اور رسی کے زیادہ قریب نہ آئیں۔ اس کے بعد آپ خود تشریف لائے اور وہ سارا مال تمام قبیلوں کے نمائندوں میں اسی دن بانٹ دیا۔ آخر میں آپ کی نظر ایک روٹی پہ پڑی جو ایک برتن میں پڑی رہ گئی تھی۔ آپ نے حکم دیا کہ اس روٹی کو بھی سات حصے کر کے باقی بیت المال کی طرح بانٹ دو اور ہر گروہ کو ایک ایک ٹکڑا دیدو (بحار الانوار۔ جلد ۴۱۔ صفحہ ۱۳۶)۔

لوگوں کے فائدے کے لیے اپنے نظریے کو نہ بگاڑو

مدینے کے ایک مسلمان کے گھر میں چوری ہو گئی۔ اس سلسلے میں دو آدمیوں پر الزام لگا۔ ان میں سے ایک مسلمان اور دوسرا یہودی تھا۔ لوگ دونوں کو پکڑ کر پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حضور میں لائے۔ مسلمانوں میں ہراس پیدا ہوا کہ اگر مسلمان کی چوری ثابت ہو گئی تو مدینے اور اس کے قریب کے یہودیوں میں ہماری عزت باقی نہیں رہے گی۔ لوگ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے کہ مسلمانوں کی آبرو خطرے میں ہے۔ کوشش یہ ہو کہ مسلمان چھوٹ جائے لیکن آپ بے انصافی کے فیصلے کو اسلام اور اس کے

نظریے کی بے عزتی سمجھتے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ یہودیوں نے ہم پر اب تک ظلم کیا ہے اور بالفرض اس موقع پہ ایک یہودی پر ظلم بھی ہو جاتا ہے تو ان کے مظالم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فیصلے اور انصاف کا اصول پچھلی تکلیفوں کے حساب سے الگ ہے۔

آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں ملزموں کی جانچ کی اور مسلمانوں کی خواہش کے خلاف یہودی چھوٹ گیا۔ انصاف کی یہ مثال اگرچہ سطحی نظر میں اس زمانے کے مسلمانوں کی بے آبروئی کا پہلو رکھتی تھی لیکن حقیقت میں اس نے انصاف اور اسلامی نظریے کو ہمیشہ کے لیے باعزت اور محترم بنا دیا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اپنے نظریے کی فکر کریں اور لوگوں اور جماعتوں کی خوشنودی کے لیے نہ اس میں کچھ گھٹائیں نہ اس میں کچھ بڑھائیں۔

ایک بیجا امید کے جواب میں

ایک گروہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس کے پاس سے گزرا۔ انھوں نے اس میں عمار اور بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے مفلس اور فقیر دیکھے تو تعجب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: کیا آپ نے انھیں گمنام لوگوں پر قناعت کر لی ہے۔ آپ انھیں جلد سے جلد اپنے پاس سے دور کر دیجیے تاکہ آپ سے ہماری رغبت کے لیے گنجائش پیدا ہو سکے۔

تفسیر "المنار" کے مصنف یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے قریش کے ان مغرور لوگوں کی تجویز کی طرف کچھ جھکاؤ ظاہر کیا اور پیغمبرِ خدا

سے عرض کیا: آزمائش کے طور پر کچھ دن کے لیے ان فقیر لوگوں کو اپنے پاس سے دور کر دیجیے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان گھمنڈیوں کی رغبت کے لیے فضا بنتی ہے یا نہیں اور ان کی تجویز میں کوئی سچائی بھی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد آیت نازل ہوئی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خبردار کیا:

ان لوگوں کو دور نہ کرو جو صبح و شام خدا کو پکارتے ہیں اور اسی کی ذات پاک کا دھیان رکھتے ہیں۔ (سورۂ انعام آیت ۵۲)

آیت کے آخر میں خداوند عالم فرماتا ہے:

اگر تم ان مومنوں کو اپنے سے دور کرو گے تو ظالموں میں گنے جاؤ گے۔

قضاوت کو معمولی نہ سمجھو

دو بچوں نے دو طرح کی تحریر لکھی اور امام حسن علیہ السلام کے پاس لائے تاکہ آپ ان دونوں میں فیصلہ کریں۔ اس جگہ ہر معمولی انسان اس مسئلے کو سطحی نظر سے دیکھتا ہے کیونکہ اول تو فیصلے کا موضوع تحریر ہے، دوسرے جھگڑے کے فریق دو بچے ہیں لیکن تھوڑا یا بہت، بچہ یا بڑا جو کچھ بھی ہے بہر حال فیصلہ مطلوب ہے لہٰذا امام علی علیہ السلام نے امام حسن علیہ السلام کو خبردار کیا کہ فیصلے پر دھیان دیا کرو۔ تم آج جو فیصلہ کرو گے کل قیامت میں عدل الٰہی کے سامنے تم کو جواب دہی کرنا پڑے گی (مجمع البیان جلد ۳۔ صفحہ ۶۴)۔

جب مہمان کو نکال باہر کرتے ہیں

ایک شخص امیرالمومنین ؑ کا مہمان ہوا۔ کچھ دن کے بعد اس نے کسی دوسرے

شخص کے ساتھ اپنے جھگڑے کا معاملہ آپ کے حضور میں پیش کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: اب تک تم میرے مہمان تھے لیکن اب تم ایک مقدمے کے فریق بن گئے ہو اس لیے میرے ہاں سے چلے جاؤ کیونکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: دعوے کے کسی ایک فریق کو کبھی مہمان نہ بناؤ مگر یہ کہ جب دوسرا فریق بھی موجود ہو۔ مہمانی کا حساب الگ ہے اور فیصلے کا الگ۔ مہمانی ہمدردی کی بنیاد پر ہوتی ہے اور فیصلہ قانون کی بنیاد پر۔

اصولی طور پر ایسے جذباتی اور نفسیاتی کام سے دُور رہنا چاہیے جس میں یہ شبہ ہو کہ وہ قدرے قلیل بھی انصاف پر اثر ڈالے گا۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۸۔ صفحہ ۱۵۸)۔ امیرالمومنین ؑ ٹیکس جمع کرنے والے عمال کو نصیحت فرماتے ہیں کہ تم جس علاقے میں جاؤ پانی کے چشمے کے کنارے اپنے رہنے کا بندوبست کر لینا لیکن کسی کے گھر میں نہ ٹھہرنا کیونکہ تمھارا مہمان ہونا لوگوں سے ٹیکس وصول کرنے پر اثر انداز ہوگا (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۲۵)۔

ایسے آدمی پر قرآن کی سخت نکتہ چینی جو ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتا ہے

قرآنی آیات نازل ہوتی تھیں اور رفتہ رفتہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی اور بعض مسلمان بھی ہمیشہ اسلام کی تبلیغ اور لوگوں کو اس کی ترغیب دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک بار ایک تبلیغی جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں نامور لوگوں نے شرکت کی۔ ان لوگوں سے گفتگو کرنے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی

دعوت دینے کے عین بیچ میں وہاں ایک اندھا آدمی آگیا اور باتیں کرنے لگا۔ وہ اپنی باتوں کو دہراتا بھی جاتا تھا۔ اس اندھے آدمی کے اس عمل نے گفتگو کا سلسلہ کاٹ دیا جس سے جلسے کے خطیب کو سخت کوفت ہوئی اور وہ سخت بیزار ہوا۔ اسے یہ بات پسند نہ آئی کہ اس موقع پہ یہ اندھا وہاں آجائے اور اگر آ ہی گیا تھا تو کم از کم چپ تو رہتا۔ اگرچہ اندھے آدمی کے لیے ترش روئی اور خندہ پیشانی سے کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا تاہم قرآن سورۂ عبس کی آیات میں اس واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس جلسے کے مقرر کو تنبیہ کرتا ہے کہ اس نے تیوری کیوں چڑھائی اور کہتا ہے کہ تو کیا جانے ممکن ہے کہ اندھا آدمی ان تمام مشہور لوگوں کی نسبت باطنی صفائی اور حق کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو۔

امیرالمومنینؑ کے انصاف کی دوسری مثال

امیرالمومنینؑ کے بھائی عقیل اپنے بچوں سمیت جن کے چہروں کا رنگ بھوک سے اڑا ہوا تھا امیرالمومنینؑ کی خدمت میں پہنچے اور اپنی خستہ حالی کی وجہ سے بیت المال سے اپنے لیے زیادہ حصہ مانگا۔ قدرتی بات یہ ہے کہ ہر بھائی اپنے بھائی کے بچوں کو دیکھ کر متاثر ہوجاتا ہے لیکن امام علی علیہ السلام نے ان کا مطالبہ پورا کرنے سے قطعی انکار کردیا اور اپنے بھائی کو اس انکار کی وجہ سمجھانے کے لیے گرم کیا ہوا لوہا ان کے جسم کے قریب لاکر کہا جس طرح تم اس گرم لوہے سے ڈرتے ہو اسی طرح میں بھی قیامت کے عذاب سے ڈرتا ہوں (نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۱)۔

ایسا کام جو کوئی بھی نہیں کرتا

عام طور پر مشہور اور نامور لوگ اشیائے ضرورت خریدنے کے لیے یا تو خود بازار جاتے ہیں یا اگر کسی کو بھیجتے ہیں تو وہ دکاندار سے کہہ دیتا ہے کہ ہم فلاں شخص کے لیے مال چاہتے ہیں تاکہ وہ اچھی قسم کا مال دے اور قیمت بھی کم لگائے۔ اس معاملے میں ممکن ہے کہ رشوت یا اپنے منصب سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا جائے جس سے مسلمانوں کے بازار میں بیجا امتیاز کی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس میں اونچا طبقہ تو بہترین مال سستے داموں خریدے اور عوام معمولی قسم کے مال کے لیے زیادہ قیمت ادا کریں لیکن یہ صرف امیرالمومنینؑ ہی تھے جو کوشش کرتے تھے کہ یا تو ذاتی طور پر ایسے لوگوں سے مال خریدیں جو ان کو پہچانتے نہ ہوں یا اگر کسی کو بازار بھیجیں تو دکاندار کو پتا نہ چلے کہ وہ شخص کس کے لیے خریداری کر رہا ہے۔

امیرالمومنینؑ کی احتیاط کی دوسری مثال

امیرالمومنینؑ بیت المال کی تقسیم کر رہے تھے کہ آپ کا پوتا آیا اور کوئی چیز اٹھا کر لے گیا۔ ایسے موقع پر ممکن ہے کہ کوئی باپ اس معاملے سے چشم پوشی کر جائے لیکن امام علیہ السلام پریشان ہو کر بچے کے پیچھے دوڑے، اسے پکڑا اور بیت المال میں واپس لے آئے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ اس بچے کا بھی تو حصہ ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: نہیں۔ صرف اس کے باپ کا حصہ ہے اور وہ بھی ایک عام مسلمان کے حصے کے برابر۔ جس وقت اس نے حصہ لے لیا

توجتنا ضروری سمجھے گا اس بچے کو دے دیگا (حیات امام حسنؑ۔ باقر شریف قرشی جلد اول صفحہ ۳۸۸)

بلاشبہ اس قسم کی سخت احتیاط بیت المال سے متعلق تھی لیکن اپنا ذاتی مال بخش دینے میں امام علیہ السلام کی سخاوت اس حد تک تھی کہ معاویہ تک کا بیان ہے کہ اگر علیؑ کے پاس دو کمرے ہوتے، ایک گھاس سے اور دوسرا سونے سے بھرا ہوا تو آپ کے لیے دونوں کا بخش دینا برابر تھا۔

امیرالمومنینؑ پر بیجا اعتراض

طلحہ اور زبیر، اصحاب رسولؐ کے لیے خصوصی مراعات کے قائل تھے لہٰذا وہ کبھی کبھی بیت المال کی تقسیم پر اور دوسرے معاملوں میں امیرالمومنینؑ کے طریق کار پر اعتراض کرتے رہتے تھے۔ ایک بار انھوں نے امام علیہ السلام پر یہ اعتراض کیا کہ آپ ہم سے مشورہ کیوں نہیں کرتے؟

امام علیہ السلام نے اپنی مستعدی، لیاقت، انصاف اور کارگزاری بیان کرنے کے بعد فرمایا: کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ میں خلافت اور حکومت کی اجارہ داری چاہتا ہوں اور اس لیے تم سے مشورہ نہیں کرتا؟ خدا کی قسم میں منصب اور ریاست کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ تمھیں لوگوں نے مجھے گھیرا، میری بیعت کی اور حکومت میرے سپرد کر دی۔ میں نے بھی قرآن اور سنت رسولؐ کو اپنے سامنے رکھ لیا ہے اور ان کی رہنمائیوں کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ اب تک کوئی ایسا معاملہ میرے سامنے نہیں آیا جس کے بارے میں شریعت کا حکم نہ آیا ہو اور تم سے یا باقی مسلمانوں سے مشورے کی

ضرورت پڑی ہو۔اب اگر کبھی ضرورت پڑی تو تم سے بھی مشورہ کروں گا اور دوسروں سے بھی، مشورہ کرنے میں تم میں اور دوسرے مسلمانوں میں کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھوں گا (نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۳)

جھگڑوں وغیرہ میں انصاف

امیرالمومنینؑ نے محمد بن ابوبکر کو جو مصر میں آپ کے گورنر تھے یوں لکھا:
لوگوں پر اپنی توجہ اور نظر میں برابری رکھنا (نہج البلاغہ نامہ ۲۷) یعنی سب کو ایک نظر سے دیکھنا۔ یہ احتیاط اور انصاف اس وجہ سے ہے کہ سماج کے کمزور لوگ تمہارے عدل سے مایوس نہ ہو جائیں اور بڑے لوگ تم سے ظلم اور بے انصافی (ناحق طرفداری) کی امید نہ رکھیں۔ روایت میں ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب لوگوں سے بات کرتے تھے تو اصحاب میں اپنی نگاہیں منصفانہ طور پر تقسیم کرتے تھے (وسائل الشیعہ جلد ۸ صفحہ ۴۹۹)
اس باب میں اسلام اس قدر احتیاط برتتا ہے کہ اس نے ہدایت کی ہے کہ دعوتوں میں اگر تم نے کھانے سے پہلے مہمانوں کے ہاتھ حاضرین کی دائیں طرف سے دھلانا شروع کیے ہیں تو کھانا کھا چکنے کے بعد جب تم ہاتھ دھلاتے کو پانی لاؤ تو بائیں طرف سے شروع کرو تاکہ کھانے سے پہلے اگر ایک آدمی سب سے پہلے ہاتھ دھوئے تو کھانے کے بعد سب سے آخری آدمی سب سے پہلے ہاتھ دھوئے۔
آپ کو اس احتیاط اور انصاف کی مثال کس مکتب میں مل سکے گی؟

کاغذ کو کفایت سے استعمال کرو

امیرالمومنینؑ نے ایک گشتی چھٹی میں اپنے عمال کو یوں لکھا: اپنے قلم کی نوک تیز کر لو۔ لکھتے وقت سطروں کے درمیان فاصلہ زیادہ نہ رکھو۔ بیکار باتیں حذف کردو۔ عبارت آرائی کے بجائے اصل مطلب پر توجہ رکھو لمبی چوڑی تحریر اور زیادہ کاغذ خرچ کرنے سے بچو۔ یہ کاغذ بیت المال کا ہے اور بیت المال ایسا ضیاع برداشت نہیں کر سکتا (بحارالانوار جلد ۴۱ صفحہ ۱۰۵)

نہج البلاغہ کے خطبہ ۲۲۱ میں انصاف کی اہمیت اور ظلم سے اجتناب کے بارے میں امام علیہ السلام کا بیان بہت دلچسپ ہے۔ اس خطبے میں آپ مزید فرماتے ہیں: خدا کی قسم! اگر مجھے ہفت اقلیم ان چیزوں سمیت جو آسمانوں کے نیچے ہیں اس لیے دیدی جائیں کہ میں چیونٹی کے منہ سے جَو کا چھلکا چھین لینے کے برابر ہی خدا کی نافرمانی کروں تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم! اگر لوگ مجھے شام سے صبح تک تیز تلواروں پر لٹائیں تو یہ میرے لیے اس سے بہتر ہے کہ میں خدا اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ظالموں میں شمار کیا جاؤں۔

اپنے حقوق میں اضافہ کرانے کی کوشش

طلحہ اور زبیر امیرالمومنینؑ کی خدمت میں پہنچے اور کہنے لگے کہ حضرت عمر ہمیں باقی سب لوگوں سے زیادہ حصہ دیتے تھے۔ اس جملے سے انکا اشارہ اس طرف تھا کہ آپ بھی ہمارا حصہ بڑھا دیجیے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا:

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ لوگوں کو کیا دیا کرتے تھے؟ وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ تب آپ نے فرمایا: کیا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں میں یکساں تقسیم نہیں کیا کرتے تھے؟

وہ بولے جی ہاں!

امام علیہ السلام نے فرمایا: میں پیغمبرؐ کی سنت پر چلوں یا عمر کا طریقہ اپناؤں؟

وہ کہنے لگے: یقیناً پیغمبرؐ کی سنت اپنائیے!

اس کے بعد آپ نے فرمایا: پھر آپ لوگ زیادہ حصے کی توقع کیوں رکھتے ہیں؟

انھوں نے کہا: ہم سابق الایمان ہیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہماری رشتہ داری بھی زیادہ قریب کی ہے اور ہم اکثر تکلیفوں اور مصیبتوں میں ان کے ساتھ شریک بھی رہے ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: میں ان تینوں باتوں میں تم سے بھی مقدم ہوں کیونکہ میں تم سے پہلے رسولؐ پر ایمان لایا، پیغمبرؐ کا داماد اور چچیرا بھائی ہوں اور لڑائیوں میں بھی تم سے زیادہ تلوار چلائی ہے۔ خدا کی قسم! ان تمام خصوصیات کے باوجود اور جبکہ اسلامی حکومت کا سربراہ بھی ہوں، میرا حصہ اس مزدور کے حصے کے برابر ہے جو ادھر کام کر رہا ہے (بحار الانوار جلد ۴۱، صفحہ ۱۱۶)۔

منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ممانعت

امیر المومنینؑ نے اپنے دارالخلافہ کوفہ میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے کوفے والو! اگر تم یہ دیکھو کہ میں تمہارے شہر سے اس حالت میں نکلوں جو میری پچھلی حالت سے بدلی ہوئی ہو مثلاً میرا لباس اور غذا یا گھوڑا اور غلام تبدیل ہو گیا ہو اور میں نے اپنے عہدِ حکومت میں اپنے لیے خوشحال زندگی کا انتظام کر لیا ہو تو سمجھ لینا کہ میں نے حکومت میں تم سے خیانت کی ہے۔ جس زمانے میں آپ سب لوگوں کو روٹی اور گوشت دیتے تھے، خود گوشت کے بغیر روٹی کھاتے تھے۔ (بحار الانوار جلد ۴۱ صفحہ ۱۳۷)

اسلام میں مساوات کی ایک مثال

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معمولی لباس پہن کر اس طرح لوگوں میں آتے جاتے تھے کہ کبھی کوئی انجان شخص مسجد میں آجاتا تو آپ کو پہچان نہیں پاتا تھا۔ وہ بڑی دیر تک حاضرین کے چہروں کو دیکھتا رہتا اور آخر میں پوچھتا تھا: آپ لوگوں میں سے کون سے صاحب پیغمبرِ خدا ہیں؟

آپ اپنے اصحاب کے ساتھ ایک دائرے میں اس طرح بیٹھتے تھے کہ کسی نشست میں اونچ نیچ کا تعین نہیں ہو پاتا تھا۔ ہاں یہ ہمرنگی، سادگی اور بے تکلفی انبیاء کی خصوصیات میں سے ہیں۔

اقربا نوازی کی ممانعت

قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے جو مشہور قبیلوں میں شمار ہوتا تھا چوری کی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاہا کہ اس معاملے میں حکم خدا جاری فرمائیں۔ عورت کے گھر والوں نے جو اس عمل کو اپنی بے عزتی کا سبب سمجھتے تھے کوشش شروع کر دی اور اسامہ نامی ایک شخص کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوستوں میں سے تھا آپ کے پاس سفارش کے لیے بھیجا تا کہ اس عورت پر چوری کی حد جاری نہ ہو۔ آپ اس بات سے ناخوش ہوتے اور اسامہ سے فرمایا: کیا تم اس کا سبب بننا چاہتے ہو کہ حکم خدا جاری نہ ہو؟ پچھلی امتوں کی بدنصیبی اور تباہی کا سبب یہی تھا کہ جب خواص گناہ کرتے تھے تو ان کے متعلق خدا کا حکم نافذ نہیں کیا جاتا تھا لیکن عوام کے لیے خدا کی حد جاری ہو جاتی تھی۔ خدا کی قسم! اگر میری بیٹی فاطمہ (علیہا السلام) بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔ (صحیح بخاری اور صحیح مسلم منقول از روح الدین الاسلامی)

اسلامی حکومت میں حد جاری کرنیوالے بھی کوڑے کھاتے ہیں

اس غرض سے کہ اسلامی معاشرے میں پاک دامنی عام ہو اسلام نے شریفانہ لباس پہننے اور نہی از منکر اور امر بہ معروف کا حکم دینے کے علاوہ بوقت ضرورت لوگوں کے لیے جسمانی سزا کو بھی جائز قرار دیا ہے‘‘

اگرچہ یہ جسمانی سزا ان لوگوں کے بے آبرو ہو جانے کے مترادف ہے لیکن اگر کچھ لوگوں نے کھلے عام پاک دامانی کو داغدار کرنا، دین اور اس کے قوانین کو روندنا چاہا اور اپنے اس ناجائز عمل سے دوسروں کے لیے بھی راہ کھولنا چاہی تو پھر حتمی طور پر ان گستاخ لوگوں کو ان کے سنگین جرم کی سزا بھی عوام کی نظروں کے سامنے ہی دینا چاہیے بلکہ سزا دینا بجائے خود ایک عبادت ہے جو حکم خدا کے مطابق دی جائے اور جس میں کسی سے بدلہ لینے کا کوئی شائبہ نہ ہو چنانچہ ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ ایک عورت جو گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوئی تھی امیرالمومنینؑ کے حضور میں پیش کی گئی۔ امام علیہ السلام نے پوری تفتیش کے بعد فیصلہ دیا کہ حکم خدا جاری کیا جائے۔ قنبر جو آپ کے خیر خواہوں میں سے تھے اس حکم کو نافذ کرنے کے ذمہ دار قرار پائے لیکن انہوں نے غصے میں آکر تین کوڑے زیادہ لگا دیے۔ امام علیہ السلام کو جب اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے قنبر سے کوڑا لے لیا، انھیں زمین پہ لٹایا اور وہ تین زائد کوڑے ان کو بھی لگا دیے۔

بے شک یہ ہے عدل اسلامی کی دادگاہ کہ جس نے اس شخص کا محاسبہ بھی آئندہ کے لیے اٹھا نہیں رکھا جو برسوں امام علیہ السلام کی خدمت میں رہا جو اس وقت بھی حد جاری کرنے کا ذمہ دار ہے۔

معاوضۂ سکوت کی تجویز

ایک طویل عرصے کے بعد جب حکومت اسلامی اپنے اصل حقدار کے پاس آئی اور امیرالمومنینؑ نے زمام حکومت سنبھالی تو کچھ مسلمان جو ابھی تک

اسلام کی حقیقت نہیں سمجھ پائے تھے اور پیشہ ور سیاست دانوں اور بین الاقوامی سیاسی گرگوں کی طرح سوچتے تھے امام علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور کہنے لگے: حکومت نئی نئی ہے اور آپکو اپنی قوت جمانے کی سخت ضرورت ہے۔ ہم اس میں بھلائی سمجھتے ہیں کہ بیت المال سے کچھ رقم رئیسوں، سرداروں اور منظور نظر لوگوں میں تقسیم فرمادیجیے تاکہ اس سے ان لوگوں کی ممکنہ تخریب کاری کی روک تھام ہو جائے اور انھیں عدم مداخلت کا معاوضہ بھی مل جائے۔

خدا سے غافل اور علیؑ کو نہ پہچاننے والے ان سیاست مداروں کے جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم مجھ سے یہ امید رکھتے ہو کہ میں اپنی عادلانہ حکومت کی بنیادیں ظلم و ستم سے مضبوط کروں گا؟ کیا مشرکانہ اقدامات سے توحید کے مقصد تک رسائی ہو سکتی ہے؟ (وسائل الشیعہ جلد ۱۱ صفحہ ۸۰)۔ میں نے حکومت اس قسم کی ناانصافیاں اور بدعنوانیاں ختم کرنے کے لیے ہی قبول کی ہے اور اب تم مجھ سے یہ امید کرتے ہو کہ میں جو بدعملیوں کو دور کرنے کا ذمہ دار ہوں، خود ان کو عمل میں لانے کا مرتکب بن جاؤں؟

لوگوں کو اوصاف کی بناپر

زیادہ حصہ نہیں لینا چاہیے

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: مسلمان اسلام کے فرزند ہیں اور میں بیت المال کی تقسیم میں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا۔

بہ ظاہری خوبیاں اور باطنی کمالات مثلاً اسلام میں سبقت، علم میں برتری اور تقویٰ یا جہاد وغیرہ قیامت سے متعلق ہیں، بیت المال سے زیادہ حصہ لینے سے متعلق نہیں ہیں (وسائل الشیعہ جلد ۱۱ صفحہ ۸۱)۔ ایسا نظر آتا ہے کہ امامؑ کی یہ بات ان توقعات یا اس فکری روش کے جواب میں تھی جس کے مطابق کچھ لوگ منتظر تھے کہ ان خوبیوں کی وجہ سے جو وہ رکھتے ہیں، نظر خاص کے مستحق ٹھہریں گے اور بیت المال میں سے بڑا حصہ پائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ امامؑ نے اپنے مندرجہ بالا بیان میں اس بیجا امید اور فکری رجحان کی تغلیط فرمائی ہے۔

واقعی اگر ہم فضائل و کمالات اور چیدہ صفات کی وجہ سے لوگوں کو بیت المال میں سے زیادہ حصہ دیں تو گویا ہم دو خطاؤں کے مرتکب ہوتے۔

۱۔ ہم نے کمالات کی منزلت کی بہت تھوڑی قیمت لگائی۔

۲۔ ہم نے صاحب کمال لوگوں کا اخلاص ڈانواڈول کر دیا کیونکہ کمالات حاصل کرنے کی راہ میں ان کی توجہ مادی معاملات کی طرف مبذول کرا دی اور ظاہر ہے کہ اگر ہم باطنی صفات اور روحانی کمالات کا اندازہ مول چکانے اور بیت المال سے کم اور زیادہ ادائیگی سے لگائیں گے تو گویا کمال کو اور اس کی راہ پر چلنے والوں کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچائیں گے۔

امام علیہ السلام کی سخت نکتہ چینی

امیر المومنینؑ اپنے عمال کے کام کی نگرانی ذاتی طور پر کیا کرتے تھے اور ان

پر علانیہ اور خفیہ پرچہ نویس تعینات کرتے تھے۔ اس کے علاوہ خود عوام کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ پوری آزادی سے عمال کی کمزوریاں امام علیہ السلام تک پہنچائیں۔ انھیں شکایتوں میں سے ایک شکایت وہ تھی جو فارس میں آپ کے عامل کے خلاف پیش کی گئی۔ شکایت یہ تھی کہ وہ عامل اپنے عزیزوں اور دوسرے مسلمانوں میں امتیاز کرتا تھا اور انھیں زیادہ حصہ دیتا تھا۔ امامؑ نے اسے تنبیہہ کی اور لکھا: تم میں، تمھارے عزیزوں میں اور باقی مسلمانوں میں ذرا برابر فرق نہیں ہونا چاہیے (نہج البلاغہ محمد عبدہ مصری جلد ۳ صفحہ ۷۶)۔

حضرت عمر کو امام علیہ السلام کی تنبیہہ

امیر المومنینؑ نے ان نصیحتوں میں جو آپ حضرت عمر کو کیا کرتے تھے فرمایا: تین بنیادی مسئلوں پر بہت غور کیا کرو:

اوّل: وہ حدود جو تم نافرمانوں اور مجرموں پر جاری کرتے ہو، اس میں تم لوگوں کے درمیان کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھو۔

دوم: خوشی اور غصے کی حالت میں خدا کے حکم کے مطابق فیصلہ دو۔

سوم: بیت المال کی تقسیم میں کبھی کسی خاندان کی رعایت نہ کرو (وسائل الشیعہ جلد ۱۸ صفحہ ۱۵۶ منقول از الحیات جلد ۲ صفحہ ۳۸۷)۔

یعنی حکم خدا کو جاری کرتے وقت نہ نفسیاتی کیفیت (خوشی اور غصہ) کو، نہ خاندان اور قبیلے کو اور نہ باقی تعلقات کو پیش نظر رکھو۔

امیر المومنینؑ کچہری سے کیوں چلے گئے؟

حضرت عمر کا عہدِ حکومت تھا۔ ایک شخص نے قاضئ وقت کے ہاں امیر المومنینؑ کے خلاف نالش کر دی۔ دونوں فریق کچہری میں حاضر ہوئے۔ قاضی جیسے گفتگو کرنے بلکہ ان کی طرف دیکھنے اور نام لینے میں بھی دونوں افراد کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرنا چاہیے تھا، اس موقع پر امام علیہ السلام اور دوسرے فریق کے درمیان ان کا نام لینے میں امتیاز کرتا ہے۔ اس نے امام علیہ السلام کا نام احترام اور کنیت کے ساتھ لیا لیکن دوسرے فریق کو سادہ نام سے پکارا۔ امام ناخوش ہو کر کچہری سے چلے گئے اور فرمایا: قاضئ عادل کو مقدمے کے دونوں فریقوں میں کوئی فرق نہیں کرنا چاہیے تم نے ہمارے نام لینے میں امتیاز کیا اور مجھے زیادہ احترام سے پکارا۔ یہ اسلامی عدالت نہیں ہے (صوت العدالت الانسانیہ منقول از داستانِ راستان)۔

اس واقعہ میں دوسری بات یہ نظر آتی ہے کہ امام علیؑ جیسی شخصیت کی حاضری ایک گمنام شخص کے ہمراہ ہے اور کوئی خصوصی عدالت خاص وقت یا مخصوص قاضی یا خاص مقام منتخب نہیں کیا گیا۔ یہ بھی اسلامی انصاف کی عظمت کا نشان ہے۔

بحث اور عمل میں ضد

قرآن مجید کے مطالعہ میں ہم تمام موضوعات میں اس کی منصفانہ

روش کو دیکھتے ہیں اور تمام قوانین میں انصاف، میانہ روی اور غیر جانبداری کا انداز پاتے ہیں۔ ہم یہاں اس کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ جب وہ چاہتا ہے کہ الکحل اور شراب کو حرام قرار دے تو اس سے پہلے وہ اس کے اس مالی منافع کی طرف اشارہ کرتا ہے (جو شراب بنانے اور بیچنے سے ہاتھ آتا ہے یا اس کے طبی فائدے بتاتا ہے)۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ شراب کا نقصان اس کے ممکنہ عارضی فائدے سے کہیں زیادہ ہے (سورۂ بقرہ - آیت ۲۱۹)

۲۔ ان تمام خصوصیتوں کے باوجود جو اسلامی نظریے میں پائی جاتی ہیں اسلام پچھلی آسمانی کتابوں کو یکسر نظر انداز نہیں کرتا اور کہتا ہے: میں اپنے سے پہلے آنے والی توریت اور انجیل کی ان اصلی کتابوں کو مانتا ہوں جن میں ردوبدل نہیں کیا گیا ہے (سورۂ آل عمران - آیت ۳)۔ یہ انصاف کی ایک دوسری مثال ہے۔

۳۔ اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) کی ایمانداری کے سلسلے میں ان سب کو یکسر بُرا نہیں گردانتا اور کہتا ہے ان میں سے بعض اس قدر ایماندار ہیں کہ اگر آپ بہت سا مال بطور امانت ان کے پاس رکھوا دیں تو وہ خیانت نہیں کریں گے اور مال آپ کو جوں کا توں واپس کر دیں گے لیکن ان میں سے بعض اتنے ذلیل اور بے ایمان ہیں کہ اگر ایک دینار بھی ان کے پاس رکھوا دیں تو واپس نہیں دینگے (سورۂ آل عمران - آیت ۷۵) بموجب قرآن پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اعلان ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے ان کی دعوت قبول

نہیں کی حق اور انصاف پسندی کی مثال ہے۔

اسلامی روایات اور اخلاق نے یہ ہدایت کی ہے کہ علمی بات چیت میں بحث اگر انصاف کے دائرے اور سچائی کی تلاش سے باہر نکل جائے اور جھگڑا اپنی بات اونچی رکھنے تک کھنچ جائے تو فوراً بحث سے ہٹ جانا چاہیے چاہے اصلیت میں ہم حق پر ہی کیوں نہ ہوں۔

کافروں اور دشمنوں سے متعلق انصاف

اسلام میں نہ صرف عام حالات میں دوستوں سے بلکہ لڑائی کی حالت میں دشمنوں سے بھی انصاف کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

۱۔ اگر دشمن تم لوگوں کو قتل کرتے ہیں تو تم بھی انھیں قتل کرو۔ بے شک کافروں کی یہی سزا ہے (سورہ بقرہ۔ آیت ۱۹۱)۔ اس موقع پر قتل کرنا ہی انصاف ہے اور ایسا نہ کرنا بزدلی اور ناطاقتی ہے لیکن یہ دھیان رہے کہ حملہ کسی صورت میں تمھاری طرف سے نہ ہو بلکہ جس طرح کا وہ تم پر حملہ کریں تم ان کا ویسا ہی مقابلہ کرو۔

۲۔ جو شخص بے قصور اور مظلوم مارا جائے اسکے وارث کو ہم نے حق اور اختیار دیدیا ہے (کہ اگر چاہے تو قصاص میں مار ڈالے یا چاہے تو خون بہا لے لے) لیکن قتل ہونے والے آدمی کے وارثوں اور سرپرستوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بدلہ لینے یا مار ڈالنے میں تجاوز کریں (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۳)۔

یہ جاہلیت کے دنوں کے ایک تعصب کی طرف اشارہ ہے کہ جب

کسی خاندان کا کوئی شخص مارا جاتا تھا تو پورا خاندان اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور جب تک اس ایک شخص کے بدلے میں چند آدمیوں کو نہیں مار ڈالتے تھے چین نہیں لیتے تھے لیکن اس بیجا تعصب کے مقابلے میں قرآن انصاف کا حکم دیتا ہے اور کہتا ہے: قصاص اور بدلے میں زیادتی نہ کرو۔ تمہیں صرف اتنا حق حاصل ہے کہ اس قاتل کو کیفر کردار تک پہنچاؤ۔

امیرالمومنینؑ تلوار کا زخم کھانے کے بعد امام حسن علیہ السلام اور امام حسینؑ کو مختلف ہدایتوں کے ساتھ ساتھ یہ وصیت بھی کرتے ہیں: میری شہادت کی وجہ سے قتل عام نہ کرنا بلکہ صرف میرے اسی قاتل ابن ملجم کو قتل کرنا۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں: اس نے مجھ پر ایک وار کیا تھا، تم بھی اس پر ایک ہی وار کرنا (نہج البلاغہ وصیت ۴۷)۔ امیرالمومنینؑ اپنے خون میں لوٹتے ہوئے بھی انصاف کے دائرے سے قدم باہر نہیں رکھتے۔

۳۔ اسلام نے ایک وسیع قطعہ زمین کو حرم قرار دیدیا اور اس علاقے میں لڑائی کی قطعی ممانعت ہے۔ یہ آزادی کی سرزمین ہے یہاں تک کہ اس جگہ جانور کا شکار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ زمین سے گھاس بھی نہیں اکھیڑنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اگر اس علاقے میں دشمن تم پر حملہ کرے تو تم اپنا بچاؤ کرو اور اگر دشمن تم لوگوں کو قتل کرتا ہے تو تم بھی اسے قتل کرو اس لیے کہ کافروں کی سزا یہی ہے (سورہ بقرہ آیت ۱۹۱)۔

۴۔ اگر لوگوں نے تم پر زیادتی کی ہے تو تم بھی ان پر اتنی ہی زیادتی کرنے کا حق رکھتے ہو (سورہ بقرہ۔ آیت ۱۹۴)۔

۵۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ان مخالفوں کے ساتھ انصاف کو کام میں لائیں جنھوں نے تخریب، قتل، لوٹ مار اور اللہ کے بندوں کو دیس نکالا دینے میں شرکت نہیں کی۔ خدا ان لوگوں سے نیکی اور انصاف کرنے سے تمھیں منع نہیں کرتا جو دین کے معاملے میں تم سے نہیں لڑتے ہیں اور جنھوں نے تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ تم کو ان مخالفوں سے جو تکلیف نہیں پہنچاتے، عدالت اور انصاف کا برتاؤ کرنا چاہیے کیونکہ خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (سورۂ ممتحنہ۔ آیت ۸)

۶۔ ہم قرآن میں دوسرے مقام پر پڑھتے ہیں کہ: اگر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تم معاف نہیں کر سکتے اور بدلے پر تلے ہوئے ہو کہ ضرور سختی کرو گے تو اتنی ہی سختی کرو جتنی تم پر کی گئی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ پھر بھی اگر تم صبر کرلو تو بہتر ہے (سورۂ نحل۔ آیت ۱۲۶)۔

۷۔ ایک اور مقام پر قرآن کہتا ہے: کسی قبیلے کی دشمنی تم کو ناانصافی پر آمادہ نہ کردے (سورۂ مائدہ۔ آیت ۸)

۸۔ اگرچہ اس بارے میں بہت سی آیتیں موجود ہیں لیکن ہم ایک اور آیت کچھ وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس بیان کو ختم کرتے ہیں:

یہ آیت ایک واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں کو خیبر کے یہودیوں کے حالات معلوم کرنے کو بھیجا تاکہ ان کے بارے میں مسلمانوں کے طرزِ عمل کا تعین کیا جاسکے چنانچہ ان میں سے ایک یہودی نے اپنا مال ایک پہاڑ میں چھپا دیا پھر

وہ مسلمانوں کے استقبال کو آیا اور اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ کچھ مسلمانوں نے جلدی کی اور کہا کہ اس کا اسلام دھوکا اور بہانہ ہے۔ یہ اپنی جان کے خوف اور اپنا مال بچانے کی غرض سے ایسا کر رہا ہے اور آخر کار اسے مار ڈالا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو تاکہ اس طرح تم اسے مار ڈالو اور اس کا مال لوٹ لو (سورہ نساء۔ آیت ۹۴)۔ ایسے جلدی کے فیصلوں سے بچو البتہ اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ تم دشمن کے ہر قسم کے بہانے کو سچ سمجھ کر اس پر جلدی سے یقین کر لو اور اسے مان لو کیونکہ اس آیت کے آخر میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ایسے موقعوں پر تحقیق کرو۔ نہ قتل میں جلدی کرو اور نہ سادہ لوحی سے ہر بیان کو سچ مان لو بلکہ سچ کا راستا جو سماجی انصاف کو بچانے والا ہے یعنی چھان بین اور جانچ پڑتال کا راستا اپناؤ اور مخالفوں سے لڑائیوں اور مقابلوں میں ہمارا نظریہ اور سماجی انصاف یہ ہے کہ بے آزار لوگوں کیساتھ انصاف اور محبت ہو، تکلیف دینے والوں پر سختی کی جائے اور انھیں ویسی ہی سزا دی جائے۔

خوں بہا اور قصاص سماجی انصاف کے ضامن ہیں

اے عقلمندو! قصاص (کے قواعد مقرر کر دینے) میں تمھاری زندگی ہے (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۷۹) لغت میں قصاص کے معنی پیچھے آنے کے ہیں اور چونکہ مقتول کے وارث قاتل سے وہی سلوک کرتے ہیں بلکہ اصل

میں اسی کے عمل کی پیروی کرتے ہیں اس لیے ان کے عمل کو قصاص کہا جاتا ہے۔ ایامِ جاہلیت میں عربوں کا یہ معمول تھا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص قتل ہو جاتا تھا تو وہ طے کر لیتے تھے کہ جہاں تک ان کا بس چلے گا اس کا بدلہ لیکر رہیں گے اور ان کے سوچنے کا یہ انداز اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ ایک آدمی کے قتل کے بدلے میں پورے خاندان کا صفایا کر دینے میں مستعد رہتے تھے چنانچہ مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس نے قصاص کا منصفانہ حکم بیان کیا۔

اسلام میں قصاص کا قانون نہایت منصفانہ ہے کیونکہ وہ یہودیوں کی طرح صرف قصاص پر ہی بھروسا نہیں کرتا نہ آجکل کی مسیحیت کی طرح اپنے پیروکاروں کے لیے صرف معافی یا خوں بہا کا طریقہ تجویز کرتا ہے کیونکہ کبھی کبھی قصاص پر اصرار خرابیاں پیدا کرتا ہے، بنابریں اس کا لازمی ہونا عقل سے دور ہے مثلاً قاتل اور مقتول دونوں بھائی ہیں یا رشتہ دار ہیں تو ایسی صورت میں قصاص لینا خاندان کے لیے زیادہ غم و اندوہ کا موجب ہے، دوسری طرف صرف خوں بہا اور معافی کا قانون قاتل کو اور دوسرے مجرموں کو جرأت دلانے کا سبب ہے۔ لہٰذا اسلام نے اصلی حکم قصاص ہی کا رکھا ہے لیکن اس کے ساتھ معافی اور خوں بہا کا اصول بھی رکھا ہے اور مقتول کے وارثوں کو دونوں صورتوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنے کا اختیار دیدیا ہے۔

قرآن کا منصفانہ قصاص

ہم نے توریت میں یہودیوں پر یہ فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے

بدلے دانت اور زخم کے بدلے (ویسا ہی برابر کا بدلہ) زخم ہے۔ پھر جو ظالم کی خطا معاف کر دے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ (سورۂ مائدہ، آیت ۴۵)۔

بعض تفسیروں میں آیا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یہودیوں کے دو مشہور قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ مدینے میں رہتے تھے۔ بنی نضیر لاف زن تھے۔ اگر ان کا کوئی آدمی بنی قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تھا تو اس پر حد قصاص جاری نہیں ہو پاتی تھی لیکن جب قاتل بنی قریظہ میں سے ہوتا تھا تو اسے فوراً مار ڈالتے تھے۔

جب اسلام آیا تو اس نے یہ بیجا امتیاز ختم کر دیا۔ بنی نضیر نے جو اسلام لے آئے تھے، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ ایام جاہلیت اور لاف زنی کی روش برقرار رکھیں اور قصاص کا حق بھی اسی طرح یک طرفہ اور ان کے فائدے کے لیے رہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ درخواست منظور نہیں کی اور فرمایا: قصاص میں انصاف صرف اسلام ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ توریت میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے (تفسیر نمونہ۔ سورۂ مائدہ۔ آیت ۴۵)۔

اگر کوئی جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو قتل کرتا ہے تو مقتول کے ورثاء اس کے بدلے میں قاتل کی گردن مار سکتے ہیں۔ اگر کوئی چوٹ مار کر کسی کی آنکھ پھوڑ دے تو وہ بھی اس کی آنکھ پھوڑ سکتا ہے۔ ناک کے بدلے میں ناک اور کان کے بدلے میں مجرم کا کان کاٹنا جائز ہے۔ اگر کوئی کسی کا دانت توڑ دے تو وہ بھی اس کا دانت توڑ سکتا ہے اور جو آدمی دوسرے کو زخم لگاتا

ہے تو اس کا مقابل بھی بدلے میں زخم لگا سکتا ہے چنانچہ قصاص کا حکم منصفانہ طور پر نسل، سماجی طبقات، قبیلے اور شخصیتوں میں کسی قسم کا امتیاز کیے بغیر جاری ہوتا ہے۔

عبادت میں اعتدال

لازم ہے کہ ہم اس موضوع پر بھی توجہ کریں جس کی ہماری روایات میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے یعنی جس وقت آپ کی طبیعت مستحب عبادتوں کے لیے تیار نہ ہو آپ انھیں اپنے اوپر نہ لادیں اور کوشش کریں کہ عبادتوں کو خوشی خوشی اور دلی رغبت کے ساتھ ادا کریں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: عبادت کو اپنے اوپر نہ لادو (کافی جلد ۲، صفحہ ۸۶)۔

ہم دوسری حدیث میں یوں پڑھتے ہیں: عبادت کو خدا کے بندوں پر نہ لادو، خصوصیت کے ساتھ بچوں کی تربیت کے بارے میں ہدایت کی گئی ہے کہ انھیں زیادہ آزادی دو اور ان سے غیر واجب عبادت سختی سے ادا نہ کراؤ۔ اس سلسلے میں کئی دوسری حدیثیں بھی ملتی ہیں۔

تعریف اور تنقید میں انصاف و اعتدال

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اعتدال اور انصاف کے قیام کا مسئلہ مسلمان کی زندگی میں رچا بسا ہوا ہے۔ ان تمام باتوں میں جن پر گہری توجہ دینا چاہیے بیجا تعریف اور نارو انکتہ چینی بھی ہے جو فرد اور سماج پر برا اثر ڈالتی ہے۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں: اگر تم نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کر دی تو

تم خوشامدی اور چاپلوس ہو گئے اور اگر تعریف میں کسی کے حق میں کمی کر دی تو تم کوتاہ بیاں ہو یا حاسد جو تمھاری طبیعت دوسروں کی تعریف برداشت نہیں کر سکتی (نہج البلاغہ حکم ونصائح ۳۴۷)۔

چنانچہ ہمیں چاہیے کہ دوسروں کی تعریف میں انصاف اور اعتدال کا لحاظ رکھیں۔ امیرالمومنینؑ نے فرمایا: ملامت میں زیادتی کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم الٹا اثر لے لیتے ہیں کیونکہ ضد کی آگ شعلہ دینے لگتی ہے اور اس میں بھڑک اٹھنے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے (تحف العقول) والدین کو چاہیے کہ ان معاملات پر غور کریں کہ حد سے زیادہ محبت بچے کو خراب کر دیتی ہے۔ پیغمبر خدا نے فرمایا: آخری زمانے کی ماؤں اور باپوں پر افسوس ہے کہ ان کی زیادہ محبت اولاد کو خود پسند بنا دے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ بچے کو کم پیار ملے۔ ہم حدیث میں پڑھتے ہیں بچے والے کو چاہیے کہ وہ بچے کے ساتھ بچہ بن جائے اور کھیل کود، بات چیت اور محبت میں بچے کے ساتھ ساتھ رہے اور اس طرح اس کی نفسیاتی ضرورت پوری کرے۔

اخراجات اور خیرات میں اعتدال

اگرچہ اس مقام پہ ہماری بحث سماجی انصاف سے متعلق ہے لیکن قرآن اور روایات سے کچھ ایسی دوسری فائدہ مند باتیں حاصل ہوتی ہیں جو ہمارے موضوع سے غیر متعلق نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک اخراجات اور خیرات میں اعتدال کا مسئلہ ہے۔ اسلام نے باقی باتوں کی طرح اس بارے میں بھی درمیانی راہ اختیار کی ہے اور نیکو کار لوگوں کی تعریف میں یوں کہا ہے: وہ لوگ خرچ کرنے میں

نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ کنجوسی دکھاتے ہیں بلکہ ان کا خرچ اوسط درجے کا رہتا ہے (سورۂ فرقان - آیت ۶۷) - ایک مقام پر قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے: بخشش میں اپنے ہاتھ گردن سے نہ باندھو (یعنی کنجوسی نہ کرو کیونکہ جو ہاتھ گردن سے بندھ جائے گا وہ جیب تک نہیں جا سکے گا) اور نہ بالکل کھول دو کہ جو کچھ تمھارے پاس ہے سب کا سب دے ڈالو۔ ممکن ہے کچھ عرصے کے بعد تم خود محتاج بن جاؤ (سورہ بنی اسرائیل - آیت ۲۹)۔

ہماری روایات میں اَلْاِقْتِصَادُ فِی الْمَعِیْشَۃِ کے عنوان سے زندگی میں اعتدال پسندی کے مسئلے پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

گھر میں انصاف

اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم (متعدد بیویوں میں) انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو (سورۂ نساء - آیت ۳) پیغمبر اسلامؐ اپنی آخری عمر میں بھی جبکہ وہ بیمار تھے اپنی بیویوں میں انصاف کا خیال رکھتے تھے اور اپنا بستر ہر رات کو اس بیوی کے کمرے میں منتقل کروا دیتے تھے جس کی باری ہوتی تھی۔ بی بی عائشہ کہتی ہیں: پیغمبر خدا کسی بیوی کو دوسری بیوی پر ترجیح نہیں دیتے تھے اور ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔ روزانہ سب کے یہاں پہنچتے تھے اور خیریت پوچھتے تھے لیکن ہر ایک کے کمرے میں سونے کی باری ہوتی تھی۔ اگر کبھی باری بدلنا چاہتے تھے تو متعلقہ بیوی کی رضامندی لے لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ کہتی ہیں میں نے ذاتی طور پر اپنی باری کبھی کسی کو نہیں دی۔ امیر المومنینؑ کے ہاں جن دنوں دو بیویاں تھیں، اگر وہ وضو کرنا چاہتے

تھے تو جس کی باری نہیں ہوتی تھی اس کے گھر میں وضو بھی نہیں کرتے تھے۔ بلاشبہ انصاف کو بھی خون کی طرح سماج کی تمام رگوں اور تمام سطحوں میں ہونا چاہیے۔

کفایت شعاری میں اعتدال

اسلام میں کفایت شعاری کا نظام بھی اعتدال و عدالت کی بنیاد پر قائم ہے یعنی اس طرح کا طریقہ کار ہو کہ کسی کا حق نہ مارا جائے اور ہر حقدار اپنے کام یا اپنی ضرورت کے مطابق آرام دہ زندگی بسر کرے۔

کام کی مقدار

اسلام میں ہدایت کی گئی ہے کہ مختلف کاموں کے لیے اپنا وقت بانٹ لو۔ کچھ وقت کام کے لیے، کچھ عبادت کے لیے اور کچھ سیر و تفریح اور جائز طریقے سے لطف اندوزی کے لیے مخصوص کر دو تاکہ اس طرح تمام مادی اور روحانی ضروریات رفع ہو جائیں (نہج البلاغہ حکم و نصائح ۳۹۰) اگر ایک پہلو سے کسی کے کام کی مقدار اس حد تک پہنچ گئی کہ اس نے دوسرے کے لیے کام کرنے کا میدان تنگ کر دیا تو اسلامی حاکم اس پر پابندی عائد کر سکتا ہے مثلاً جن لوگوں نے میلوں تک پھیلی ہوئی بنجر زمین اپنی محنت سے آباد کی، وہ اس قانون کے مطابق اس کے مالک ہو جائیں گے کہ "جو بنجر زمین کو آباد کرتا ہے وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے" اگر زمین کا یہ آباد کرنا، دوسرے لوگوں کی محرومی پر منتج ہوتا ہے اور معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے تو اسلامی حکومت ان

لوگوں کی آباد کاری کو منصفانہ طور پر محدود کر سکتی ہے۔[1] کام کی نوعیت کے سلسلے میں بھی اسلام نے بے فائدہ، تباہ کن، حواس شکن اور ایسے ہی دیگر کاموں کی ممانعت کر دی ہے۔

تقسیم اموال میں انصاف

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: ملک کے سب سے دُور افتادہ مقامات کے لیے بھی ویسا ہی حصہ ہونا چاہیے جیسا سب سے نزدیک مقامات کے لیے ہو (نہج البلاغہ مکتوب ۵۳) ملک کا بجٹ عوام کے تمام طبقوں پر ایک سا صرف ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ جو لوگ راجدھانی سے زیادہ قریب ہیں انھیں زیادہ حصہ مل جائے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی طرح بعض نبیوں کا توحید اور نبوت کے بعد پہلا پیغام تقسیم میں انصاف اور کم تولنے والوں کو تنبیہ کا ہوتا تھا: لوگوں کا حق ادا کرنے میں پیمانے کو پورا کرو اور اس میں ذرا سی بھی کمی نہ رکھو۔ صحیح ترازو سے تولو اور جتنی مقدار چاہیے دیدو۔ اس میں ذرا سی بھی کمی نہ کرو اور کم تول کر روئے زمین پر فساد نہ پھیلاؤ۔ (سورۂ شعراء - آیات ۱۸۱ - ۱۸۳) ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں: ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی خرابی ہے جو اوروں سے ناپ تول کر پورا لیں اور جب ان کو ناپ تول کر دیں تو کم دیں (سورۂ مطففین - آیات ۱ تا ۳)۔

---

[1] اقتصادنا مولفہ آیت اللہ سید محمد باقر صدر رضوان اللہ علیہ۔

حصہ لینے اور خرچ کرنے میں انصاف

خرچ کرنے میں بھی انصاف کا خیال رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید چند آیتوں میں صاف صاف کہتا ہے: جب درختوں کے پھل پک جائیں تو کھاؤ اور محروموں کا حق بھی پھل توڑنے کے دن ہی دے ڈالو (سورۂ انعام۔ آیت ۱۴۱) دوسری جگہ کہتا ہے: کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو (سورہ اعراف۔ آیت ۳۱) وہ پاکیزہ غذائیں کھاؤ جو ہم نے تمھیں دی ہیں اور اپنا حصہ لینے اور خرچ کرنے میں طغیان اور تجاوز کا راستا اختیار مت کرو (سورہ طٰہ۔ آیت ۸۱)

امیر المومنین پرہیزگاروں کی نشانیوں اور خصوصیتوں کے سلسلے میں فرماتے ہیں: وہ لوگ سادہ لباس پہنتے ہیں (اصول کافی جلد ۲)۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: اگر لوگ کھانے میں میانہ روی سے کام لیں تو ان کے جسم مضبوط اور درست ہو جائیں (النظام التربوی فی الاسلام صفحہ ۳۰۷، منقول از فصول المہمہ)۔

کھانے کی مقدار کے علاوہ قرآن اس کی نوعیت پر بھی توجہ کر کے کہتا ہے: تمھارے کھانے کی غذا حلال، طیب اور دلپسند بھی ہونا چاہیے (سورۂ انفال۔ آیت ۶۹) اور اس کے حصول میں پرہیزگاری کا خیال رکھنا چاہیے۔

عدالت کی حفاظت کرنیوالے

پیغمبر، امام اور فقیہہ

چونکہ زندگی میں انسانوں کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں

اس لیے قدرتی طور پر جھگڑا اور الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر فریق یا تو اپنے آپ کو حقدار سمجھتا ہے یا جو کچھ وہ کہہ چکا ہے اس سے دستبردار ہونے کو آمادہ نہیں ہوتا۔ اس موقع پر اسلام نے قیام انصاف کے لیے لوگوں کو انبیاء کی طرف متوجہ کرایا اور کہا ہے : اگر تم میں کسی بات پر جھگڑا ہو تو خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرو۔ تمھارا رجوع کرنا خدا اور قیامت پر تمھارے سچے ایمان کی علامت ہے (سورہ نساء۔ آیت ۵۹)۔ یہ حدیث بھی قابل توجہ ہے جو کہتی ہے کہ "علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں" (ولایت فقیہ۔ آیت اللہ خمینی) جھگڑے کے موقعوں پر جبکہ انصاف کی راہ سے برگشتگی اور ایک دوسرے کے حقوق پر ناجائز تصرف کا خطرہ درپیش ہو تو منصف مزاج عالموں کے پاس جاؤ تاکہ وہ حکم خدا کے مطابق فیصلہ دیں۔ (ولایت فقیہ)

جو شخص جھگڑوں میں مرجع تقلید عالم کے پاس نہیں جاتا بلکہ اپنے مناقشے طاغوتی کچہریوں میں لے جاتا ہے اور ظالموں سے انصاف کی امید رکھتا ہے، اسے اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنا چاہیے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ قرآن کہتا ہے کیا آپ نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور ان خدائی احکام پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر اور آپ سے پہلے کے پیغمبروں پر نازل ہوتے ہیں لیکن عمل میں وہ طاغوت کی طرف جھکے ہوتے ہیں اور اپنے جھگڑوں کے حل کے لیے آپ کے پاس نہیں آتے۔ یہ لوگ بزعم خود اپنے آپ کو ایمان والے سمجھتے ہیں لیکن وہ ہرگز مسلمان نہیں ہیں کیونکہ ہم نے انھیں حکم دیا تھا کہ طاغوت کے نزدیک نہ جھٹکو اور اس سے برگشتہ رہو لیکن انھوں نے نافرمانی کی اور شاید اس پر کان نہیں دھرا۔ (سورہ نساء۔ آیت ۶۰)

فقیہ سماجی انصاف کی نگرانی کا ذمہ دار ہے

خدا نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری دائمی نیک بختی کا طریقۂ عمل پیغمبرِ اسلام کی سنت سے ہم پر واضح کر دیا۔ پیغمبر سماج کا رہنما عوام کے حقوق کا اور ہدایت کا ذمہ دار ہے۔ پیغمبرِ خدا کے بعد ان اماموں کی باری آتی ہے جو خوبیوں فضیلتوں، قابلیت اور عصمت میں انھیں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ عوام کی ہدایت اور رہنمائی کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ امامؑ کی غیبت میں وہ ذمہ داری فقیہوں اور اسلام شناسوں کے کندھوں پر ہے جو پورے انصاف، علمی لیاقت اور سیاسی بصیرت اور انتظامی قابلیت رکھنے کے علاوہ قرآنی آیتوں کی باریکیوں اور معصوم پیشواؤں کے اقوال سے خدا کا حکم نکال کر لاتے ہیں لیکن اس بارے میں انھیں کافی رسائی، وسیع علم اور اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل ہونا چاہیے تاکہ انھیں فقیہ کہا جا سکے۔

اس پیغام میں جو ہمیں امام مہدی آخر الزماں علیہ السلام سے پہنچا ہے تمام لوگوں کو یوں ہدایت کی گئی ہے: جو حوادث پیش آتے ہیں ان میں عجلت اور خود سری سے فیصلہ نہ کرو بلکہ عادل فقیہ کے پاس جاؤ جن کو تم نے ہوا و ہوس سے دور سمجھا ہے تاکہ وہ اس بارے میں تم کو خدا کا طریقہ اور اس کا حکم بتائیں (کتاب اکمال الدین منقول از ولایت فقیہ)

ولایت فقیہہ سماجی انصاف کی ضمانت ہے

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے: اگر خدا لوگوں کے لیے ایسا امام اور سرپرست مقرر نہ کرے جو حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے اور منصفانہ نگرانی کرے تو معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جائے (علل الشرائع جلد ا صفحہ ۱۷۲)۔ دوسری حدیث میں ہے: فقہاء پیغمبروں کے امانتدار ہیں (کتاب ولایت فقیہہ)۔ اس لیے منصفانہ نظام کے قیام کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ابو خدیجہ، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک معتمد صحابی ہے، جو امام کی طرف سے لوگوں کو یہ بتانے کے لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اپنے جھگڑوں میں انصاف کرانے اور خدا کا حکم معلوم کرنے کے لیے فقط عادل فقیہوں کی طرف رجوع کرو۔ صرف ایسے شخص کی عدالت میں جاؤ جو ہمارے بتائے ہوئے حلال اور حرام سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں تمہارے لیے ایسے ہی لوگوں کو قاضی کے نام سے مقرر کرتا ہوں (ولایت فقیہہ)۔

بعض اوقات سماج میں ایسے معاملات پیش آجاتے ہیں جن کے بارے میں قرآن یا حدیث میں واضح حکم نہیں ملتا لیکن ان کے مکمل نقوش، معیار، اصول اور قواعد فقیہہ کی دسترس میں ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ اس مسئلے کا حکم حاصل کر لیتا ہے[1]

---

[1] جب سماج اپنا سیاسی، اقتصادی یا حفاظتی توازن کھو بیٹھے تو فقیہہ سرپرستی اور نگرانی کے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے جو اسے حاصل ہے وقتی طور پر (جاری ہے)

حقوق کی ایک داستان
یا ایک فقہی قاعدہ

اسلام نے انسان کو جو آزادیاں دی ہیں ان میں سے ایک رہائش کی آزادی ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے کے گھر میں بلا اجازت گھس پڑے۔ قرآن کہتا ہے: اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہو (سورۂ نور۔ آیت ۲۷) لیکن سمرہ نامی ایک مداخلت کار خود پسند اور خود سر صحابی تھا جو وقت بے وقت ایک دوسرے صحابی کے باغ میں بے اجازت

اس توازن کو از سر نو بحال کرنے کے لیے ضروری احکام صادر کر سکتا ہے۔ بعض سودوں کو حرام قرار دے سکتا ہے شکر کشی کا حکم دے سکتا ہے، عارضی طور پر ٹیکسوں میں اضافہ کر سکتا ہے، کمپنیاں توڑ سکتا ہے جیسا کہ مرزا شیرازی نے جب دیکھا کہ ایران کی معاشیات تمباکو کے ذریعے برطانیہ کے قبضے میں چلی گئی ہیں تو انھوں نے تمباکو کی حرمت کا فتویٰ دیکر ایران میں برطانوی سامراج کے داخلے کا راستا بند کر دیا تھا۔ اسی طرح آیت اللہ خمینی نے فوجیوں کو چھاؤنیوں سے چلے جانے کا حکم دیدیا اور شاہ کو سلطنت سے الگ کر دیا۔ اس عمل کی ایک اور نظیر یہ ہے کہ امیرالمومنینؑ نے اپنے عہد حکومت میں گھوڑوں پر بھی زکات اور خراج عاید کر دیا تھا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھوڑوں پر زکات کیوں نہیں لگائی اور آپ نے کیوں مقرر کر دی تو آپ نے جواب دیا کہ میں مومنوں کا ولی ہوں اور امسال جو غیر معمولی صورت حال پیش آگئی ہے تو میں اپنی ولایت کا حق استعمال کر سکتا ہوں اور بیت المال کے لیے زیادہ رقم فراہم کرنے کی غرض سے گھوڑوں پر زکات مقرر کر سکتا ہوں (وسائل الشیعہ)۔

چلا جایا کرتا تھا اور اس کے بیوی بچوں کو گھورا کرتا تھا۔ اس غلط کاری کے لیے اس کے پاس بہانہ یہ تھا کہ اس باغ کے ایک کونے میں میرا بھی ایک درخت ہے جس کی دیکھ بھال کے لیے میں باغ میں جاتا ہوں۔

اس صحابی نے سمرہ سے کہا کہ درخت دیکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے البتہ اپنے آنے سے پہلے میرے بیوی بچوں کو اطلاع دیدیا کرو تاکہ وہ پردہ کر لیا کریں۔

سمرہ نے کہا: یہ ضروری نہیں ہے۔

باغ کے مالک نے رسولِ خدا سے اس مداخلت کار کی شکایت کر دی۔ آنحضرت ؐ نے اسے بلا کر سمجھایا لیکن اس صحابی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم اس درخت کا دوسرے درخت سے تبادلہ کر لو جو دوسرے مقام پر ہے وہ اس پر بھی تیار نہ ہوا۔ آپؐ نے فرمایا: تم اپنا درخت اس کے ہاتھ بیچ دو۔ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ آپؐ نے فرمایا: کم از کم اجازت لیکر ہی باغ میں جایا کرو لیکن اس نے یہ بات بھی نہ مانی۔ آپؐ نے فرمایا: اس درخت کو چھوڑ دو میں بہشت میں تمہارے لیے ایک درخت کا وعدہ کرتا ہوں۔ اس نے پھر بھی ضد کی۔ آپؐ سمجھ گئے کہ اس کا ارادہ نقصان پہنچانے اور سرکشی دکھانے کا ہے۔ آپؐ نے باغ کے مالک کو حکم دیا کہ اس صحابی کا درخت جڑ سے اکھاڑ پھینکو (وسائل الشیعہ جلد ۱۷ صفحہ ۳۴۰) لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ فِی الْاِسْلَام

انصاف سے پھر جانے کے اسباب

عام طور پر انصاف سے منہ موڑنے کے دو بڑے اسباب ہوتے ہیں۔ قرآن نے دونوں پر توجہ دی ہے: انصاف سے برگشتہ ہونے کا سبب اپنی

ذات، رشتہ داروں اور دوستوں کی محبت ہے۔ قرآن اس بارے میں کہتا ہے:
اے ایمان والو! انصاف پر پورے طور سے جم جاؤ اور تمہاری گواہیاں صرف
خدا کے لیے ہونا چاہئیں چاہے اس میں تمہارا یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں
کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ کسی کے غریب یا امیر ہونے کا معاملہ تمہارے گواہی
دینے پر کوئی اثر نہ ڈالے کیونکہ خدا اس کا زیادہ سزاوار ہے بہ نسبت اس کے کہ
ان کی حمایت کی جائے (سورۂ نساء۔ آیت ۱۳۵)۔ یعنی تمہاری ذمہ داری خاندان
یا مالی حیثیت کا لحاظ کیے بغیر صرف حق کو بچانا ہے۔

یہ آیت ان نازک تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ایسا نہ ہو وہ دوستیاں
اور جذباتی و خاندانی مسائل تم کو انصاف کی حد سے دور کر دیں۔

دوسرا سبب جس کے زیر اثر انسان انصاف کی راہ پر نہیں چلتا وہ ان تکلیفوں
کا مسئلہ ہے جو اسے کسی فرد یا گروہ سے پہنچتی ہیں۔ قرآن اس بارے میں بھی کہتا
ہے: اے ایمان لانے والو! تمہارا نصب العین پر خلوص انقلاب اور منصفانہ
شہادت ہونا چاہیے۔ کسی قبیلہ کی عداوت تمہارے انصاف سے دور ہو جانے کا
سبب نہ بنے اور تم اپنے پچھلے بدلے بھی نہ چکاؤ اور پھر حکم دیتا ہے کہ انصاف
سے کام لو کہ یہ تقویٰ کے بہت قریب ہے (سورۂ مائدہ۔ آیت ۸) اس آیت
میں تکلیفوں، شکایتوں اور دشمنیوں کے مسئلے پر خصوصی توجہ دی گئی ہے جن کا
ہمارے فیصلے اور عمل پر اثر پڑنا ممکن ہے۔

تیسرا سبب جو انسان کو انصاف کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے وہ
رشوت کا معاملہ ہے۔ قرآن اس سلسلے میں یوں تنبیہ کرتا ہے۔ آپس میں ایک دوسرے
کا مال ناحق نہ کھاؤ اور لوگوں کے مال کا ایک حصہ ناجائز طور پر کھانے کے لیے

اس کا ایک حصہ حاکموں کو نہ دو (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۸۸)۔ فرض کرو کہ قاضی تمہارے حق میں فیصلہ دیتا ہے لیکن تم جانتے ہو کہ یہ فیصلہ رشوت کی وجہ سے ہوا ہے اور اس مال پر قبضہ حرام ہے۔ قاضی کا ظاہری حکم اس شخص کے اس مال کا مالک ہونے کا جواز نہیں بنتا جو اپنی خلاف ورزی کو جانتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے: فیصلے کے لیے رشوت دینا خدائے بزرگ کی نافرمانی ہے (وسائل الشیعہ جلد ۱۲)۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے: خدا رشوت لینے اور دینے دلانے والے کو اپنی رحمت سے دور رکھتا ہے۔ واضح ہو کہ بعض لوگ اس غلط فعل کو دھوکا دینے والے ناموں مثلاً ہدیہ، پیشکش، نذرانہ، حق محنت، مزدوری اور رازداری کا انعام وغیرہ سے موسوم کر دیتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں نے اطلاع دی کہ آپ کے ایک حاکم نے ہدیے کی شکل میں رشوت لی ہے۔ آنحضرتؐ ناخوش ہوئے اور آپؐ نے اس سے فرمایا: جو تمہارا حق نہیں ہے وہ تم کیوں لیتے ہو؟

وہ بولا: جو کچھ میں نے قبول کیا ہے وہ صرف ہدیہ ہے۔ رشوت نہیں ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر تم گھر میں بیٹھے رہو اور میری طرف سے کسی مقام کے حاکم نہ ہو تو کیا لوگ تمہیں ہدیہ دیں گے؟

اسلام نے ہدایت کی ہے کہ قاضی خود بازار نہ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ قیمتوں میں رعایت انجانے میں قاضی پہ اثر ڈالے اور وہ اپنے فیصلے میں اس رعایت کرنے والے کی جانبداری کرے۔

وہ آیت جس نے پیغمبرؐ خدا کو بوڑھا کر دیا

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ ہود میں ایک ایسی آیت ہے جس نے مجھے بوڑھا بنا دیا اور وہ یہ ہے :

ثابت قدم رہو جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے۔ (سورۂ ہود۔ آیت ۱۱۲)

اس آیت پر غور کرنے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ثابت قدمی اور استقلال کی حقیقت کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ قرآن میں ایسی اور آیتیں بھی موجود ہیں جو پیغمبرؐ خدا کو صبر اور استقامت کا حکم دیتی ہیں۔ اس آیت کی خصوصیت جملہ "کَمَا اُمِرْتَ" (جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا) ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ کبھی استقامت، ضد اور جانبداری کی وجہ سے ہوتی ہے، خدا کے حکم کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ کبھی لوگوں کے طعنے ثبات قدم اور استقلال کی بنیاد ہوتے ہیں کہ کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ فلاں شخص ڈر گیا یا تھک ہار گیا اس لیے چھوڑ بیٹھا، کبھی مجبوری ہوتی ہے اور کسی کسی وقت قوت دکھانے کے لیے بھی ہوتی ہے۔

ان تمام موقعوں پر استقامت خدا کی نظر میں بیکار ہے کیونکہ وہ اصلیت کے دائرے سے باہر ہوتی ہے اور اس میں سے اس عمل کا خدائی پہلو غائب ہوتا ہے لہٰذا ہم قرآن میں پڑھتے ہیں : اور وہ لوگ جن کا صبر ثبات قدم اور استقلال صرف خدا کی خوشنودی کی خاطر ہوتا ہے۔ انتقام، شہرت طلبی اور تیرے میرے طعنوں کے ڈر سے نہیں ہوتا (سورۂ رعد۔ آیت ۲۲)۔

مختصر یہ کہ انصاف کرنا اور خدائی معیاروں کے مطابق چلنا سخت کام

ہے جس کے انجام دینے میں اولیاء اللہ خدا سے مدد طلب کرتے ہیں اور شاید قیامت کے پل صراط سے مراد جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے اور جس پر سے ہم سب کو گزرنا ہے دنیا کا خدائی راستا ہے جو سچ مچ بال سے زیادہ باریک ہے۔

سماجی انصاف کا قیام عوام کی نگرانی سے متعلق ہے

ہمارے ہاں گاڑیاں بائیں جانب چلتی ہیں تاکہ تمام ڈرائیور ایک دوسرے کی رفتار کی نگرانی کرتے رہیں چنانچہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک ڈرائیور نے کوئی خلاف ورزی کی ہے تو سب کے سب ہارن بجانے لگتے ہیں اور بتیاں جلا کر خلاف ورزی کرنے والے کو تنبیہ کرتے ہیں اور ان سب کے علاوہ پولیس دست اندازی کرتی ہے اور اس پر جرمانہ کردیتی ہے۔ پولیس کے بے خبر ہونے کی صورت میں لوگ خود ہی اس کے خلاف پولیس کو اطلاع دے دیتے ہیں۔ ان حالات میں بہت کم ڈرائیور خلاف ورزی کی جرأت کرتے ہیں۔ اوپر کی مثال ایک نمونہ تھا۔ اب اگر ہم چاہیں کہ سب لوگ تمام معاملات میں قانون اور انصاف کی حد سے باہر نہ نکلیں تو ہمیں چاہیے کہ ان دو قوانین یعنی **امر بالمعروف** اور **نہی عن المنکر** سے کام لیں۔ ہم کسی غلط عمل سے بے پروا نہ رہیں اور ہم میں سے ایک ایک آدمی جس طرح بھی کر سکے اپنے عمل کا اظہار کرے۔ اس طرح ہم خلاف ورزی کرنے والے کو مجبور کردیں اور اسے صحیح عمل کے دائرے میں لے آئیں۔

ہم اس دن کی آمد سے پرامید ہیں جب اسلام کا تمدنی انقلاب دنیا

کی تمام یونیورسٹیوں تک پہنچ جائے گا۔ یہ وہ دن ہوگا جب ایک مستند ڈاکٹر کسی مرض کی تشخیص نہیں کر پائے گا تو سچائی سے اعلان کردے گا کہ میں اسے سمجھ نہیں پایا اور ایمانداری سے طبی معائنے کی فیس واپس کردیگا۔ فقط یہی نہیں بلکہ وہ ایک بھائی کی حیثیت سے مریض کی رہنمائی کریگا اور اسے کسی ماہر خصوصی کے پاس بھیج دے گا۔ یہی وہ دن ہوگا جب ہمارے سماج میں سماجی انصاف کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔

نبوّت

الٰہی جہاں بینی اور دنیا اور انسان کی اس تفسیر میں جو ہمارے پاس ہے پیغمبروں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اگر اس کائنات کی کوئی غایت ہے اور یہ اپنے صحیح راستے پر چل رہی ہے تو ضروری ہے کہ انسان کا بھی جو اسی دنیا کا ایک جزو ہے کوئی ایسا ہی صحیح راستا ہو جو ہر قسم کی غلطی، لغزش اور کجی سے دور ہو اور وہی نبیوں کا راستا ہے۔ اگر انسان کا راستا ایسا نہیں ہو گا تو انسان دنیا کا بے جوڑ پیوند ہو جائے گا۔ اگر انسان کی پیدائش کا کوئی مقصد ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی منزل اور دائمی نیک بختی تک رسائی حاصل کرے۔ راستے کے مکمل نقشے اور کامل پتے کے بغیر یہ مقصد ممکن الحصول نہیں ہے اور انبیاء یہ نقشہ اور صحیح پتا دینے کے ذمہ دار ہیں، چونکہ انسان بھلکڑ ہے اس لیے اسے ایک خبردار کرنے والے کی بھی ضرورت ہے اور انبیاء

سماج کو ایسے ہی ڈرانے اور خبردار کرنے والے ہیں۔

اگر انسان ذمہ دار ہے اور اسے خدا کے دربارِ عدل میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے تو پھر اس کے لیے کسی احکام بیان کرنے والے اور ذمہ داریاں بتانے والے کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہیں خدا کے بھیجے ہوئے گرامی قدر پیغمبر۔

اگر انسان کو اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے تو اس کے سامنے کوئی مثال اور نمونہ بھی ہونا چاہیے چنانچہ انبیاء ہی انسان کامل کے بہترین نمونے ہیں۔

اگر انسان کو اپنے مستقبل کی فکر کرنا ہے تو کوئی ایسا شخص بھی موجود ہونا چاہیے جو اس کے لیے مستقبل کی تشریح کرے۔ اس قسم کی تفسیر اور نظریے سے بہرہ مند ہونے کے لیے بھی نبیوں ہی کا نقش قدم انسانیت کے قافلے کے سامنے آتا ہے۔

اس کے برعکس مادی جہاں بینی میں نبوت کا مسئلہ موجود نہیں ہے' کیونکہ اس نظریے کے مطابق زندگی کا پہلے سے مقرر کیا ہوا کوئی راستا اور مقصد نہیں ہے۔ انسان پہلے سے تیار کیے ہوئے کسی خاکے اور نقشے کے بغیر ہی پیدا ہوا ہے اور اسے کچھ وقت کے بعد مٹ جانا ہے۔

الٰہی جہاں بینی کی بدولت ہی نبوت کا مسئلہ ہم مسلمانوں کی زندگی کے اندر اپنے اصلی مقام پر موجود ہے یعنی انسانی اور اسلامی نصب العین تک پہنچنا جو صرف ایک ہی راستے سے ممکن ہے یعنی شک اور بھول سے پاک راستا اور وہ بھی وحی اور خدا کے لامحدود علم کے منبع کا راستا جو ہماری نیک بختی اور بدبختی کے تمام اسباب سے آگاہ ہے' وہ راستا جو انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور ہر قسم کی مفاد پرستی اور خود غرضی سے دور ہے' وہ ہے نبیوں کا راستا۔

ہم لوگ جو اس علم وہنر کی دنیا میں موجود ہیں اور لوگوں اور قوموں کی مختلف گمراہیوں اور جرائم کے گواہ ہیں کہ جب وہ نبیوں کے راستے پر نہیں رہے تو اپنے مقصد سے دُور جا پڑے۔ انھوں نے اپنی بہت سی ایجادوں اور دریافتوں سے ایک جہنم بھڑکا لیا ہے جس میں لوگوں کو پھونکے ڈالتے ہیں وہ لوگوں کو ظلم وجبر سے بچانے کی خاطر جو اجتماعات منعقد کرتے ہیں۔ ان میں ان کا ظالمانہ حق تردید (ویٹو) بھی نظر آتا ہے۔ دنیا میں لاکھوں بھوکوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کے بجٹ اسلحہ کی دوڑ میں صرف ہو رہے ہیں۔ آسائش کے مختلف وسائل کے باوجود کوئی سکون اور اطمینان نظر نہیں آتا اور سکون کے متلاشی لوگ اور گروہ، خودکشی، شراب خوری، خواب آور گولیوں اور منشیات کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر کیا اس سے انکار کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ اس دنیا میں انسان کو ایک معصوم رہبر اور سیدھے راستے کی ضرورت ہے۔

خدا کی صحیح پہچان نہ ہونے کی علامت

ہم نے جو عقل کی رہنمائی میں الٰہی جہاں بینی کا انتخاب کیا ہے اور یہ مان لیا ہے کہ تخلیق کا ایک مقصد ہے، وہ ایک معینہ راستے پر گامزن ہے۔ تمام موجودات خدا کی نگرانی میں انسان کی دسترس میں ہیں کیونکہ وہ اس کے استفادے کے لیے پیدا ہوئی ہیں، پھر ہم کس طرح یہ بات تسلیم کرلیں کہ خود انسان ـــــ خدا کا خلیفہ اور اشرف المخلوقات جو تمام موجودات میں اکیلا صاحب اختیار و انتخاب ہے ـــــ کسی راستے اور رہنما کے بغیر اس کائنات میں یونہی حیران پریشان اپنے حال پہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے

صحیح عمل کے لیے کوئی راستا نہیں بنایا گیا ہے اور کوئی رہنما اس کی رہنمائی نہیں کرتا۔ کیا یہ کج فکری معرفت الٰہی سے میل کھاتی ہے؟

ہم خود قرآن ہی سے اس کا جواب حاصل کرتے ہیں جو کہتا ہے: ایک گروہ نے خدا کی قدر جیسی لازم تھی نہیں جانی کیونکہ ان لوگوں نے کہا کہ خدا کسی کو وحی نہیں بھیجتا اور کوئی حکم نہیں دیتا (سورۂ انعام۔ آیت ۹۱)۔ واقعاً یہ کیسے ممکن ہے کہ خدائے دانا تمام موجودات کو تو انسان کے لیے پیدا کرے لیکن خود اس کو کسی لائحہ عمل کے بغیر اس کے حال پہ چھوڑ دے؟ کیا یہ کام خدا کی حکمت کے خلاف نہیں ہے؟ اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو اس نے واقعی خدا کو نہیں پہچانا ہے۔

انبیاء کا کام اور ان کی ضرورت ہم پر اس وقت واضح ہوتی ہے جب ہم آسمانی نظریے اور انسانی نظریات کا باہم موازنہ کریں، انسانی نظریات کی خامیوں سے واقف ہوں اور نبیوں کے نظریے کے تحت تربیت پائے ہوئے مثالی انسانوں کا دوسروں سے تعارف کرائیں۔

علم اور عقل کی ضرورت

اسلام علم اور عقل کو بہت اہمیت دیتا ہے یہاں تک کہ وہ عقل کو باطنی پیغمبر سمجھتا ہے اور اس نے جزا و سزا کا تعین عقل کی بنیاد پر کیا ہے۔ قرآن بار بار عقل کو کام میں لانے کا حکم دیتا ہے۔ اس نے بہت سی آیتوں میں بنیادی طور پر صرف سوچنے والوں اور عقل رکھنے والوں کو مخاطب کیا ہے۔ عقل کا تعارف کرانے میں اسلام نے بہترین مثالیں دی ہیں۔ وہ کہتا ہے

عقل وہ ہے جس کے ذریعے سے خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔ ہمارے معصوم پیشواؤں کی روایات میں عقل اور فکر کی اتنی تعریف کی گئی ہے کہ کم چیزوں کی اتنی قدردانی ہوئی ہوگی چنانچہ جس وقت امام کے سامنے ایک شخص کی کثیر عبادتوں کا ذکر آتا ہے تو امام فرماتے ہیں' وہ کس طرح سوچتا ہے ؟

حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں پہلے باب کو علم اور عقل کی توصیف کے لیے مخصوص کیا گیا ہے اور کسی دوسرے مکتب فکر نے اسلام کی طرح سے تمام لوگوں کے لیے علم حاصل کرنا لازم نہیں سمجھا۔ اسلام نے جاہلیت کے زمانے میں علم کی اہمیت کو جس طرح واضح کیا ہے' ویسا آج تک کسی علاقے کے کسی عالم نے نہیں کیا ہے۔ اگر آپ کوئی ایسا صاحب نظریہ شخص تلاش کر بھی لیں جو علم حاصل کرنے کی مدت کو گود سے گور تک' علم کے موضوع کو جانوروں سے لیکر آسمان تک' علم سکھانے والوں کو دوستوں سے لیکر اپنے مخالفین تک' اور اس کے مقام تحصیل کو اجرام فلکی کی مسافت تک وسعت دیتا ہو تو وہ بھی ہمارے علم اور عقل کو پیغمبروں سے بے نیاز نہیں کر سکے گا کیونکہ :

۱۔ انسان کا علم محدود ہے۔ روز بروز درسگاہوں اور علوم و فنون کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ انسان نئی نئی ایجادیں اور دریافتیں کر رہا ہے۔ انسان کو اس کے علم اور عقل پر چھوڑ بیٹھنا دراصل اسے پتھروں میں سرگرداں کرنا ہے کیونکہ انسانوں کی سمجھ' واقفیت اور فکر میں فرق ہوتا ہے۔ بہت سے جھگڑے اور خطرناک اختلافات عاقلوں اور عالموں سے شروع ہوتے ہیں۔ علم اور عقل جو اس قدر جھگڑوں کی پیدائش کا سبب ہیں وہ جھگڑے اور اختلافات کو کیسے دور کر سکتے ہیں ؟ ہر شخص

ایک نہ ایک ایسی چیز کو اچھا سمجھتا ہے جسے بہت سے دوسرے لوگ ایسا نہیں سمجھتے۔

بے شک انسان کی واقفیت کم ہے۔ نہ وہ ماضی کی صحیح خبر رکھتا ہے نہ مستقبل کی اور نہ اپنے کام کے فوری یا تدریجی ردعمل سے ہی اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ کہنے والے کتنی اچھی بات کہہ گئے ہیں کہ انسان کا علم اس کی جہالت کے مقابل ایسا ہے جیسے دریا کے مقابلے میں ایک بوند یا فضائے آسمانی تک پہنچنے کے لیے ایک چھوٹی سی سیڑھی۔ تمام ملکوں میں قوانین کی آئے دن کی تبدیلی اور ہر انسان کے ارادوں کی تبدیلی اس محدودیت کی دوسری واضح علامت ہے۔

۲۔ پہچان میں رکاوٹیں

پہچان کے موضوع میں ایک بحث اس میں پیش آنیوالی رکاوٹوں کے بارے میں ہے: انسان پرکھنے سوچنے اور سیکھنے کی قوت رکھنے کے باوجود اپنی بہت سی جبلتوں کے بھنور میں یوں پھنس جاتا ہے کہ حقیقت کو پہچاننے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں پہچان سے متعلق ان رکاوٹوں پر زیادہ توجہ دیگئی ہے۔ غصے، جنسی جذبے، تعلقات، جانبداریوں اور رجحانات میں سے ہر ایک صحیح پہچان کی راہ روک سکتا ہے اور انسان کو حقائق کے سمجھنے سے باز رکھ سکتا ہے۔

مثال

ایک سفر میں کچھ لوگ ریل یا ہوائی جہاز میں نظم و ضبط رکھنے کے لیے

ٹکٹ جاری کرتے ہیں لیکن یہ ٹکٹ منصفانہ اور حقیقت پسندانہ طور پہ اسی وقت جاری کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کے ذمہ دار فرد پر جذبات کا غلبہ نہ ہو ورنہ جب کوئی مسافر رقم زیادہ دیدے گا یا ٹکٹ دینے والے سے دوستی کا رشتہ رکھتا ہوگا جو علاقائی دلچسپی یا اس کی سماجی حیثیت کا ہو سکتا ہے تو پھر ٹکٹ منصفانہ طور پر جاری نہیں ہوگا۔ اگر ایک ریل یا ہوائی جہاز میں نظم وضبط رکھنے کے لیے واقفیت کی طرف کامل جھکاؤ اور ہر ایک سے بے تعلقی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ پورے انصاف کے ساتھ ٹکٹ جاری ہو تو ایسی قانون سازی جو سماج اور اس کی تمام سطحوں کے لیے ضروری ہے وہ کس طرح ایسے لوگوں کے سپرد کی جا سکتی ہے جن کو مختلف رجحانات اور تعلقات ہر دم ادھر اُدھر کھینچے پھرتے ہیں ؟

مختصر یہ کہ انسان قانون سازی کا حق اس لیے نہیں رکھتا کہ وہ خواہشات کا غلام ہے اور حقائق کو ہر جگہ ان کی اصل شکل میں نہیں دیکھ پاتا اور بہت سے موقعوں پر اپنی صحیح پہچان کھو بیٹھتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے: حکومت تو بس خدا ہی کے لیے ہے (سورۂ انعام۔ آیت ۵۷)۔ جب ہم اسلامی مجلس شوریٰ کو قانون ساز شعبہ کہتے ہیں تو اس سے حقیقت میں ہماری مراد قانون سازی نہیں بلکہ خدائی قوانین کی موجودہ دور سے مطابقت ہوتی ہے۔

۴۔ علم سمجھتا ہے لیکن صدیوں کے بعد

وقت گزرنے اور علم کے بڑھنے سے کبھی کبھی بعض حقائق تک انسان کی رسائی ہو جاتی ہے لیکن اس دسترس میں جو سیکڑوں سال کی تاخیر ہوتی اس گناہ کی

ذمہ داری ہم کس کے سر ڈالیں ؟ مثلاً یہ ثابت ہوئے تقریباً آدھی صدی ہوئی ہے کہ سوّر کا گوشت کھانا کدو دانوں اور ترشین کیڑوں (TAPE WORM) اور (TAENIA) کی پیدائش اور افزائش کا سبب ہوتا ہے۔ انسان اس بات کو سالہا سال کے بعد سمجھ پایا ہے لیکن جن لوگوں کو وحی کے ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ سوّر کا گوشت حرام ہے" وہ صدیوں سے اس کے نقصان سے محفوظ چلے آرہے ہیں۔ اسلام میں ایسے دسیوں احکام ہیں جن کی غایات پر سے وقت کی گزران اور علم کی ترقی نے پردہ اٹھایا لیکن نبیوں کے طرزِ فکر کے پیروکاروں نے پہلے ہی دن سے وہ راہ اختیار کر لی تھی جہاں اپنے علم اور تجربے پر بھروسا کرنے والے اسکالر صدیوں بعد پہنچ پائے۔

۴۔ انسان اپنے علم، عقل، مشورے اور غور و فکر سے صرف محسوس اور مادی مسئلوں میں قدم بڑھاتا اور کوئی راستا اختیار کرتا ہے لیکن دائمی نیک بختی، باطنی ترقی اور روحانی تربیت کے لیے جس کی پہچان سے انسان قاصر ہے وحی اور نبیوں کے طریقے کے سوا ہمارے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔

۵۔ ان لوگوں کے سوچ کے برعکس جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی رہنمائی کے لیے ضمیر ہی کافی ہے اور ہمیں نبیوں کی رہنمائی کی مزید ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ضمیر ہمارا اور ہمارے معاشرے کا بہت زیادہ پابند ہے۔ وہ ماحول اور رسم و رواج کا اثر قبول کر لیتا ہے اور حقائق کا پتا نہیں دیتا۔ عادت اور ماحول کے زیرِ اثر رفتہ رفتہ انسان اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کڑوے سگار کے پینے سے بھی لطف لینے لگتا ہے جسے ہر روشن ضمیر پہلی بار مسترد کر دیتا ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو

جانتے ہیں جو کسی پرندے کا سر کاٹنے سے خوف کھاتے تھے اور ان کا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن پرندوں کو بار بار ذبح کرنے کے عمل نے ان کے اس جذبے اور ضمیر کی کیفیت کو تبدیل کر ڈالا۔ اس صورت میں ضمیر پر کیونکر بھروسا کیا جا سکتا ہے جبکہ ہر فرد کے ضمیر کا فیصلہ ایک الگ حکم رکھتا ہے اور بڑی حد تک ان کے علم اور واقفیت کا پابند ہوتا ہے مثلاً ہم لوگ جنھوں نے کسی شخص کو جرم اور گناہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، اگر یکایک اسے آنکھیں بند کیے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا دیکھیں تو ہماری حالت عجیب سی ہوگی لیکن عدالت کے اس قاضی کے جذبات ہمارے جیسے نہیں ہوں گے جو اس شخص کی ناقابل معافی خلاف ورزیوں کی روبکاری دیکھتا رہا ہے۔ اس کے باوجود ہم اصلی اخلاقی اور فطری ضمیر اور اس کے اثر سے انکاری نہیں ہیں۔ امیرالمومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "نبی آئے تاکہ اس انسانی فطرت کو زندہ اور عیاں کریں" لیکن ہماری بحث اس بات سے ہے کہ کیا صرف ضمیر کی رہنمائی پر انحصار کیا جا سکتا ہے؟ اسکا جواب نفی میں ہے۔

۶۔ چھٹی بات جو انسان کے لیے انبیاءؑ کی ضرورت کو واضح اور انسانی قوانین پر ہمارے اعتماد کو کم کرتی ہے وہ کچھ فطری شکوک ہیں جو ہر انسان کے سامنے موجود ہیں مثلاً ان لوگوں نے اپنے علم اور عقل پر بھروسا کر کے ہمارے لیے قانون بنائے ہیں تو:

الف: انھوں نے انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں کو کس طرح سمجھ لیا اور

انسان کی ضرورت کو کیسے جان لیا؟

ب : انھوں نے اپنے اندر انسان کی خیر خواہی کا جذبہ کس طرح پیدا کر لیا ہے؟

ج : وہ جو قانون اور طریقۂ عمل پیش کرتے ہیں اس میں انھوں نے بھول اور غلطی کیوں کر نہ کی ہوگی؟

د : انھوں نے کسی فرد یا کسی گروہ کا مفاد کیسے سامنے نہ رکھا ہوگا اور اپنے ماحول یا خاندانی قبائلی اور اقتصادی نظام کے زیر اثر اپنی صحیح پہچان کا راستا کیسے نہیں بدلا ہوگا؟

ہ : ان کے بنائے ہوئے قاعدوں کا ردِ عمل جلدی یا دیر سے فرد یا سماج کے لیے کیسے مضر نہیں ہوگا؟

ایسے بہت سے شکوک ہیں جو انسانی حقوق کے حامیوں اور سماجی انصاف کا دم بھرنے والوں کی غلط کارکردگی کی موجودگی میں اب یقین سے بدل گئے ہیں اور ہم نے خوب سمجھ لیا ہے کہ انسانی حقوق کے ان حامیوں اور طرفداروں نے محرومین اور مستضعفین کی نجات کے لیے کوئی نمایاں اور کارگر قدم نہیں اٹھایا ہے۔ ان کی اس کارکردگی اور اس سے حاصل ہونے والے تلخ تجربے کی موجودگی میں انسانی قوانین کے اجرا سے شاید ہی کوئی مطمئن ہو سکے گا اور اگر اتفاقاً ان قوانین پر کچھ علاقوں میں عمل درآمد ہوتا بھی ہے جو ان سیاست مداروں اور انسانی حقوق کے ٹھیکیداروں نے وضع کیے ہیں تو یہ محض مادی زندگی کو جاری رکھنے کی غرض سے ہوتا ہے یا حکومت کے عتاب اور جرمانے کے ڈر سے ورنہ انبیاء کے مکتب فکر کے علاوہ دوسرے مکاتب فکر اور قوانین کے ماننے والے ان پر عمل کرتے وقت اپنے باطن میں

عشق، جوش اور پاکیزگی کا کوئی احساس نہیں کرتے۔

واقعی وہ انسان جو آزاد پیدا ہوا ہے اور دنیا میں آزاد آیا ہے، آج تیرا میرا زر خرید غلام اور فرمانبردار کیوں ہو؟ بے شک انسانی قوانین کے بارے میں یہ مسائل اور شکوک انسان کے اندر ان پر عمل کی لگن اور جوش کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ یہ بدگمانی اور بے تعلقی خاص طور پر اس وقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب ایک انسان ان قوانین پر عمل کرنے کی کسی طرح سے حوصلہ افزائی نہیں پاتا کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ جب ان قوانین پر عمل کرنے سے انحراف کیا جاتا ہے تو عدالتیں اور مختلف محکمے باز پرس اور جرمانے کرنے کے لیے فوراً تیار ہو جاتے ہیں لیکن دوسری طرف جب وہ مدت العمر ان قوانین پر عمل کرتا رہتا ہے تو اسے اس پر کوئی جزا ملتی نظر نہیں آتی۔ یہ بات آسمانی قوانین کے برعکس ہے۔ جنھوں نے اگر قانون شکنوں اور گنہگاروں کے لیے عبرتناک سزا مقرر کی ہے تو پرہیزگاروں اور اطاعت گزاروں کے لیے آخرت کا انعام بھی رکھا ہے۔ نبیوں کے مکتب فکر میں انسانی کوششوں کی یہاں تک قدر افزائی کی گئی ہے کہ اگر ایک شخص کسی نیک مقصد کے لیے چند قدم چلتا ہے تو اس کی بھی جزا پاتا ہے۔ نبیوں کے طریقے کی یہ ایک اور خصوصیت ہے۔

مثال

ایک میزبان کا تصور کیجیے جس نے کچھ لوگوں کو اپنے ہاں ایک ضیافت میں بلایا ہے لیکن ایک طرف تو وہ مہمان، میزبان کے گھر کا راستا نہیں جانتے اور

دوسری طرف اس راستے کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی اور ٹیڑھی ٹیڑھی اور بھی پگڈنڈیاں ہیں اور راستے سے بھٹکانے والے لوگ ہیں۔ پھر درندے اور اندھیری رات بھی۔

اس مثال میں صرف مندرجہ ذیل دو صورتیں ہی ممکن ہیں:

۱۔ میزبان مہمانوں کو نظر انداز کردے اور کھانا نہ پکوائے۔ اگر پکوالیا ہے تو اسے پھینک دے۔

۲۔ ایک ہمدرد راہ شناس آدمی کو ہتھیار اور چراغ دیکر مہمانوں کی راہنمائی کے لیے بھیجے کیونکہ اس کے بغیر دعوت بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

اب یہ مثال واضح ہو گئی ہے تو ہم بحث کے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ جس خدا نے پوری کائنات انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی اور ہم سب کو دائمی خوش بختی اور اپنی عبادت کی طرف بلایا ہے تو اس وجہ سے کہ ہم راستا نہیں جانتے یا شک میں پڑجاتے ہیں اور ٹیڑھے راستوں، شیطانی وسوسوں اور طاغوتوں کے ساتھ چلتے چلتے شرک، جہالت اور اختلاف کے اندھیروں میں گھر جاتے ہیں اور بعض اوقات بیچ میں بھٹک جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ میزبان جو خدائے بزرگ ہے، پیغمبرؐ اسلام جیسے رہنما کو معجزے کے چراغ کے ساتھ ایک ہاتھ میں قرآن جو راستے کے مکمل نقشے اور منزل کی کامل معرفت پر مشتمل ہے اور دوسرے ہاتھ میں قوت اور تلوار دیکر ہماری ہدایت کے لیے نہ بھیجے تو ہماری مہمانی کی یہ بساط اور ہماری وہ دعوت جو خدا نے کی ہے بے معنی ہو جائے۔ نیز پیغمبروں کے بھیجنے کا اصل مقصد انسان کو اس کے حقیقی ارتقاء کی جانب سرگرم سفر کرنا

ہے اور سفر کے لیے سمت، آغاز، راہ اور منزل کے ساتھ ساتھ سفر کے ذریعے اور رہنما کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور تمام ضرورتوں میں رہنما کی ضرورت سب سے اہم ہے کیونکہ اگر رہبر نہ ہو تو ہم غلط وسیلے اختیار کر بیٹھیں اور اپنے راستے اور منزل کو بھی بھول جائیں۔ اس بنا پر پیمبروں کی تعلیم کا عنوان یہ ہے کہ کائنات انسان کے لیے پیدا ہوئی اور انسان خدا کی جانب سفر کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ ارتقاء اور سفر روحی کی اساس پر نبیوں کے بتائے ہوئے طریقے کے علاوہ کسی بھی طرح سے مکمل طور پہ اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔

علم کے کام اور نبیوں کے کام کا فرق

ہم نے اپنی سابقہ گفتگو میں کہا ہے کہ انسانی علم نبیوں کا سا کام نہیں کرتا۔ اب ہم ان تمام باتوں کا نچوڑ عام فہم اور مختصر الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

- علم فطرت کو کنٹرول کرتا ہے اور انبیاءؑ انسان کو۔
- علم ہمیں آلات و وسائل بخشتا ہے اور نبی ہمیں مقصد عطا کرتے ہیں۔
- علم ہمیں تیزی دیتا ہے، انبیاءؑ ہمیں جہت بخشتے ہیں۔
- علم صرف ظاہری تبدیلی کی بنیاد رکھتا ہے نبی باطنی تبدیلی بھی کرتے ہیں۔
- علم وسعت بخشتا ہے، انبیاء عظمت اور بلندی عطا کرتے ہیں۔
- علم صرف چراغ ہے اور مذہب چراغ بھی ہے اور راستا بھی۔
- اہل علم کے فکر و نظر میں تضاد ہوتا ہے لیکن تمام نبیوں کی سمت ایک ہی ہے۔

کبھی کبھی علم محض خیال پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی انسان خیال کرتا ہے کہ وہ سمجھ گیا لیکن اسے بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھا ہے لیکن وحی میں خیال کو کوئی دخل نہیں ہے۔

غرض یہ کہ ہم اپنے زمانے میں دیکھ رہے ہیں کہ علم روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے لیکن جرائم کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہو رہی۔

آپ جب بیمار پڑتے ہیں تو اپنے آپ کو طبیب کے اختیار میں دے دیتے ہیں اور اپنی کار خراب ہوتے پر مکینک کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس کا سبب بھی ظاہر ہے کہ طبیب آپ کے بدن کے بارے میں اور مکینک آپ کی کار کے بارے میں آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے حالانکہ وہ آپ کی نسبت ان کے ساتھ آپ سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتا۔ چنانچہ ہمیں لازم ہے کہ زندگی کے لیے کوئی راستا اختیار کرنے میں اپنے آپ کو خدا کی راہ اور نبیوں کے طرزِ فکر کے سپرد کر دیں، اس لیے کہ خدا ہمارے متعلق خود ہم سے بھی زیادہ واقف اور مہربان ہے بقول قرآن: کیا وہ لوگ اب بھی جاہلیت کے زمانے کا سا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ خدا سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں (سورۂ مائدہ۔ آیت ۵۰)۔

خدا ہم سے زیادہ واقف ہے کیونکہ اس نے ہمیں بنایا ہے اور ہر چیز کا بنانے والا اپنی بنائی ہوئی چیز کی پوری اور کافی معلومات رکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: کیا وہ جس نے پیدا کیا نہیں جانتا ہے؟ (سورۂ ملک۔ آیت ۱۴)۔

شہید نواب صفوی سے ایک عمدہ مثال نقل کی جاتی ہے۔ وہ کہتے تھے آپ جو چیز جس کارخانے سے خریدتے ہیں، ضروری ہے کہ وہی انجینئر جس نے اسے تیار کیا ہے اس چیز کے استعمال کا طریقہ بتائے۔ اس میں دوسروں کو

حکم جاری کرنے کا حق نہیں ہے۔ انسان کی حیثیت بھی کسی کارخانے کی مصنوعات سے کم نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لیے بھی خدا ہی قانون بنائے جو اس کا بنانے والا ہے۔ اس کی تمام مادی اور روحانی ضروریات سے آگاہ ہے اور اس کے آئندہ اور ہمیشہ کے راستے سے باخبر بھی ہے۔

ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی کے لیے ایک راستا منتخب کرے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ یہ راستا کس طرح معلوم کرے:

۱۔ اپنی سمجھ یا ذاتی رجحانات کے مطابق کوئی راہ اختیار کرے۔

۲۔ اپنے لیے دوسروں کی راہ کا انتخاب کرے۔

۳۔ اس راہ پر چلے جو انبیاءؑ خدا کی طرف سے لیکر آئے ہیں۔

اگر ہم اس معاملے پر تھوڑا سا غور کریں تو وہ اس تیسری راہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کیونکہ ہمارا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہم نے کتنی ہی بار راہ کا انتخاب کیا ہے اور بعد میں ہمیں اپنی غلطی کا پتا لگا تو ہم نے راہ بدل لی۔ آپ کوئی آدمی ایسا نہیں دکھا سکتے جو اپنی عمر میں اپنے کیے پر ہزار ہا مرتبہ نہ پچھتایا ہو۔ ہمارے علم کی کمی اور جذبات، ماحول اور جبلتوں سے ہماری عقل کے متاثر ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی پہچان پر بھروسا نہ کریں اور اس دلیل کی رو سے اوپر بیان کیا ہوا پہلا راستا اختیار نہ کریں۔

ہمارے لیے دوسروں کا راستا بھی کوئی وقعت نہیں رکھتا کیونکہ وہی علم کی کمی، عقل کی اثر پذیری اور جبلتوں کا طوفان جو ہمارا راستا بدلوا دیتا تھا ان کی راہ میں بھی کجی پیدا کر سکتا ہے۔

اب واحد راستا وہی رہ جاتا ہے جو خدا کے لامحدود علم کے سرچشمے سے

وحی کے ذریعے اور معصوم پیغمبروں کے واسطے سے ہمارے لیے کھولا جاتا ہے۔

کیا ہم نبیوں کی پکار سے بے پروا رہ سکتے ہیں؟

ہمیں بہت سی دلیلیں نبیوں کی تلاش میں لے جاتی ہیں جن کی ایک مثال ہم اس جگہ نقل کرتے ہیں۔

۱۔ طولِ تاریخ میں پیغمبروں نے بڑے انقلابات برپا کیے اور منزل شہادت تک بڑھتے چلے گئے۔ ان مقدس ہستیوں کے کارہائے نمایاں دوست، دشمن سب پر اس طرح آشکار تھے کہ دشمنوں نے بھی کبھی ان کو گناہ اور غلطی سے نسبت نہیں دی۔ انھوں نے اپنے نظریے کے حق میں بہت سے واضح دلائل پیش کیے، معجزے دکھائے اور اپنے سچے پیروکار بھی پیدا کیے۔ اگر ہم نبیوں کی ان تمام تحریکات کو احساس ذمہ داری اور عذاب الٰہی سے خوف پر مبنی قرار دیں، تو بھی ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم اپنی راہ بدل دیں اور نبیوں کا راستا اختیار کرلیں کیونکہ ہم طالب علموں کے قول کے مطابق امکانی نقصان کا دور کرنا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ "نقصان کا امکان کم ہے" کیونکہ سرکش افراد کے خیال میں یہ امکانی نقصان کتنا ہی کم کیوں نہ ہو چونکہ وہ سخت اور دائمی عذاب کا امکان ہے، وہ ہماری عقل کو ان بزرگ ہستیوں کے راستے کی تحقیق اور اپنی راہ کی تبدیلی پر لگا دیتا ہے۔

۲۔ ہمیشہ سے لوگ یہ کہتے آئے ہیں کہ ہم بے ادبوں سے ادب سیکھیں اور انھوں نے جو کچھ کیا ہے ہم اس کے خلاف کریں۔ یہاں اگر ہم انبیاءؑ کے دشمنوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ پرانے زمانے میں ابولہب، ابوجہل

اور ابوسفیان مخالف تھے اور آج بڑی طاقتیں انبیاءؑ کی راہ کی بہت سخت مخالف ہیں۔ ہم ان شیطانی قوتوں کی مخالفت سے انبیاءؑ کے راستے کی سچائی کا سراغ پاتے ہیں۔

۳۔ تیسری بات جو انبیاءؑ کے راستے پر چلنا ہمارے لیے ضروری قرار دیتی ہے یہ ہے کہ خوبی اور اچھائی کی قدردانی کا جذبہ انسان کی فطرت میں چھپا ہوا ہے لہٰذا اگر انسان خدا کی نعمتوں پر نظر ڈالے اور یہ احساس کرے کہ اس نے مادی اور روحانی نعمتوں کے سمندر میں غوطہ لگایا ہے تو وہ فوراً یہ احساس کرے گا کہ ایسی راہ پر چلنا چاہیے جو ان تمام نعمتوں کے مالک نے مقرر کی ہے۔ خصوصاً جب ہم اس حقیقت کو نظر میں رکھیں کہ اللہ نے کسی قانون ساز انسان کے برعکس کبھی اپنی ذات یا کسی خاص طبقے یا گروہ کا مفاد مدّنظر نہیں رکھا اور ہماری حقیقی بھلائی کے علاوہ اسے اور کچھ منظور نہیں رہا۔ خدا حق کی پیروی اور قدردانی کے احساس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اب جو خدا نے تم کو بھوک اور خوف سے چھٹکارا دیا ہے تو اس کی قدردانی کرو اور اس گھر (کعبے) کے مالک کی عبادت کرو (سورۂ قریش۔ آیت ۳۔۴)

انبیاءؑ کا راستا انسان کی پرانی خواہش ہے

انسان فطری طور پر اس قانون کی حمایت کرتا ہے جو مکمل طور پر منصفانہ ہو وہ ایسی حکومت کا شیدائی ہے جو کسی خاص طبقے کی قائم کی ہوئی نہ ہو اور وہ

ایسے رہبر کی طرف جھکتا ہے جس میں کسی قسم کی خود غرضی اور برتری کی خواہش نہ ہو اور جو نہایت سادہ زندگی بسر کرتا ہو۔ برابری، سادگی، سچائی، نیکی اور انصاف پسندی ہر انسان کی فطری خواہش ہے۔ تاریخی شہادتوں کے مطابق اس قسم کی حکومت اور ایسے رہنما کی روشن مثال صرف انبیاؑء اور ان کے منصفانہ نظام میں اور ان لوگوں کی ذات میں دیکھی گئی ہے جو نبیوں سے نظریاتی طور پر زیادہ قریب ہیں۔ انسان کی اس فطری خواہش کی مناسب تکمیل صرف انبیاؑء کی سنت کے سائے میں ہو پاتی ہے۔ اس بات کی دلیل حکومت کے موجودہ نظام اور رہبر ہیں جو دنیا کے ہر خطے میں صدیوں سے غریبوں کا خون چوس رہے ہیں اور ان تمام قانون دانوں اور سیاست کاروں نے غریبوں کے کسی دکھ کا مداوا نہیں کیا ہے، بلکہ یہ تو ابھی تک نسل پرستی، بت پرستی اور ستم کاری جیسی لغویات کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

انبیاؑء کے بارے میں قرآن کا بیان

اب جبکہ ہم نے عقل کی مدد سے انبیاؑء کی ضرورت کو سمجھ لیا ہے تو قرآن کی چند آیتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

۱۔ ہر امت کے لیے ایک پیمبر ہے۔ پس جیسے ہی ان کا پیمبر آیا تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ذرا برابر ظلم نہیں ہو گا۔[۱] (سورۂ یونس۔ آیت ۴۷)

---

[۱] اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہر قوم کے لیے چاہے وہ زمین پر کہیں بھی ہو، خدا نے ایک پیمبر بھیجا ہے، اگرچہ ان پیمبروں کی تاریخ ہم پہ (جاری ہے)

۲- ہر قوم میں ہدایت دینے کے لیے ایک پیغمبر رہا ہے (سورۂ فاطر- آیت ۲۴)۔

۳- یقیناً ہم پر لوگوں کی ہدایت لازم ہے (سورۂ لیل- آیت ۱۲)۔

۴- خدا سے بہتر حکم کون دے سکتا ہے؟ (سورۂ مائدہ- آیت ۵۰)۔

۵- اے رسولؐ! کہہ دیجیے کہ صرف خدا ہی کی حجت اور دلیل سب سے اچھی اور مؤثر ہے (سورۂ انعام- آیت ۱۴۹)

تم اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں صحیح اور غلط راستوں میں تمیز نہیں کر سکتا کیونکہ نبیوں جیسے معصوم رہبروں کی موجودگی میں تمہاری ہر قسم کی بہانہ بازی ختم ہو جاتی ہے اور صرف خدا ہی ہے جو تم لوگوں کو جنھوں نے ان بزرگوں کے نظریے اور لائحہ عمل پہ دھیان نہیں دیا' مجرم قرار دے سکتا ہے۔

۶- تاکہ ہر شخص جو ہلاک ہونیوالا ہے دلیل کی رو سے ہلاک ہو جائے اور جو زندگی کا سزاوار ہے دلیل سے زندہ رہے (سورۂ انفال- آیت ۴۲)۔

بے شک خدا کی طرف سے راستا اور گڑھا واضح رہنا چاہیے تاکہ ہر انسان ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب علم اور پوری پوری آزادی سے کرے۔

۷- ہم نے خوشخبری دینے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے تاکہ اس کے بعد لوگوں کے لیے کسی قسم کے عذر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے (سورۂ نساء- آیت ۱۶۵)۔

کیونکہ دوسری صورت میں انسان خلاف ورزیوں کے بارے میں اپنی لاعلمی کا عذر پیش کر دیتے اور ہر ملامت اور نکتہ چینی یا تنبیہ پر کہہ دیتے کہ ہمیں

واضح نہ ہو' اس لیے اس سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ تمام نبی مشرق میں ہی کیوں پیدا ہوئے

توکسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔ اس طرح لوگوں کے لیے اعتراض کا دروازہ کھلا رہتا۔

۸۔ یہ آیت بھی پچھلی آیت کی طرح کہتی ہے: اگر ہم نبیوں کے پیغام سے پہلے لوگوں کو ہلاک کرڈالیں تو وہ اعتراض کے طور پہ کہیں گے: اے ہمارے خدا! اگر تو ہمارے فلاں طور طریقے سے راضی نہیں تھا تو ہمارے لیے تو نے کوئی پیغمبر کیوں نہیں بھیجا جو ہماری ذلت اور بدبختی سے پہلے ہمیں ہدایت دیتا اور ہم اس کی پیروی کرتے (سورہ طٰہٰ ۔ آیت ۱۳۴)۔

دوسروں پہ ایک نظر

جو لوگ اپنے آپ کو وحی کے مشرب اور نبیوں کے طریقے سے بے نیاز سمجھتے ہیں، وہ اپنی زندگی گزارنے کے لیے اس قسم کے قوانین پر عمل کرتے ہیں:

۱۔ ایک شخص کے بنائے ہوئے ظالمانہ قوانین جو صرف اس کی خود غرضی پہ مبنی ہوتے ہیں اور جن میں ہر قسم کی کمزوری، خامی، زبردستی، نادانی، پراگندگی اور تنگ نظری وغیرہ شامل ہوتی ہے۔

۲۔ کسی گروہ یا طبقے کے بنائے ہوئے ظالمانہ قوانین جنھیں صرف مزدوروں یا سرمایہ داروں کا طبقہ وضع کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے قوانین بھی صرف ایک ہی طبقے یا ٹولے کی بھلائی کا خیال رکھتے ہیں اور اسی حاکم طبقے کے اثر میں رہتے ہیں۔

۳۔ قومی قوانین جو پوری قوم کی رایوں سے بنتے ہیں چاہے وہ قوم واقف کار ہو

یا ناواقف یہ قوانین درست اور مفید ہوں یا نہ ہوں لیکن آج کی دنیا میں لوگ اس تیسری قسم کے قوانین کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوانین سمجھتے ہیں۔

اس مقام پر پہنچنے تک ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ کون سا شخص کس ذریعے سے قانون سازی کا حق رکھتا ہے۔ ہم نے یہ بھی جان لیا ہے کہ ایک قانون ساز میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہونا چاہئیں:

۱۔ مکمل اور لامحدود علم اور انسان کی ظاہری اور باطنی ضروریات اور مسائل پر اسے پورا پورا عبور حاصل ہو۔

۲۔ انسانوں کے لیے لطف اور شفقت رکھتا ہو۔

۳۔ پورا پورا انصاف کرنے والا ہو اور کسی ایک فرد یا گروہ کے مفادات کو مصلحت اور حقیقت پر ترجیح نہ دیتا ہو۔

۴۔ خود کوئی غرض اور حاجت نہ رکھتا ہو۔

ظاہر ہے کہ ایسا قانون ساز سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے جس کے پیغامات، ہدایات اور قوانین نبیوں کی معرفت انسان تک پہنچتے ہیں۔ یہاں پیغمبر پیغام حاصل کرنے والے آلات کی طرح ہیں جو انسانی جسموں میں نصب کر دیے گئے ہیں۔

ہم لوگوں سے قانون کیسے منوائیں؟

ہر قانون لوگوں میں ایک خاص طریقے سے رواج پاتا ہے۔ ہم مختصر طور پر وہ طریقے بیان کرتے ہیں:

۱۔ جہالت اور حماقت کے طریقے سے : کبھی لوگ محض ناواقفیت اور بے عقلی کی وجہ سے کوئی حکم مان لیتے ہیں جیسے کہ علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں:

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہری داشت ولی نذر قباد و جم کرد
یعنی در خوئے غلامی زسگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگی پیش سگی سر خم کرد

"انسان اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اپنے ہی جیسے انسان کا غلام بن گیا۔ وہ (عزتِ نفس کا) گوہر رکھتا تھا لیکن اسے قباد و جم یعنی جابر بادشاہوں کے قدموں میں ڈال دیا۔ گویا کہ غلامی کی خصلت اختیار کر کے وہ کتوں سے بھی بدتر ہو گیا ہے کیونکہ میں نے ایک کتے کو دوسرے کتے کے سامنے اپنا سر جھکاتے کبھی نہیں دیکھا۔

اسلام اندھا دھند تقلید کو نہیں مانتا اور بہت سی قرآنی آیتوں میں بت پرستوں کے طور طریقے پر نہایت سختی سے اعتراض کرتا ہے جو اپنے غلط عمل کا سبب اپنے پرکھوں کی تقلید بتاتے ہیں مثلاً: جب وہ کوئی برا کام کرتے تھے تو ان کی دلیل صرف یہ ہوتی تھی کہ ہمارے بزرگ بھی یہی کام کیا کرتے تھے (سورۂ انبیاء۔ آیت ۵۳)۔

۲۔ خوف اور لالچ : ظالم صرف مرعوب کر کے اور ڈرا دھمکا کر لوگوں کو اپنا غلام بناتے ہیں اور ان پر اپنے جابرانہ قوانین نافذ کرتے ہیں۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: اگر تم میرے سوا

کسی دوسرے کو اپنا معبود بناؤ گے تو میں تمھیں جیل میں ڈال دونگا (سورۂ شعراء- آیت ۲۹)۔

وہ لوگوں کو لالچ دیکر بھی اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں جس طرح فرعون نے اپنے زمانے کے جادوگروں کو جمع کیا اور ان سے وعدہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو تم موسیٰ علیہ السلام کو رسوا کرو میں تمھیں انعام بھی دونگا اور اپنا مقرب بھی بنا لوں گا۔

ساحروں نے فرعون سے کہا: اگر ہم جیت گئے تو کیا تو ہمیں انعام دیگا؟ فرعون نے کہا: ہاں یقیناً تم میرے مقرب اور درباری بن جاؤ گے (سورۂ شعرا آیت ۴۱ اور سورۂ اعراف آیت ۱۱۳)۔

ظاہر ہے کہ لوگوں کو اپنے قانون کا مطیع بنانے کے لیے ڈر اور لالچ دو طاقتور وسیلے ہوتے ہیں لیکن یہ دونوں وسیلے آزادانہ اور سوچ سمجھ کر کوئی طریقۂ عمل اختیار کرنے کی قوت کو بہت زیادہ کمزور کر دیتے ہیں۔ اسلام نے اگرچہ لوگوں سے دوزخ کے عذاب اور جنت کی راحت کی بات کی ہے لیکن یہ وعدے فوری طور پہ پورے ہونے والے اور اس موجودہ دنیا کے لیے نہیں ہیں اور لوگ ان وعدوں کو اپنی موت کے بعد ہونیوالی اور دور کی بات سمجھتے ہیں۔ اس بناپر وہ پورے سکون سے حکم مانتے ہیں اپنی راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ بڑا فرق ہوتا ہے ان دو آدمیوں میں جن میں سے ایک کو قرض کی ادائیگی کل کرنا ہے اور دوسرے کو چند سال بعد۔ پہلے کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوتے ہوتے ہیں جبکہ دوسرا یوں نظر آتا ہے جیسے قرضدار ہی نہیں۔

قیامت کے دن کا خوف یا امید انسانوں کو عمل پر کسی بھی طرح سے

مجبور نہیں کرتے۔ ہماری بہترین دلیل خود انسانوں کی یہ روش ہے کہ وہ خدا کے وعدوں سے باخبر ہوتے ہوئے بھی عمل میں بیحد کاہلی برتتے ہیں۔

۳۔ ضرورت اور مقابلہ: تیسرا سبب جو انسان کو قانون کے ماننے پر ابھار سکتا ہے وہ ضرورت اور مقابلہ ہے۔ مال کی ضرورت اور دوستوں اور دشمنوں سے مقابلہ، انسان میں کسی حد تک سعی و کوشش کے جذبے کو ابھار سکتا ہے۔

۴۔ عقل اور تمیز بھی قانون کو ماننے کے اسباب میں سے ہیں: اگر پولیس ڈرائیوروں کے لیے کوئی راستا بند کر دے اور انھیں اس کی وجہ معلوم ہو جائے تو وہ بے عذر مان جائیں گے اور اگر انھیں اس کی وجہ (چاہے مختصر طور پر ہی سہی) کا علم نہ ہو پائے اور خاص طور پر اگر انھیں پولیس کی روش میں کسی غرض مندی اور ناجائز فائدے کا شک ہو جائے تو وہ اس بندش کو ہرگز نہیں مانیں گے۔

اسلام بھی لوگوں کو قانون کے ماننے پر تیار کرنے کے لیے عام طور پر عقل و تمیز ہی کا ذریعہ اختیار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ مختصراً کہتا ہے کہ فلاں کام کرو تاکہ تم میں تقویٰ کی روح پیدا ہو، مثلاً روزے کے حکم میں کہتا ہے: اے ایمان لانے والو! تم پر روزہ واجب کر دیا گیا ہے جس طرح پچھلی امتوں پر واجب کیا گیا تھا اور اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۸۳) وہ اس فرض کا مقصد باطنی ترقی بتاتا ہے یا خیرات کرنے والوں کے بارے میں کہتا ہے: خیرات دینا ایک ایسا تعمیری عمل ہے جو خود تمھاری روح میں اعلیٰ قوتیں پیدا کرتا ہے (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۶۵)۔

ہمارے معصوم پیشواؤں کی روایتوں میں بھی اسلام کے بہت سے احکام کے اسباب اور دلائل اس طرح بیان کیے گئے ہیں اور اس بارے میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں (علل الشرائع)۔ یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ روز بروز ہونیوالی ترقی نت نئے حقائق سامنے لاتی ہے اور احکام کا فلسفہ آشکار کرتی ہے[1]

۵۔ عشق اور محبت: اس سلسلے میں عشق و محبت کو پانچواں سبب قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ہم جس سے محبت رکھتے ہیں اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں چاہے یہ محبت بیجا ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اس عشق و محبت کا تو کہنا ہی کیا جو علم و معرفت کے ساتھ ساتھ عقل اور فہم کی بنیاد پر قائم ہو:

"جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ خدا سے بے حد محبت اور قلبی تعلق رکھتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۶۵)۔

یہ تھے وہ راستے جن سے لوگ کسی قانون کو قبول کرتے ہیں اور اس بات کو دہرانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے کہ سب سے اچھا، سب سے درست اور سب سے مناسب وہی چوتھا اور پانچواں طریقہ ہے۔

علم و فہم کا طریقہ اور عشق و محبت کا طریقہ: یہ اسلام کا صاف اور واضح حکم ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے:

لوگوں کو حکیمانہ دلائل سے، دل لبھانے والی نصیحتوں اور اچھی بحث سے خدا اور اسلام کی طرف بلاؤ (سورۂ نحل۔ آیت ۱۲۵)۔

---

[1] اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم جس حکم کی دلیل سے واقف نہ ہوں اسپر عمل نہ کریں۔

قوت اور لڑائی سے آخری مرحلے میں کام لینا چاہیے۔ تاہم اسلام کا عام طریقہ وہی تعلیم دینا اور عشق و محبت پیدا کرنا ہے۔ یہ قرآن ہے جو یوں فرماتا ہے:

اس گھر یعنی کعبہ کے مالک کی عبادت کرنا چاہیے کیونکہ وہی تھا جس نے لوگوں کو بھوک اور خوف سے بیری اور سکون تک پہنچایا۔

(سورۂ قریش۔ آیت ۴)

پیٹ بھرنے اور امن مہیا کرنے کو عبادت کی طرف پہلا قدم مانا گیا ہے تاکہ خدا کے لیے ان کی محبت اور قدردانی کے جذبے کو بیدار کرے۔

قانون کو جاری کرنے کا ضامن کون ہے؟

ہم پچھلی بحث میں کہہ چکے ہیں کہ نادانی اور حماقت یا ڈر یا لالچ یا ضرورت اور مقابلے میں سے کوئی ایک بھی قانون جاری کرانے اور اس پر عمل کرانے والا صحیح محرک نہیں ہو سکتا۔ بہترین محرک وہی فکر و فہم کو ترقی دینا اور حکم دینے والے سے عشق و محبت پیدا کرنا ہے۔ اب ہم قانون جاری کرنے والے ضامن کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ فکری پختگی

اسلام کی طرح کسی بھی دین و مذہب میں علم حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کی ترغیب نہیں دی گئی ہے۔ یہ جو پرہیزگار عالموں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے یا ملک ملک کی سیر کرنے اور مشورے کو اہمیت دی گئی ہے، اس کی غرض یہ ہے

کہ ہمارے فکر و فہم کی سطح بلند ہو۔ پورے قرآن میں پچھلی قوموں کی تاریخ انکے زوال کے اسباب، انبیاءؑ کی تاریخ اور ان کی کامیابی کے راز نظر آتے ہیں۔ بے عملی، غفلت اور ضد عام طور پر ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جنھوں نے سوچ کے دروازے کو بند کر رکھا ہے اور قرآن کے بقول فلسفہ احکام کا بیان اور پچھلی ضدی امتوں کی ہلاکت کے اسباب کا بیان قوانین کے اجراء کا ایک اہم محرک اور ضامن ہو سکتا ہے۔

۲۔ جذبات سے کام لینا

انسان کو کام کی تحریک دینے والا ایک عامل اس کے جذبات سے مدد لینا ہے۔

حوصلہ افزائی کا مسئلہ قرآن میں اس حد تک پیش کیا گیا ہے کہ وہ پیغمبرؐ سے فرماتا ہے:

ان لوگوں کے لیے دعائے خیر کیجیے جو اسلامی مالیات اور زکات ادا کرتے ہیں کیونکہ یہ حوصلہ افزائی ان لوگوں کے دلی سکون کا سبب ہے (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۰۳)۔

یا کچھ آیات میں ہم پڑھتے ہیں:

رحم کی سفارش کرتے رہو (سورۂ بلد۔ آیت ۱۷) اور ایک دوسرے کو حق اور ثابت قدمی کی وصیت کرتے رہو (سورۂ عصر۔ آیت ۳)۔

قرآن مجید ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے:

تم راہِ خدا میں جدال و قتال کیوں نہیں کرتے جبکہ مستضعفین

مرد، عورتیں اور بچے فریاد کر رہے ہیں کہ اے خدا! ہمیں اس بستی کے ظالم باسیوں سے چھٹکارا دلا (سورۂ نساء۔ آیت ۷۵)۔

اس آیت میں خدا نے لوگوں کی جہاد پر آمادگی اور تیاری کے لیے ان بچوں کے چہرے منعکس کر دیے ہیں جو ظالموں کے چنگل میں گرفتار ہو چکے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو ابھارنا چاہا ہے۔

ہم ایک دوسرے مقام پر یوں پڑھتے ہیں:

قحط اور سختی کے دنوں میں کسی قرابت دار یتیم کو یا کسی غریب کو جو خاک پر بیٹھا ہوا ہے کھانا کھلانا (سورۂ بلد۔ آیت ۱۴ تا ۱۶)۔

یہ خیال رکھیے کہ یہ مطالب بالکل جذباتی ہیں اور جذبات کو ابھار کر لوگوں کو عمل پہ آمادہ کرتے ہیں۔

۳۔ قانون کے اجراء کا تیسرا سبب جو درحقیقت تمام اسباب سے زیادہ قوی ہے خدا اور قیامت پر ایمان ہے۔ اس بات پر ایمان کہ حکم خدا کا ہے اور میں اس کا بندہ اور اس کی نگرانی میں ہوں، اس کی طرف لوٹنے والا ہوں اور اس کی بارگاہِ عدل میں مجھے جواب دینا ہے نیز اس بات پہ ایمان کہ وہ میرے اچھے کام کا دس گنا بدلہ دے گا اور میری غلطی سے چشم پوشی کریگا اور اس بات پر ایمان کہ ذرا برابر نیکی اور بدی کا بھی حساب ہوگا۔ ہاں ایسا ایمان اور یقین اطاعت و فرمانبرداری پر بہت گہرا اثر رکھتا ہے۔

۴۔ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا

جب قوم بے پروائی چھوڑ کر مستعد اور چوکس ہو جاتی ہے تو اسکے

تمام افراد نیکی کا حکم دینے اور برائی کی ممانعت کرنے لگتے ہیں۔ جس طرح ایک موٹرکار غلط سمت میں چلتی ہے تو تمام کاریں اس کے خلاف ہارن بجاتی اور بتیاں روشن کردیتی ہیں۔ اس طرح وہ اسے اس کی غلطی پر ٹوکتی ہیں اور اپنے اس عمل کو اس قدر دہراتی ہیں کہ غلط سمت میں کار چلانے والا ڈرائیور شرمندہ ہوجاتا ہے اور اس سمت کو بدل کر سیدھے طریقے سے چلنے لگتا ہے۔ ہاں تو خود لوگ بھی قانون کے اجراء کے ضامن بن سکتے ہیں۔

۵۔ حکومت اور سزا

مندرجہ بالا مثال میں اگر ڈرائیور اپنے ساتھیوں کی یاددہانی اور تنبیہ کی پروا نہ کرے اور ان سب کے ہارن بجانے اور بتیاں جلانے کے باوجود بے پروائی سے اپنی دھن میں چلتا رہے تو پولیس کی گرفت اور جرمانے کی نوبت آجاتی ہے۔ ہاں سزا اور سختی بعض موقعوں پر ضروری ہوجاتی ہے اور یہ بات آیت "دین میں کوئی جبر نہیں ہے" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۶) سے کوئی تعلق نہیں رکھتی کیونکہ اس آیت سے دلی عقیدے میں جبر و اکراہ کی نفی مراد ہے۔ رکاوٹوں کے منصوبوں اور اس عمل میں جبر کی نفی مراد نہیں ہے جس سے دوسروں کو بھی نقصان پہنچتا ہے ورنہ ذخیرہ اندوز، سود خور اور چور سب کے سب کہہ سکتے ہیں کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم خلاف ورزی کریں!

نبیوں کی پہچان

نبیوں کی پہچان کے تین طریقے ہیں:

۱۔ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اس دنیا کو پیدا کرنے والے خدا سے رابطہ رکھتا ہوں جو لامحدود علم اور قدرت کا مالک ہے تو اسے ایسا کام کرنا اور ایسی بات کہنا چاہیے جو دوسروں سے نہ ہو سکے اور اس طرح اپنے دعوے کو سچا ثابت کرے یعنی وہ ایسا کام کر دکھائے جو انسانی طاقت سے باہر ہو اور جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ واقعی دوسری دنیا سے رابطہ رکھتا ہے۔ اس عمل کو معجزہ کہتے ہیں۔

ایک سوال

انبیاءؑ کا کام موجدوں، عابدوں، جادوگروں اور پہلوانوں کے کام سے کس لحاظ سے مختلف ہے کیونکہ ان میں سے بھی ہر ایک کسی نہ کسی ایسے کام میں مہارت رکھتا ہے جو دوسروں سے نہیں ہو پاتا۔ پھر انھیں پیامبر کیوں نہیں کہا جاتا؟

جواب

ان لوگوں کا کام انبیاءؑ کے کام کے برعکس مشقی اور تکراری ہوتا ہے۔ اس مُرتاض نے جو چالیس دن تک نہیں سوتا یا کھانا نہیں کھاتا اور اسی طرح اس پہلوان نے جو بھاری مگدر یا تھوں پر اٹھا لیتا ہے، مدتوں کی مشق سے یہ قوت

پیدا کرلی ہے چنانچہ پہلوان نے اپنی کسرت کی ابتداء میں وہی وزن ہاتھوں پر اٹھایا جو عام آدمی بھی اٹھا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ زیادہ بھاری بوجھ اٹھاتا چلا گیا یہاں تک کہ اب وہ اتنا بھاری مگدر اٹھا لیتا ہے جس کے لیے کئی افراد کی قوت کے برابر قوت درکار ہوتی ہے لیکن جب لوگ حضرت صالحؑ کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے کہنے لگے کہ آپ دنیا میں جاری اللہ کی قدرت کی مدد سے اس پہاڑ میں سے اسی وقت ان خصوصیات کی ایک اونٹنی نکال لائیں تو آپ نے یہ نہیں کہا کہ ٹھہرو پہلے میں مشق کر لوں اور کچھ عرصے کے بعد پہاڑ میں سے تمہارے لیے ایک اونٹنی نکال لاؤں گا کیونکہ ایسے عجیب و غریب کام طویل مشق سے بھی نہیں کیے جا سکتے۔

۲۔ ان لوگوں کا کام تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر عابد اور موجد کسی استاد اور نصاب کا محتاج ہوتا ہے لیکن اس کے مقابل نبیوں کا کوئی معلم، مرشد اور استاد نہیں ہوتا۔

۳۔ ان لوگوں کا کام خصوصی مہارت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ موجد کسی ایک یا چند شعبوں میں مہارت رکھتا ہے اور اس کا کام اس کے محدود امکانات کا پابند ہوتا ہے۔ دوسری جانب انبیاءؑ طرح طرح کے مافوق الفطرت کام انجام دیتے ہیں کیونکہ ان کو یہ قوت خدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہے اور خدا کی قدرت کسی کام کے صرف دو ایک نمونے دکھانے تک ہی محدود نہیں ہوتی۔

۴۔ ان لوگوں کا کام بیشتر مادی مقصد سے متعلق ہوتا ہے، جب جادوگر جادو کرتا ہے یا پہلوان مگدر اٹھاتا ہے یا موجد اور مرتاض کوئی کام انجام دیتا ہے تو وہ صرف لوگوں کی توجہ حاصل کرنے یا تفریح یا باعث ہوا تو خوشگوار زندگی کیلئے انجام

دیتا ہے لیکن انبیاء کا مقصد انسان کو بلند کرنا، سماج کو مثالی بنانا اور ایک دوسری قوت (خدا) کی طرف ان کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔

۵۔ ان لوگوں سے غلط کارکردگی بھی ممکن ہے لیکن انبیاءؑ معصوم ہوتے ہیں اور ان کی باعزت زندگی میں کسی قسم کی خامی نہیں ملتی ہم انشاء اللہ آگے چل کر ان کی عصمت کے بارے میں بتائیں گے۔

۶۔ جادوگر، مرتاض اور موجد کبھی یہ نہیں کہتے کہ دوسرے لوگ یہ کام نہیں کر سکیں گے۔ ان میں سے کسی کو چیلنج کرنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن پیغمبر جو کام کرتے ہیں وہ پوری دلیری اور دل جمعی سے اعلان کر دیتے ہیں کہ دوسرے ایسا کام انجام نہیں دے سکتے۔

اس لیے انبیاءؑ کے معجزے اور دوسروں کے نظر فریب کاموں میں کام کی قسم، مقصد اور انجام دینے والے کی شخصیت کے لحاظ سے بھی بہت اختلاف ہوتا ہے کہ اگر انسان ذرا سی بھی توجہ کرے تو پیغمبروں کو جادوگروں، مرتاضوں اور موجدوں سے الگ ہی پہچان لے گا۔

معجزہ تماشا نہیں ہے

لوگ جس قسم کا معجزہ طلب کرتے تھے کیا انبیاءؑ وہ دکھا دیا کرتے تھے؟

اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ ہم قرآنی آیات میں پڑھتے ہیں کہ لوگ کبھی کبھی پیغمبروں سے ناممکن یا غیر متعلق یا نقصان رساں یا دنیا کے نظام کے خلاف کاموں کی امید بھی کرتے تھے اور وہ محترم ہستیاں ان کی ایسی امیدوں پر توجہ نہیں دیتی تھیں۔ ان کے اس قسم کے بیجا مطالبوں کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

۱۔ وہ کہتے تھے کہ خدا کو ہمارے پاس لے آؤ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۹۲)
اس لحاظ سے کہ خدا جسم نہیں رکھتا ان کی یہ امید پوری کرنا ناممکن تھا۔
۲۔ وہ کہتے تھے کہ نظام شمسی کو درہم برہم کر کے اور آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے سروں پر گرا دو (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۹۲)۔
۳۔ وہ کہتے تھے کہ یا تو تمہارا گھر سونے کا ہو (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۹۳)
۴۔ یا تمہارا باغ انگوروں اور کھجوروں کا ہو (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۹۱)

کیا انگور اور کھجور کے ایک باغ کا مالک ہونا یا ایسے گھر کا مالک ہونا جو سونے کا ہو خدا سے رابطہ رکھنے کا ثبوت ہے؟ کیا فرعون، قارون اور نمرود جو کثیر مال اور دولت رکھتے تھے خدا سے رابطہ رکھتے تھے؟ کیا پیغمبروں نے کوئی تماشا گاہ قائم کر رکھی تھی کہ وہاں تیری میری خواہش کے مطابق معجزوں کے نام سے تماشا دکھاتے رہیں۔ کیا معجزہ دکھانا صرف نبوت ثابت کرنے کے لیے نہیں ہے؟ اگر ایک انجینئر چند عمارتیں بنا دیتا ہے یا کاتب چند صفحے لکھ دیتا ہے تو کیا یہ کافی نہیں ہے؟ یا وہ اپنی انجینئری یا خطاطی ثابت کرنے کے لیے سب لوگوں کے لیے گھر بنائے یا خطاطی کرے؟[۱]

اس سے قطع نظر، کیا انھوں نے انبیاء کے معجزے دیکھ کر یہ نہیں کہا تھا کہ انھوں نے جادو کیا ہے؟ جو شخص ماننا ہی نہ چاہے اور ہٹ دھرمی سے ہی کام لیتا رہے تو لاکھوں دلیلیں اور نشانیاں بھی اسے مطمئن نہیں

---

[۱] تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں "فلسفۂ معجزہ" مولفہ حضرت آیت اللہ خوئی مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی۔

کر سکیں گی۔ کیا خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ہر خلیہ، ہر ذرّہ اور درخت کا ہر پتّا خدا کے وجود پر گواہ نہیں ہے؟ لیکن جو نہیں ماننا چاہتا وہ نہیں مانتا۔ اس بنا پر معجزے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ صاف دل اور پاک باطن لوگوں پر پیغمبر کے خدائے بزرگ سے رابطے کو ظاہر کر دے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر دن ہر گھڑی اور ہر آدمی کے لیے یعنی جس جس معاملے میں لوگوں کا دل چاہے پیغمبر معجزے دکھاتے رہیں۔ ہم خود پیغمبروں کی تکلیفوں سے بھری ہوئی زندگی دیکھتے ہیں کہ وہ بالعموم مشکلات سے دوچار رہتے تھے اور عام طور پر محنت، صبر اور سختیوں کی برداشت سے مشکلوں کو ایک ایک کر کے دور کرتے رہتے تھے اور کبھی بھی ان مصیبتوں اور پریشانیوں میں جو خود ان کے اور ان کے ماننے والوں کے لیے رہتی تھیں، معجزوں وغیرہ سے کام نہیں لیتے تھے۔

معجزے کی اصلیت

مثل مشہور ہے کہ سونے کی سار سنار جانے۔ واقعی اگر یہ طے ہو جائے کہ راجوں یا بڑھیوں یا درزیوں کو کوئی معجزہ دکھائے تو معجزہ اسی شعبے میں ہونا چاہیے جو ان کے کام، سوچ، دلچسپی سے تعلق رکھتا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام موجود تھے جادو اور نیرنگ ترقی پر تھا اس لیے ان کا معجزہ بھی لاٹھی کا اژدہا ہو جانا تھا یا جس عہد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے طب اور بیماریوں کے علاج سے لوگوں کو زیادہ دلچسپی تھی چنانچہ آپ خدا کے حکم سے مردے کو زندہ کر دیتے

تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں زبان و بیان، عزت اور فضیلت کا معیار تھا اس لیے ان کا بڑا معجزہ بھی قرآن ہی طے پایا۔ دوسری طرف اسلام جیسا ہمیشہ رہنے والا مذہب بھی دائمی معجزے کا محتاج ہے اور قرآن پیغمبرؐ اسلام کا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے۔

قرآن کی خصوصیات

ہم کہہ چکے ہیں کہ ہر پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسا معجزہ دکھائے جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ وہ مافوق الفطرت علم اور قوت سے رابطہ رکھتا ہے اور ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ہر پیغمبر کا معجزہ ایسا ہونا چاہیے جو اس زمانے کے لوگوں کی سوچ اور مشہور علم یا فن سے نسبت رکھتا ہو۔ اب ہم پیغمبرؐ اسلام کے اس معجزے کی کچھ خصوصیات بیان کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبرؐ اسلام کا معجزہ (قرآن)، لوگوں کے ہاتھوں میں ہر وقت موجود ہے۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی یا وہ مردے جنھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے زندہ کر دیا تھا، دوسرے زمانوں یا دوسرے مقاموں کے لوگوں کے مشاہدے میں نہیں آسکتے۔

۲۔ پیغمبرؐ اسلام کے معجزے کے اجزاء وہ حروف ہیں جن کی مدد سے سب لوگ روزانہ بات چیت کرتے ہیں۔

۳۔ قرآن معجزہ بھی ہے اور خدا کا حکم بھی جبکہ دوسرے نبیوں کے معجزے ایسے نہیں تھے۔

۴۔ دوسرے نبیوں کے معجزے ایک لحاظ سے معجزے تھے لیکن قرآن

علامہ مجلسی علیہ الرحمتہ کے قول کے مطابق پندرہ طریقوں سے اور علامہ طباطبائیؒ علیہ الرحمتہ کے قول کے مطابق گیارہ طریقوں سے معجزہ ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ ان میں کئی دوسرے پہلوؤں کا بھی اضافہ ہو جائے جن کے آثار اس وقت بھی قرآن کے عددی معجزات کی تشریح اور حروف مقطعات کے بارے میں ان انکشافات کی صورت میں نظر آتے ہیں جو کچھ عرصہ پیشتر ظاہر ہو چکے ہیں۔

اس بڑی اور مقدس کتاب یعنی قرآن میں ۱۱۴ سورتیں، چھ ہزار سے زائد آیتیں اور اٹھتّر ہزار الفاظ ہیں[1]۔ خدا نے اپنی اس عظیم کتاب میں مخالفوں کو بار بار دعوت دی ہے کہ اس سرکشی، تخریب کاری، روپے کے صرف، جانوں کے نقصان، لڑائیاں لڑنے، یتیم بنانے، افواہیں پھیلانے، رعب ڈالنے اور الزام لگانے کے بجائے تم سب باہم مل جاؤ اور اس قرآن جیسی کتاب لے آؤ (اے رسولؐ!) کہہ دو کہ اگر تمام انسان اور جن جمع ہو جائیں تو بھی اس قرآن جیسی کوئی کتاب قطعاً پیش نہیں کر سکتے چاہے ان میں سے بعض دوسروں کے مددگار بن جائیں (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۸)۔

ان مخالفوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن تمہارا گھڑا ہوا ہے کہہ دو کہ تم بھی اس قرآن کی سی دس سورتیں لے آؤ (سورۂ ہود۔ آیت ۱۳)۔

---

[1] وحی و نبوت مرتضیٰ مطہری صفحہ ۹۹۔

دوسری جگہ ہم پڑھتے ہیں: کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو پھر قرآن کی سی ایک ہی سورت لے آؤ، جس غیر خدا کی قدرت سے چاہو مدد لے لو (سورۂ یونس۔ آیت ۳۸)۔

ہم ایک اور جگہ پڑھتے ہیں (یہ ضروری نہیں ہے کہ پورا قرآن یا قرآن کی سی دس سورتیں یا ایک ہی سورت پیش کریں) اگر وہ سچے ہیں تو قرآن کی سی صرف ایک ہی خبر یا بات پیش کر دیں (سورۂ طور۔ آیت ۳۴)۔

محترم قارئین! ان چار آیتوں پر غور کریں کہ خدا نے کتنی بار رعایت دی ہے اور ہر بار لوگوں کو چیلنج کیا ہے کہ قرآن کا مثل لے آؤ۔

پہلی رعایت: قرآن جیسی کتاب لانے کی جگہ صرف دس سورتیں لانے پر اکتفا کی ہے (سورۂ ہود کی تیرھویں آیت کے مطابق)۔

دوسری رعایت: دس سورتوں سے بھی قطع نظر کر کے مخالفوں سے یہ مطالبہ کیا کہ قرآن کی سی صرف ایک ہی سورت لے آئیں (سورۂ یونس کی اڑتیسویں آیت کے مطابق)۔

تیسری رعایت: فرمایا کہ یہ لازم نہیں ہے کہ ایک ہی پوری سورت لائیں بلکہ ہم ایسی صرف ایک خبر یا بات پر بھی راضی ہیں جو قرآن جیسی ہو (سورۂ طور کی چونتیسویں آیت کے مطابق)۔

یہ ہے تحریک دلانے والے جملوں پر ایک نظر:

۱۔ وہ قرآن کا مثل نہیں لا سکتے (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۸)۔

۲۔ چاہے تمام انسان اور جن بھی جمع ہو جائیں (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۸)

۳۔ چاہے ایک دوسرے کی مدد بھی کریں (سورۂ بنی اسرائیل۔آیت ۸۸)۔

۴۔ اگر تم سچے ہو (سورۂ یونس آیت ۳۸)۔

۵۔ جس صاحب فکر و ہوش کو چاہو بلا لو (سورۂ یونس۔آیت ۳۸)۔

ہم چودہ صدی سے جواب کے منتظر ہیں

واقعی اس قدر رعایت، اتنی تحریک، اتنے دشمنوں کے باوجود کوئی جواب کیوں نہیں دیتا!

عربی ہماری مادری زبان نہیں ہے جو ہم قرآن کا مثل پیش کریں۔ عربی زبان والے کیوں خاموش ہیں؟ ہم اسلام کے دوست ہیں دشمن کیوں نہیں بولتے؟ اس وقت بھی ہزاروں عربی بولنے والے سوشلسٹ اور اسلام کے سرکش مخالف عرب ممالک میں بھی اور غیر عرب ممالک میں بھی موجود ہیں اور ہر سال اپنے ملکی بجٹ کا لاکھوں روپیہ اپنے نظریے کی اشاعت یا اسلام کے خلاف سازشیں کرنے پر خرچ کرتے ہیں نیز بین الاقوامی رابطے سے بھی جس کا دامن بہت وسیع ہے تھوڑے ہی عرصے میں تمام دانشوروں اور مفکروں کو ایک سیمینار (مذاکرے) میں جمع کر سکتے ہیں اور قرآنی گفتگو کے مثل ایک بات بنا سکتے ہیں لیکن نہیں بنا پائے ہیں!

امیر المومنین امام علی علیہ السلام جن کا شمار عربی زبان کے فصیح ترین لوگوں میں ہوتا ہے اور باوجودیکہ دس سال کی عمر سے بیحد جوش، محبت اور اہلیت کے ساتھ قرآن سے مانوس ہوئے نہج البلاغہ میں ان کے خطبوں میں جب قرآن کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی آیت آجاتی ہے تو وہ ایک خصوصی فرق کے ساتھ الگ

سے چمک اٹھتی ہے۔ خود پیغمبر اسلامؐ کی حدیثوں میں بھی جب کوئی آیت آجاتی ہے تو وہ ان کی دوسری باتوں سے قطعی ممتاز نظر آتی ہے۔ یہ ہیں اعجاز کے معنی کہ الفاظ بھی وہی ہیں، زبان بھی وہی ہے لیکن جملوں کا جوڑ اور آہنگ ایسا ہے کہ چودہ صدی کی مدت میں ان جیسا ایک چھوٹے سے چھوٹا جملہ بھی نہیں بن پایا ہے۔ ایک طرف تو رہی یہ بات اور دوسری طرف ایک ان پڑھ شخص سے ایسی باتیں کہ علم کی دنیا جتنی آگے بڑھتی جاتی ہے، قرآن کی خوبیاں کھلتی جاتی ہیں بجائے خود ایک معجزہ ہے۔

جہاں کہیں اکتسابی علم اور وحی میں اختلاف نظر آتا ہے وہاں صورت یہ ہے کہ یا تو وہ علم حقیقت میں علم نہیں ہے بلکہ صرف ایک نظریہ ہے اور گمان ہے یا اس وحی کا ایسے موضوع سے تعلق ہی نہیں ہے ورنہ ایک ایسا مسئلہ جو سو فیصدی علمی ہو وحی کا قطعی مخالف نہیں رہا ہے۔

قرآن مجید میں ایسی آیتیں نظر آتی ہیں جو نازل ہونے کے وقت سراسر پیشین گوئیاں اور غیبی خبریں تھیں لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ حقائق کی صورت میں سامنے آگئیں۔

جس زمانے میں کچھ لوگ اپنے حساب سے یہ سمجھ رہے تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے آپکی وفات کے ساتھ ہی اسلام کی بات ختم ہو جائے گی اور خود انکے نام انکے بیٹوں کی بدولت باقی رہ جائیں گے، عین اسی زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی:

اے محمدؐ! ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا کی (یعنی ہم آپ کی ایک بیٹی سے آپ کی نسل کو باقی رکھیں گے) اور تمھارے دشمنوں

کی نسل بہت سے بیٹوں کے باوجود ختم ہو جائے گی (سورۂ کوثر)۔
اور ہم نے دیکھا کہ زمانے کی رفتار نے اس قول کو صحیح ثابت کر دیا۔
جس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ: ہم آپ کی ہنسی اڑانے والوں کے مقابلے میں کافی ہیں (سورۂ حجر۔ آیت ۹۵)۔
یعنی سازشوں کو ناکام، منصوبوں کو ملیامیٹ اور ہنسنے والوں کو برباد کر دیں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پیغمبرؐ تن تنہا ہنسی، الزام اور سازش کے بیچ سے کس طرح نکل گئے اور کس طرح ان کے طرزِ فکر نے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا؟
کیا کوئی یقین کر سکتا تھا کہ اس سخت ہزیمت کے بعد جو روم نے اٹھائی مستقبل قریب میں اس کی تلافی ہو جائے گی لیکن آیت نازل ہوئی کہ روم شکست کھائے گا لیکن دس سال سے بھی کم مدت میں اس کی یہ ہار، جیت میں بدل جائے گی:
روم نے شکست کھائی لیکن اسکے بعد وہ غلبہ پائے گا" (سورہ روم آیت ۱)۔
یہ آیات اپنے نزول کے وقت پیشگوئی کا انداز رکھتی تھیں۔ یہ سب اعجاز کے نشانات ہیں اور ان موضوعات کی تفصیل بڑی کتابوں میں مذکور ہے۔
دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہر عام انسان کام کی ابتدا میں کم تجربہ رکھتا ہے اس کے اعمال پختہ اور مکمل نہیں ہوتے اور رفتہ رفتہ ترقی اور تکمیل پاتے ہیں۔ لیکن قرآنی آیات ایسی نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ آیات جو پیغمبری کے آغاز اور چالیس سال کی عمر میں پیغمبر سے سنی گئی تھیں۔ ان آیتوں سے جو آپ نے تریسٹھ سال کی عمر میں تلاوت فرمائیں غرض و غایت اور معنی میں

باہم اختلاف رکھتی ہوں۔ ان کا ڈھنگ یا پہلو بدل گیا ہو یا معنی میں ترمیم ہو گئی ہو یا مہارت بیان میں اضافہ ہو گیا ہو۔ یہ سب باتیں قرآن کے خدا کا کلام اور معجزہ ہونے کا ثبوت ہیں۔ قرآن یہ حقیقت بیان کرتا ہے:

اگر قرآن غیر خدا کا کلام ہوتا تو لوگ اس میں بہت سے اختلافات پاتے (سورۂ نساء۔ آیت ۸۲)

بے شک عام آدمیوں کی ذہنی حالت صلح اور لڑائی، غریبی اور امیری، عزت اور ذلت، کام کے آغاز اور انجام کے وقت ایک سی نہیں رہتی لیکن اس قرآن کے مطالب و معانی یکساں اور باہم متحد ہیں جو خود اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن انسانی تخلیق نہیں ہے اور یہ اس خدا کا کلام اور وحی ہے جو ہر قسم کی تبدیلی، ترمیم اور تجربے سے ماوراء ہے۔

چونکہ یہاں ہمارا مقصد انبیاءؑ کی پہچان کا ایک مختصر اور اجمالی جائزہ ہے اس لیے قرآن کے معجزہ ہونے کی بحث میں ہم نے اس کے علمی معجزات کی تشریح سے گریز کیا ہے۔ قرآن میں ایسے ایسے مسائل ظاہر ہوتے ہیں جیسے زمین کی حرکت، کشش ثقل، زمین کی گولائی، ہوا کے چلنے سے بار آوری، خصوصی دائروں میں ستاروں کی چال، دوسرے کروں میں زندگی اور نباتات کا وجود جہاں تک نہ صرف چودہ سو سال پہلے بلکہ آخری صدیوں تک علم کی دنیا کی پہنچ نہیں ہو سکتی تھی۔ چونکہ اس سلسلے میں بہت سی کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں اس لیے ہم نے اختصار کے پیش نظر بعض شبہات کا جواب بھی نہیں دیا مثلاً تحریف قرآن کا شبہ کیونکہ خود قرآن نے کئی آیتوں میں وضاحت سے اس کا جواب دیا ہے جن میں سے ہم دو آیتیں نقل کرتے ہیں:

۱۔ ہم نے قرآن نازل کیا اور یقیناً ہم اس کو ہر عیب سے بچائیں گے (سورۂ حجر۔ آیت ۹)

۲۔ قرآن میں باطل کے داخل ہونے کا راستا بند کر دیا گیا ہے۔ (سورۂ فصلت۔ آیت ۴۲)

اس صاف اور صریح بیان کے ہوتے ہوئے قرآن میں رد و بدل ہو سکنے کے بارے میں ہم چند ایسی بے اعتبار اور بے سند روایتوں کی وقعت کے قائل نہیں ہیں جنھیں بعض لوگوں نے تحریف قرآن کے لیے بہانہ بنا رکھا ہے۔ چونکہ ہمارے مکتب فکر کا طریقہ یہ ہے کہ جو بات قرآن کے صریح خلاف ہو اسے مسترد کر دینا چاہیے خواہ وہ نادان دوستوں کی طرف سے ہو یا دانا دشمنوں نے معصوم اماموں سے اسے منسوب کر دیا ہو۔

اس سے قطع نظر جب ہم تحریف قرآن کی بعض روایتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ روایتیں قرأت میں اختلاف سے متعلق ہیں یا آیات کے نازل ہونے کے اسباب سے تعلق رکھتی ہیں یا اس تشریح اور گہرے نکات کے بارے میں ہیں جو ہمارے معصوم پیشواؤں نے آیات سے اخذ کیے ہیں لیکن ان کا اصل قرآن کی تحریف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آیئے، ہم قرآن کو بہتر طور پر سمجھیں

بعض لوگوں کے خیال کے برعکس جو قرآن کو صرف عبادات اور اخلاقیات سے متعلق ایک کتاب سمجھتے ہیں ہم کو یہ کہنا چاہیے کہ اس آسمانی کتاب کا صرف بارھواں حصہ (یعنی تقریباً پانچ سو آیتیں) فقہی مسئلوں سے متعلق ہے جبکہ

اس کا زیادہ حصہ اجتماعی، سیاسی، انتظامی، تاریخی، اعتقادی اور تمدنی وغیرہ مختلف مسئلوں کے بارے میں ہے۔

آپ کو یہ کس کتاب میں ملتا ہے کہ اجتماعی مسئلوں مثلاً اتحاد، مشورہ، فساد کے خلاف قیام، تنظیم اور امن، جھوٹی افواہیں پھیلانے کے خلاف جنگ وغیرہ کی اس قدر تاکید کی گئی ہو؟

قرآن ایسی کتاب ہے جو اپنی تربیت کی روش بھی خود متعین کرتی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم[1]، حضرت ابراہیم علیہ السلام[2] اور فرعون کی زوجہ آسیہ جیسی ہستیوں کو نمونے اور آئیڈیل بنا کر پیش بھی کرتی ہے۔

بے شک اس کلامِ خدا کی تاثیر صرف ان لوگوں کے واسطے ہے جنھوں نے اپنی روح بے جا تعصب، خودپسندی، خودغرضی، غرور، ضد، تکبر، کپٹ اور دوسری ناجائز باتوں سے پاک کر لی ہے اور جو قرآن کے کہنے کے مطابق پرہیزگار اور سچائی کے عاشق ہیں کیونکہ قرآن کی آیتیں اس بارش کی طرح ہیں جو باغ پر پڑتی ہے تو خوشبو بڑھاتی ہے اور گندی جگہوں پر پڑتی ہے تو ان کی بدبو میں اضافہ کر دیتی ہے۔

قرآن دوسری علمی کتابوں کی طرح نہیں ہے جو صرف ذہن ہی سے سروکار رکھے بلکہ یہ علمی کتاب ہونے سے کچھ زیادہ تربیت اخلاق کی کتاب ہے۔ اسکے قصے تفریح کے لیے نہیں عبرت کے لیے ہیں اسکی تاریخ پچھلی قوموں کی روداد نہیں بلکہ

---

[1] تمہارے لیے خدا کا پیغمبر عمدہ نمونہ ہے (سورۂ احزاب۔ آیت ۲۱)۔

[2] تمہارے لیے ابراہیمؑ بھی عمدہ نمونہ ہے (سورۂ ممتحنہ۔ آیت ۴)۔

قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ ہے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو آسان ہے، واضح ہے اور مؤثر بھی ہے۔ قرآن ایک ایسا رہنما ہے جو انسان کو خاک سے خدا تک پہنچا دیتا ہے اور مادے سے روح تک بلند کر دیتا ہے۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو پکی دلیلوں سے انسان کو بصیرت بخشتی ہے، نبیوں اور قوموں کی تاریخ بیان کر کے انسان کو راستا دکھاتی ہے اور مثالی نمونوں، سزاؤں اور انعاموں کے بیان سے انسان کو تحریک دیتی ہے

اس کتاب میں انسان اور خدا کے درمیانی رابطے (عبادات) کا بھی بیان ہے، انسان اور خلق خدا کے درمیانی رابطے کے مختلف پہلوؤں، خیرات، ایثار اور تعاون وغیرہ کا ذکر بھی ہے اور انسان اور نیچر کے باہمی تعلق (یعنی فطرت کی تسخیر کرنے، فطری اصولوں کو زندہ رکھنے، فطری مواد کو ترقی دینے، اس سے صحیح فائدہ اٹھانے اور مزید مواقع کی تلاش و جستجو جاری رکھنے نیز تمام فطری مظاہر کو خدا کی نشانی اور اس کی قدرت کی دلیل سمجھنے) کا بیان بھی ہے۔

اس کتاب میں مخالفوں اور منافقوں سے انسان کے معاملے کی نوعیت کا بیان بھی ہے۔ دانائی، وعظ اور اچھی بحث کے ذریعے حق کی طرف بلانا، محروم طبقے کے لیے مفسدوں اور ان لوگوں کو ختم کرنا جو حق کو قبول کرنے میں راستے کے کانٹے کی طرح مزاحم ہیں اور سماج کے باغیوں سے شدید مقابلہ اور منافقوں کے مقابلے میں منفی و مثبت ردعمل اور پانچواں کالم واضح بیان کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

قرآن میں علم کی اہمیت، اپنی ذات کی تعمیر، سماج کی تشکیل، مربی کی صفات، تربیت کا فلسفہ، تربیت کا طریقہ اور بعض دوسرے مسائل پیش کیے گئے ہیں، جیسے

۱- ہم کیا سیکھیں ؟

۲- کہاں سے سیکھیں ؟

۳- کس لیے سیکھیں ؟

اس آسمانی کتاب میں لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ، مختلف توہمات کے خلاف جنگ، سیاسی، اقتصادی اور فوجی معاہدوں کا مسئلہ، کنبے کے حقوق میاں بیوی یا اولاد اور والدین کے باہمی لحاظ اور رعایت وغیرہ کا واضح بیان ملتا ہے۔

اس آسمانی کتاب میں ان جرائم پیشہ لوگوں کے لیے قطعی اور صاف احکام بیان کیے گئے ہیں جو امن عامہ کو تباہ کرتے ہیں۔ ہتھیاروں یا افواہوں سے سرد اور گرم جنگ کے شعلے بھڑکاتے ہیں۔ عوام کی عزت و حرمت سے کھیلتے اور دوسروں کے مال و عزت پر دست درازی کرتے ہیں۔ یہ آسمانی کتاب باصلاحیت لوگوں میں ایسا یقین اور بصیرت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس دنیا میں ہر وقت عالم اور دانا خدا کی سرپرستی میں پاتے ہیں لیکن آجکل ہماری غفلت کی وجہ سے انسان کی تعمیر کرنے اور اسے نجات دلانے والی اس کتاب کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس سے صرف رسمی اور نمائشی طور پر ہی استفادہ کیا جاتا ہے۔ کاشی کاری میں راہگیری کے ہنر کے طور پر یا مصوری میں اشیاء کے اشتہارات کے طور پر یا قبروں کے کتبوں پر یا بچوں کے بازوؤں پر یا روانگی کے وقت مسافر کے سر پر یا دلہن کے جہیز میں شامل کر کے یا لیکچر سے پہلے کے مراسم کے لیے پٹی یا فیتے کی تیاری جیسے کاموں میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنا لائحہ عمل کھینے لوگوں اور خود پسند نوآبادکاروں سے مستعار لیا تھا اور اس کے برے نتائج کے تحت اب ہم اس پستی میں گر گئے ہیں۔ اگر ہمارا نوجوان مدرسے میں روزانہ یہ

پڑھتا کہ: اپنے دشمنوں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۵۱)' اور ہماری تعلیم طلبہ کو یہ آیت سکھاتی اور اس پر عمل کیا جاتا تو استعمار کبھی ہمارے اندر نہ آ گھستا۔ اگر صبح کی فوجی مشقوں (پریڈوں) میں روزانہ یہ آیت پڑھی جاتی کہ: اے مسلمانوں! غیروں کو اپنا ہمراز نہ بناؤ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۱۸) تو مسلمانوں کی فوج کبھی برسوں تک غیر ملکی فوجی مشیروں کی احسان مند نہ ہوتی۔ اس قانون پر عمل کرنے سے کہ "سود مطلق حرام ہے" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۷۵) سود خوری کے تمام مراکز بند ہو جاتے اور اس حکم سے کہ "جو فرقہ زیادتی کرے تم بھی اس سے لڑو" (سورۂ حجرات۔ آیت ۹) تمام اسلامی ممالک اپنی فوجی طاقت کو منظم کرتے اور حملہ آوروں کو عملی جواب دیتے تو اسلامی دنیا جو روئے زمین کی پوری آبادی کا تقریباً ایک تہائی ہے اپنی حقیقی عزت حاصل کر لیتی۔ اگر تمام مسلمان اس قرآن کی آواز کو دل و جان سے قبول کر لیتے جو یہ کہتا ہے کہ قوموں کی نحوست اور ہلاکت کا سبب ظالموں کی پیروی ہے (سورۂ ہود۔ آیت ۵۹) تو ان حاکموں کو جنھیں بڑی طاقتوں نے اپنے ہاتھوں سے بٹھایا ہے" اپنے سے دور کر دیتے اور قرآن کی آواز پر لبیک کہتے جو کہتا ہے کہ مفسدوں (سورۂ اعراف آیت ۱۴۲)' مسرفوں (سورۂ شعراء۔ آیت ۱۵۱)' گنہگاروں (سورۂ انسان۔ آیت ۲۴)' جاہلوں (سورۂ جاثیہ آیت ۱۸) اور سطحی علم رکھنے والے (سورۂ قلم۔ آیت ۱۰)' کی پیروی نہ کرو۔ قرآن کی ان پکاروں کو ہم مسلمانوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام تک خیر کی طرف بلانے والوں کی جیسی اطاعت ہم کو کرنا چاہیے تھی ویسی ہم نے نہیں کی اور اس دنیا میں ذلت کی زندگی گزاری تمام ظالموں کو خراج ادا کیا'

مادی اور روحانی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور مستقبل میں خدا کے سامنے عدل الٰہی کے دربار میں نامراد رہیں گے اور قیامت کے دن رحمت للعالمین کو ہمارے خلاف شکایت اور انصاف طلبی کرنا پڑے گی کیونکہ اس شکایت نامے کا مضمون جو بقول قرآن قیامت کے دن پیغمبرِ خدا کی زبان سے بیان ہوگا یہ ہے:

پیغمبرِ خدا فرمائیں گے کہ اے خدا! بالتحقیق میری قوم اور مسلمانوں کی اس ملّت نے یہ آسمانی کتاب چھوڑ دی اور دوسروں کے قوانین پر عامل ہوگئی (سورۂ فرقان۔ آیت ۳۰) ہم اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کی طرف رخ کرتے ہیں جنھوں نے فرمایا ہے جس وقت تمھارے کسی فرد یا سماج کی طرف فتنے گھر آئیں تو قرآن میں اپنی نجات کا طریقہ تلاش کرو (کافی جلد۲ صفحہ ۵۹۹)۔

آپ دوسری جگہ فرماتے ہیں: قرآن کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے اس پر عمل کرنے میں مسلمانوں سے آگے بڑھ جائیں (نہج البلاغہ) اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ ہمارا یہی قرآن ہے جو کتنے ہی مقامات پر مسلمانوں کو دنیا کا مشاہدہ کرنے، روئے زمین کا سفر کرنے، آنکھوں دیکھے واقعات سے سبق لینے، طرح طرح کی تہذیبوں اور تمدنوں اور قسم قسم کی ذہنیت رکھنے والی مختلف قوموں سے ملنے جلنے اور سماجی مشکلات دور کرنے کے طریقے ڈھونڈنے کا حکم دیتا ہے۔

ہم نے دیکھ لیا کہ کس طرح مسلمان اس حکم پر عمل نہ کرنے کے باعث کتنے ہی فائدوں سے محروم رہ گئے جبکہ دوسرے آگے بڑھے۔ انھوں نے اسلامی ملک دیکھے بھالے، ہماری قوت اور کمزوری کے اسباب پر غور کیا۔

وہ ہماری زمین کے چپے چپے سے آگاہ اور اس کے نیچے اور اوپر کے چشموں اور کانوں سے بخوبی واقف ہو گئے۔ انھوں نے یہ چیزیں ڈھونڈیں، نکالیں، بانٹیں اور پھر مالکیت کے ٹھپے سے ہمارے ہاتھ بیچیں۔ یہ اس امت کی سزا ہے جو اپنی آسمانی کتاب کو چھوڑ دے، اپنے معصوم رہبروں سے پھر جائے، ان کی آواز کے جواب میں ناشکری اور غافل بن جائے یا خدانخواستہ پیچھے کی طرف پلٹ جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے چھٹکارا دلایا اور بنی اسرائیل کو اپنی عدم موجودگی میں کچھ دنوں کے لیے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد کر گئے لیکن قوم نے ناشکرا پن دکھایا اور خدا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چھوڑ کر سامری کے بچھڑے کی پوجا کرنے لگے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے سفر سے پلٹے اور انھوں نے اپنے پیروؤں کے پلٹ جانے کی حالت دیکھی تو بہت بے چین ہو گئے اور اپنے بھائی پر غصہ کیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا: اے بھائی! اس قوم نے میری سرداری قبول نہیں کی۔ یہ جو کل غلام تھے اب جیسے ہی آزاد ہوئے تو انھوں نے مغرور ہو کر مجھے کمزور بنا دیا بلکہ قریب تھا کہ مجھے مار ہی ڈالیں۔ انھوں نے اپنی حیثیت کو ترک کر دیا اور ان کے ایمان، قیام، رہبر کی اطاعت اور باہمی اتحاد کی جگہ آرام پسندی، عشرت کوشی اور شکم پرستی نے لے لی[ؔ]۔ قرآن میں جو اس واقعے کا بیان آیا ہے وہ ہمیں خبردار کرتا ہے کہ اگر لوگ

ؔ چونکہ یہی عوامل آزادی کے چھن جانے اور غلامی میں چلے جانے کا سبب بنتے ہیں اس لیے مسلمانوں کو ہر وقت سامراجی عزائم سے باخبر اور ایمان، اتحاد اور تنظیم کے ہتھیاروں سے مسلح رہنا چاہیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح سستی، باہمی نفاق اور عادل رہنما کے حکم کی خلاف ورزی میں پڑ گئے تو ان کا بھی وہی حال ہوگا۔

اے بصیرت والو! سبق حاصل کرو۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب بھی چھوٹی ہے۔ مصنف بھی کم علم ہے اور اندیشہ ہے کہ قاری کے دل و دماغ میں بھی گنجائش کم ہی ہوگی اس لیے ہم قرآن کی توصیف کو یہیں ختم کرتے ہیں کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ اس کتاب کی تعریف چند صفحوں میں ختم ہو جائے جو خدا کا کلام ہے اور جس نے خود کو نور (سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۵) شفا (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۲) بصیرت (سورۂ انعام۔ آیت ۱۰۴) ہدایت (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲) فرقان (سورۂ فرقان۔ آیت ۱) حق (سورۂ فاطر۔ آیت ۳۱) اور تذکرہ (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۳) کہا ہے اس لیے ہم خدا، قرآن اور قارئین سے معذرت کے ساتھ اس بحث کو سمیٹتے ہیں اور چند سطریں اس قاعدے کے بارے میں لکھتے ہیں جو قرآن نے اپنی تلاوت کے متعلق بتایا ہے۔

تلاوتِ قرآن کے آداب

۱۔ آیت: پاک لوگوں کے علاوہ کوئی قرآن کو نہ چھوئے (سورۂ واقعہ۔ آیت ۷۹) کے مطابق انسان کو اس آسمانی مصحف کی تلاوت کرنے سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔

۲۔ اسے شروع کرنے سے پہلے ہمیں شیطان کے شر، شیطانی وسوسوں، شیطانی فیصلوں اور تاویلوں سے خدا کی پناہ طلب کرنا چاہیئے جو

ان احکام کے اثرات کو آدمی کی روح کی گہرائی میں اترنے سے روک دیتی ہیں (سورۂ نحل۔ آیت ۹۸)۔

۳۔ قرآن پڑھتے وقت ہمیں یہ سمجھنا چاہیے جیسے خدا براہ راست ہم سے اسی وقت اور اسی جگہ ہم کلام ہے اور ہمیں اس کے مخاطب ہیں۔ یہ کام صرف برکت پانے یا ازبر کرنے یا تقریر میں گرمی پیدا کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ قرآن کو صحیح ادائیگی اور خوش الحانی کیساتھ (سورۂ مزمل۔ آیت ۴) پڑھیں یعنی حروف کو واضح طور پر ادا کریں، اوقاف کا خیال رکھیں اور جلدی جلدی نہ پڑھیں۔

۵۔ قرآن پڑھنے کے بعد اس کی آیتوں پر غور کریں کیونکہ قرآن نے ان لوگوں پر سخت اعتراض کیا ہے جو قرآن پڑھنے میں صرف ہونٹ ہلاتے ہیں اور ترنم سے کام لیتے ہیں لیکن غور نہیں کرتے اور اس کے معنی کا کھوج نہیں لگاتے (سورہ نساء۔ آیت ۸۲)۔

۶۔ قرآن پڑھتے میں ان روایات پر جو معصوم پیشواؤں کی طرف سے ہر آیت کے متعلق چلی آرہی ہیں نیز ہر آیت کے مضمون اور اس کے شانِ نزول پر بھی پوری توجہ ہونا چاہیے تاکہ ہمارے خیال اور عقیدے میں کجی نہ آئے اور ہم کوئی غلط مطلب نہ اخذ کر بیٹھیں چاہے وہ قدامت پرستانہ ہو یا ترقی پسندانہ۔

ہماری بحث انبیاءؑ کی پہچان کے طریقے کے بارے میں تھی اور ہم نے کہا تھا کہ آسمانی پیغمبروں کو تین طریقوں سے جان سکتے ہیں۔

پہلا طریقہ معجزہ تھا جس کے سلسلے میں ہم نے قرآن کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو کی ہے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جاودانی معجزہ ہے اور شاید ہم اصل موضوع سے کچھ ہٹ گئے۔ اب ہم آپ سے معذرت کرتے ہیں اور انبیاء کے طریقے پر گفتگو کرتے ہیں اور باقی ماندہ دونوں طریقوں کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

دوسرا طریقہ

ہم نے کہا تھا کہ انبیاء کی پہچان کے تین طریقے ہیں۔ پیغمبروں کو حالات، ان کے اقوال، کارناموں اور قرینوں پر غور کر کے بھی پہچان سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل مثال پر دھیان دیجیے:

بازار میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ حکومت کا سپاہی دونوں فریقوں کو کوتوالی میں لے جاتا ہے اور ان سے اس تفصیل کے ساتھ پوچھ گچھ شروع ہوتی ہے۔

۱۔ نام اور پتا۔

۲۔ جھگڑا کس جگہ ہوا؟

۳۔ جھگڑا کس وقت ہوا تھا؟

۴۔ کیا واقعہ گزرا؟

۵۔ تم نے کیا کہا؟

۶۔ تم نے کیا کیا؟

پوچھ گچھ کرنے والا حالات کی تفتیش اور ترتیب کے بعد واقعے کی حقیقت کا بخوبی پتا لگا لیتا ہے۔ ہم بھی اس طریقے سے اپنے پیغمبر کو پہچان سکتے ہیں:

کون تھے ؟

کہاں رہتے تھے ؟

ان کے پاس کیسے لوگ آتے تھے ؟

کون کون سی جماعتیں ان کی مخالفت کرتی تھیں ؟

وہ کس طریقے سے اپنی بات ثابت کرتے تھے ؟

اصولاً ان کی بات کیا تھی ؟

انھوں نے کن لوگوں کی تربیت کی ؟

پیغمبروں بالخصوص حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ ہمارے مندرجہ بالا سوالات کا ہمیں واضح جواب دیتی ہے :

- کون تھے ؟ بے پڑھے بھی تھے اور امانتدار بھی تھے۔

کہاں تھے ؟ بت پرستی شرک اور تفرقے کے مرکز میں تھے اور انھوں نے توہمات اور جہالت کے طوفان میں دشواریوں بھری تحریک شروع کی۔

- ان کے گرد کیسے لوگ تھے ؟ خدیجہؑ سی عورت اور علی بن ابیطالبؑ سامرد، فضیلت، خلوص اور پاکیزگی کے دو نمونے تھے جو ایمان سے پہلے بھی بزرگی کے آثار رکھتے تھے۔

- ان کے مخالف کون تھے ؟ ان کے مخالف بڑے طاقتور، خودغرض، مغرور اور استحصال کرنے والے ظالم لوگ تھے۔

- وہ کس طریقے سے اپنی بات ثابت کرتے تھے؟ — وہ صحیح راستے سے نہیں ہٹتے تھے اور کبھی مادی چیزوں کا وعدہ نہیں کرتے تھے اور دھوکے بازی سے انھوں نے کبھی اپنے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔
- اصولاً ان کی بات کیا تھی؟ — ان کی گفتگو قرآن مجید کے روشن احکامات تھے۔
- انھوں نے کن لوگوں کی تربیت کی؟ — ان کے مکتب فکر کے تربیت یافتہ سلمانؓ، ابوذرؓ اور مقدادؓ جیسے لوگ تھے۔

واقعی اگر ہمارے پیغمبرؐ کے پاس کوئی معجزہ نہ بھی ہوتا تو انکی سوانح عمری، کارنامے، مقاصد اور حالات کا مطالعہ ہی انکی سچائی کا گواہ ہو سکتا تھا۔

تیسرا طریقہ

ہم پچھلے پیغمبروں کے اقوال کو پیغمبروں کی پہچان کا تیسرا طریقہ مان سکتے ہیں۔ اس بارے میں ایک عمدہ مثال پر غور کیجیے:

اگر میں آتا اور یہ دعویٰ کرتا کہ آپ کا گھر میری ملکیت ہے اور میرا نام پتا اس گھر کے قبالے اور دستاویز میں لکھا ہوا ہے تو اس دعوے کا فطری جواب صرف یہ ہوتا کہ آپ اپنی دستاویز پیش کرتے اور لوگوں کو دکھاتے کہ اس میں میرا نام پتا نہیں ہے اس لیے میرا دعویٰ یکسر غلط ہے لیکن اس عام طریقے کے بجائے اگر آپ لڑنے لگتے، روپیہ خرچ کرتے اور ملکیت کا ثبوت پیش کرنے پر مطلق آمادہ نہ ہوتے تو لوگ کیا فیصلہ کرتے؟ کیا آپ کا ثبوت پیش نہ کرنا اور ہر قسم کی لڑائی لڑنا اور نقصان بھگتنا میرے دعوے کی سچائی

کا بہترین گواہ نہ ہوتا؟

پیغمبرِ اسلام تشریف لائے اور انھوں نے فرمایا کہ میں وہی پیغمبر ہوں جس کا نام وغیرہ تمھاری توریت اور انجیل میں لکھا ہوا ہے۔

یہودیوں نے لڑائیاں لڑیں اور عیسائیوں نے مالی نقصانات برداشت کیے۔ اگر یہ باتیں پرانی کتابوں میں نہ لکھی ہوتیں تو وہ یہ کر سکتے تھے کہ آسانی سے پیغمبرِ اسلام کے خلاف لڑائی پر اٹھ کھڑے ہوتے اور نہ صرف یہ کہ ان پر ایمان نہ لاتے بلکہ ان کو بدنام بھی کرتے اور کہتے کہ ان کا احوال توریت اور انجیل میں نہیں ہے اور یہ شخص جھوٹا ہے لیکن اسلام کے دشمنوں نے جو لڑائیاں لڑیں اور نقصانات اٹھائے، ان سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں ان کتابوں میں موجود ہیں جن کو ان لوگوں نے آج خارج کر دیا ہے۔

پیغمبروں کے تمام صفات اور رسولِ اکرم کی سیرت

ان سطور میں نبیوں کی خوبیوں اور خصوصیات کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔ پیغمبروں کی خصوصیات سے واقفیت ہمارے عقیدے پر اور ان کی خوبیوں اور اخلاق کی واقفیت ہمارے عمل پر گہرا اثر رکھتی ہے۔ ایک چیز جو انسان کی ترقی اور تربیت پر اثر ڈالتی ہے وہ تاریخ اور اس کے فلسفے کا علم ہے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم ان لوگوں کی تاریخ سے واقف ہو جائیں جنھیں ہم نے تاریخ کی سب سے زیادہ کامیاب جامع اور بے عیب ہستیاں سمجھا ہے۔

نبیوں کی خوبیوں اور تاریخ کا علم نہ صرف ہمیں پر اچھا اثر رکھتا ہے بلکہ خود پیغمبروں کے بارے میں بھی یہی اثر رکھتا ہے اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً جب پیغمبرؐ کو مختلف قسم کی دھمکیاں، طعنے اور سازشیں پریشان کرتی ہیں تو ان کے لیے وجہ تسلی تنہا وہی امید کی کرن ہے جو خداوند عالم پچھلے پیغمبروں کے تذکروں میں سے ان کو سناتا ہے۔

جب پیغمبرؐ خدا مسخروں کے ہجوم میں پھنس جاتے ہیں تو فوراً یہ آیت نازل ہوتی ہے:

بالیقین تم سے پہلے کے پیغمبر بھی اس طرح مخالفین کے مذاق کا نشانہ بنتے تھے (سورۂ انبیاء۔ آیت ۴۱)۔ آپ کو بھی چاہیے کہ ان کی طرح ثابت قدمی سے تمام طعن و تشنیع کو بے اثر بنا دیں۔

اس اذیت پر جو مشرکین پیغمبرؐ خدا کو پہنچاتے تھے خداوند عالم پچھلے پیغمبروں کا طرزِ عمل آپ سے یوں بیان کرتا ہے:

یقیناً ہم آپ کی تمام اذیتوں پر صبر و ثبات دکھائیں گے (سورۂ ابراہیم۔ آیت ۱۲)۔

مختصر یہ کہ انبیاءؑ کی تاریخ اور اخلاق سے واقفیت سبھی کے لیے مفید ہے اور اب ہم اس پر گفتگو شروع کرتے ہیں:

نبیوں کی عوامی زندگی

چونکہ تبلیغ کا بہترین نمونہ عملی تبلیغ ہے اس لیے خدا کے پیغمبروں کو عوام کی مشکلات میں حصہ دار ہونا چاہیے تاکہ وہ میدان عمل میں لوگوں کی

تربیت اور ثبات قدم کا نمونہ ہوں اس لیے پیغمبروں کی زندگی لوگوں کی طرح عام زندگی ہوتی تھی اور وہ تکالیف میں ان کے شریک رہتے تھے۔ تمام مشکلات کا مزہ چکھتے تھے۔ دشمن کے ہاتھوں گرفتاری بیٹے کی نالائقی بیوی کی مخالفت، بیماری، تنگدستی، طعن و طنز جیسی باتیں اور دوسری مشکلات جو کم و بیش سبھی کو پیش آتی ہیں ان کو بھی درپیش ہوتی تھیں۔ ہم اس سلسلے میں چند آیتیں نقل کرتے ہیں:

ہم نے دوسروں کی طرح نبیوں کو بھی بیوی بچے اور وہ مسائل دیے جو فطری طور پر ان سے وابستہ ہیں (سورۂ رعد-آیت ۳۸)۔

آپ سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ بھی لوگوں کی طرح کھانا کھاتے اور بازار آتے جاتے تھے (سورۂ فرقان-آیت ۲۰)۔

یہ معمولی اور سادہ زندگی دشمنوں کی طاغوتی تہذیب میں قابل ملامت تھی یہاں تک کہ حضرت نوحؑ کے بارے میں وہ لوگ کہتے تھے:

یہ تمہاری ہی طرح کا انسان ہے جو تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہی پیتا ہے (سورۂ مومنون-آیت ۳۳)۔

ہم پیغمبرؐ اسلام کی تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ آپ جس وقت اپنے اصحاب میں بیٹھتے تھے تو اپنی بزم کو دائرے کی شکل میں ترتیب دیتے تھے تاکہ لوگوں میں اونچ نیچ کا فرق نہ رہے اور آپ کے بیٹھنے کا طریقہ، لباس اور برتاؤ ایسا تھا کہ جو نووارد مسجد میں آتا تھا وہ بیٹھے ہوئے لوگوں کو ہر چند دیکھتا تھا مگر پہچان نہیں پاتا تھا کہ ان میں سے پیغمبرؐ کون ہے۔ یہ ہے رہبر کی زندگی کے بارے میں اسلامی حکومت کا نقشہ۔

پیشے کے لحاظ سے اکثر انبیاءؑ مویشی پالتے اور کھیتی باڑی کرتے اور بھیڑیں چراتے تھے۔

سفر میں کھانا پکاتے وقت پیغمبرؐ لکڑیاں جمع کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا کرتے تھے۔ نہ صرف انبیاء بلکہ ان کے مکتب فکر کے درجہ اول کے شاگرد اور ان کے جانشین بھی ایسے ہی تھے مثلاً حضرت امام سجاد علیہ السلام ایک اجنبی قافلے کے ساتھ حج کرنے جاتے ہیں تو سالار کارواں سے طے کر لیتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کی خاطر حاجیوں کے تمام کام فخر کے ساتھ اپنے ذمے لیے رکھیں گے۔

ایک شخص حمام میں آتا ہے اور حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو دیکھتا ہے لیکن وہ انھیں نہیں پہچانتا اور ان سے کہتا ہے کہ میرے جسم کو دستانے سے رگڑو۔ امام علیہ السلام کسی عذر کے بغیر اطمینان سے یہ خدمت قبول کر لیتے ہیں لیکن جب وہ شخص پہچان لیتا ہے کہ یہ امام علی رضا علیہ السلام ہیں تو سخت شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں جب تک میں تمھارے جسم پر دستانہ نہ رگڑ نہ لوں گا ہاتھ نہ روکوں گا۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: لڑائیوں میں جب کوئی دشوار مرحلہ پیش آجاتا تھا تو ہم پیغمبرؐ خدا کی پناہ لیتے تھے اور ان کے پیچھے کھڑے ہو جاتے تھے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام وقتاً فوقتاً گھر میں حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کی مدد کیا کرتے تھے۔

غرض یہ ہے ہمارا مکتب فکر اور ہماری تہذیب اور ہمارے پیشواؤں کا چلن اور سیرت، ہم نہایت فخر کے ساتھ یہ نمونے پوری دنیا کے سامنے پیش

کرتے ہیں تاکہ اگر لوگ مساوات، حسن اخلاق اور انصاف کا دم بھریں تو وہ یہ جان لیں کہ انھوں نے دنیا کو یہ کوئی نیا تحفہ پیش نہیں کیا اور ان کے پاس اپنے لیڈروں کا کوئی قابل تقلید نمونہ عمل بھی نہیں ہے۔

انبیاءؑ کو تنبیہ

نبیوں کو خدا سے جتنا زیادہ قرب اور عشق تھا اس کی بنا پر ان کو وقتاً فوقتاً سخت تنبیہیں بھی کی جاتی تھیں کہ اگر ایک لمحے کو بھی خدا کے حکم سے باہر ہوئے تو نہایت سخت بلاؤں میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ نمونے کے طور پر چند آیتیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ اگر تم نے خدا کے ساتھ شرک کیا تو تمھارے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے (سورۂ زمر۔ آیت ۶۵)۔

۲۔ (اے رسولؐ) اگر تم نے معصوم رہبر کے قیام اور تقرر کے متعلق ہمارا پیغام لوگوں تک نہ پہنچایا تو گویا تم نے کار رسالت انجام ہی نہیں دیا (سورۂ مائدہ۔ آیت ۶۷)

۳۔ اگر پیغمبر ہم سے کوئی ایسی بات منسوب کرے جو ہم نے اس سے نہیں کہی ہے تو ہم اس کو پوری قوت سے پکڑ لیں گے (اور اس کا منصب چھین لیں گے) اور اس کے بعد اس کی رگ جاں کاٹ دیں گے (سورۂ حاقہ، آیات ۴۴ تا ۴۶)۔

قرآن میں اس قسم کی آیتیں کم نہیں ہیں جو پیغمبروں کو خبردار کرتی ہیں اور

انھیں ہر وقت نظر میں رکھتی ہیں۔ بعض موقعوں پر ان پر سخت غصہ ظاہر کرتی ہیں اور اس طرح انھیں ہر غلطی سے بچاتی ہیں۔

پیغمبروں کا اخلاق

جب خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دی کہ تم اپنی قوم کے رہبر اور ہمارے پیغمبر ہو تو انھوں نے خدا سے جو پہلی چیز طلب کی وہ کشادہ دلی، بلند پایہ روح، صبر، ثبات قدم اور حوصلہ تھا۔ انھوں نے خدا سے یوں دعا مانگی:

اے خدا! میرا سینہ کھول دے (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۲۵)۔

بھلا کونسی طاقت ہے جو تہمتوں، مذاقوں، بے عزتیوں، تخریب کاریوں اور بے جا مطالبوں کے سیلاب کے سامنے خدا کی بخشی ہوئی ہمت اور امداد غیبی کے بغیر بھڑ سکتی ہے۔ ہاں وہ کشتی جو ان سب سختیوں کا بوجھ اٹھا لیتی ہے وہ صبر ہی کی کشتی ہے۔

انسانوں کے پاس جو پیغمبر بھی آیا اس کا مذاق اڑایا گیا۔

(سورۂ حجر۔ آیت ۱۱)

انسانوں کے لیے جو بھی پیغمبر آیا اسے جادوگر یا مجنوں کہا گیا۔

(سورۂ ذاریات۔ آیت ۵۲)

ہمارے محترم پیغمبرؐ کو تو شاعر اور کاہن بھی کہا گیا لیکن آپ نے جو بقول قرآن، خلق عظیم اور شفقت اور خصوصی رحمت کے مالک تھے۔ ان سب باتوں کو برداشت کیا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو رسالت کا بوجھ منزل تک نہیں پہنچا سکتے تھے اور لوگ آپ سے دور بھاگ گئے ہوتے (سورۂ آل عمران آیت ۱۵۹)۔

جس وقت پیغمبرؐ خدا کی کوئی بیوی بھی آپ کی توہین کرتی تھی تو آپ کے اصحاب ناخوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اس بدزبان بیوی کو گھر سے نکال دیجیے، لیکن آپ جواب میں فرماتے تھے کہ میں اس کی ان کمزوریوں کو اس کی خوبیوں کے برابر رکھ کر ان زیادتیوں سے درگزر کرتا ہوں۔

پیغمبرؐ خدا لوگوں کی بخشش کی دعا مانگتے تھے، ان سے کچھ امور میں بعض وجوہ سے مشورہ کرتے تھے، ان پر مہربانی کرتے اور ان کی ہدایت میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے، یہاں تک کہ خدا نے آپ سے خطاب فرمایا:

ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم اپنے آپ کو اس قدر مشقت میں ڈالو (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱)۔

اور دوسری جگہ پیغمبرؐ خدا سے یوں فرمایا:

گویا تم اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک کیے ڈالتے ہو کہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے (سورۂ کہف۔ آیت ۶)۔

جتنا علم بڑھتا جاتا ہے ان کی علمی قدر و قیمت اور اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ حقیقت پر نظر رکھتے تھے اور ہر قسم کے سماجی اور خاندانی تعصب، غریبی، امیری، خوف اور ہار کے تصور سے بالاتر تھے۔

آنحضرتؐ اگرچہ کبھی غارِ حرا میں عبادت کرتے تھے اور کبھی کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے تھے۔ کسی دن میدانِ جہاد میں تلوار سونتتے تھے تو کبھی مسجدِ قبا کی تعمیر کے لیے مٹی پتھر ڈھوتے تھے اور ایک روز مکے کو بھی فتح کر لیا لیکن اس تمام اونچ نیچ نے آپ کی سوچ پر کوئی اثر ڈالا نہ اختیار پر اور نہ گفتگو پر۔ آپ ہمیشہ اسی اصلیت اور حقیقت

کی پیروی کرتے رہتے تھے جسے آپ نے اپنے پورے وجود سے دریافت کیا تھا اور جس کی تبلیغ پر مامور ہوئے تھے۔

اخلاص

نبیوں کی ایک اور خصوصیت اخلاص کا معاملہ ہے۔ خدا کے یہ بندے کسی سے کوئی امید نہیں رکھتے تھے۔ قرآن مجید سورۂ شعراء آیت ۱۰۹ سے ۱۸۰ تک حضرت نوحؑ، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کے پیغاموں کا خلاصہ بیان کرتا ہے کہ وہ سب ایک آواز ہو کر کہتے تھے کہ ہمارا اجر خدا کے ہاں ہے۔ ہمارے پیغمبرؐ نے بھی بار بار اعلان کیا کہ میں تم لوگوں سے اس کے سوا اور کوئی معاوضہ نہیں مانگتا کہ خدا کی راہ اختیار کرو (سورۂ فرقان۔ آیت ۵۷)۔ اس اجرت کا فائدہ دراصل خود لوگوں ہی کو مل جاتا ہے۔ بالکل اس استاد کی طرح جو اپنے شاگردوں سے کہتا ہے: میرے پڑھانے کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اپنا سبق خوب یاد کرنا یا تم میں سے ہر ایک، ایک ایک کلو لکڑیاں کلاس کے آتش دان میں جلانے کے لیے لے آنا۔

ظاہر ہے سبق کا یاد کرنا، کلاس روم کو گرم کرنے کے لیے لکڑیاں لانا بھی حقیقت میں ایسا معاوضہ ہے جس کا فائدہ خود شاگردوں ہی کی ذات کو پہنچتا ہے اور اگر قرآن کہتا ہے: اے پیغمبرؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے اس کام کی اس کے سوا اور کوئی اجرت نہیں چاہتا کہ تم میرے اہلبیتؑ سے محبت کرو (سورۂ شوریٰ۔ آیت ۲۳) تو اس کا مقصد یہی ہے کہ معصوم

رہبروں کی یہ محبت خدا اور انبیاءؑ کے راستے کو ہمیشہ جاری رکھنے والی ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں رسالت کا اجر اہلبیتؑ اور معصوم رہبروں سے وابستہ ہے وہیں خدا کی راہ کا اختیار کرنا بھی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی راہ اور معصوم پیشواؤں کی راہ ایک دوسرے سے قطعی جدا نہیں ہے بالکل اسی طرح جیسے خدا کی کتاب اور عترتِ رسولؐ میں اٹوٹ ابدی رشتہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ انبیاءؑ اس عمل کے سوا جو اُن کے مکتب کو قبول کرنے اور اسے دوام بخشنے کا ذریعہ تھا لوگوں سے کوئی مادی اجرت نہیں مانگتے تھے اس لیے کہ یہ اجرت بھی جیسا کہ کہا گیا ہے خود لوگوں ہی کے فائدے کے لیے ہے (سورۂ سبا۔ آیت ۴۷)۔

یہی نہیں کہ وہ کسی سے مادی شے کی امید نہیں رکھتے تھے بلکہ کسی سے مادی شے کا وعدہ بھی نہیں کرتے تھے جیسا کہ ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں:

کچھ لوگ پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں پہنچے اور آپ کے سامنے یہ شرط پیش کی کہ اگر ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو کیا آپ اپنا منصب اور حکومت اپنے بعد ہمارے سپرد کر جائیں گے؟

پیغمبرؐ خدا نے فرمایا: گفتگو کا موضوع رسالت اور عبادت کا مسئلہ ہے جس کا تعلق خدا سے ہے نہ کہ مجھ سے۔ وہ لوگ اور ہیں جو امام علیؑ کے قول کے مطابق دودھ کو پستان میں ہی تقسیم کرنا چاہتے ہیں اور تقرر، معزولی شرط بندی اور منافع میں شرکت کو دنیا اور اس کی حکومت پر منحصر رکھتے ہیں۔

یہ صرف پیغمبرؐ خدا کی ذات ہے جو مشرکوں کی تمام پیشکشوں، مادی وعدوں اور ناقابلِ بیان ترغیبات کے مقابلے میں فرماتے ہیں: خدا کی قسم اگر تم

میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو اور مجھے پوری کائنات کا حاکم بنا دو، تب بھی میں جس راہ پر گامزن ہوں اس سے نہیں پلٹوں گا[1] اور ایسی دو ٹوک بات کہنا نبیوں کی ایک خصوصیت ہے۔

عصمت

نبیوں کی ایک اور خصوصیت عصمت ہے۔ عصمت کے معنی یہ ہیں کہ انسان ایمان تمیز اور یقین کامل کی بدولت ایک ایسی ذہنیت کا مالک بن جائے جو پوری آزادی اور علم کے ساتھ گناہ کے پاس نہ پھٹکے بلکہ گناہ کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

بعض لوگوں کے خیال کے برعکس جو اس امکان پر تعجب کرتے ہیں کہ انسان گناہ کا خیال بھی نہ کرے، ہمارے نزدیک یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ آپ خود بہت سے غلط اعمال کے سلسلے میں باعصمت ہیں یعنی نہ آپ ان اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں اور نہ آپ نے ان کے بارے میں سوچا ہی ہے۔ اگر آپ اس سے انکار کرتے ہیں تو مندرجہ ذیل سوالات کا جواب دیجیے:

۱۔ کیا آپ لوگوں کے سامنے کبھی الف ننگے ہو کر گئے ہیں؟

۲۔ کیا آپ نے کبھی اپنے آپ کو آگ لگائی ہے؟

۳۔ کیا کبھی آپ نے خود کو مینار کی بلندی سے گرایا ہے؟

---

[1] سیرت ابن ہشام - جلد ۱ صفحہ ۲۶۵

۴۔ کیا کبھی آپ نے کسی خدا سے محبت کرنے والے کو قتل کیا ہے؟

ان تمام سوالوں کا جواب عموماً ہمارے نزدیک نفی میں ہے۔

کیونکہ ہم اس حد تک واقف ہیں کہ ان اعمال کے نفع نقصان کو ہم نے مان لیا ہے اور یہ یقین کر لیا ہے کہ یہ مسئلہ ہمارے دماغ سے گزر کر دل تک پہنچ گیا ہے۔ اب یہاں ہمیں یہ علم نہیں ہے کہ ہمیں واقعی یقین آچکا ہے اور نہ ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہم نے مان لیا ہے۔ واقعی اگر ہم کو یہ یقین ہو جائے اور ہم دل کی گہرائیوں سے یہ جان لیں کہ یہ طنز اور غیبت جو ہم آج کر رہے ہیں قیامت میں مجسم ہو کر کیا شکل اختیار کرے گی تو ہم کبھی غیبت کا خیال بھی نہ کریں۔ ہمارا عیب یہ ہے کہ ہماری معلومات دماغ سے گزر کر دل میں جاگزیں نہیں ہوتی ہیں اور اس بات کا ہمیں علم ہے یقین نہیں اس لیے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ کام برا ہے لیکن پھر بھی اس کے مرتکب ہوتے ہیں، نیچے کی مثال پر غور کیجیے:

ہم جانتے ہیں کہ مردہ دانت، گھونسا یا لات نہیں مار سکتا لیکن ڈرتے ہیں کہ اس کے پاس رات کو ایک کمرے میں کیونکر سوئیں؟ یہ اس لیے کہ ہمارا علم دماغ سے گزر کر دل تک نہیں پہنچا ہے۔ علم ابھی ایمان اور یقین میں تبدیل نہیں ہو پایا ہے لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ غسال اندھیری رات میں تنہا کسی ڈر کے بغیر صبح ہونے تک مردے کے پاس وقت کاٹ دیتا ہے۔

اس مثال میں ہم میں اور غسال میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ ہم کو صرف علم ہے اور اسے یقین ہے اس لیے گناہ سے بچنے کا اصلی سبب حقیقی ایمان، گہرا علم اور مکمل یقین ہے۔

یقین کی علامت

پیغمبرؐ خدا نے صبح کی نماز کے بعد لوگوں کی طرف رخ کیا تو ایک جوان کو دیکھا۔ اس کا رنگ زرد تھا، آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ نے حال پوچھا تو اس نوجوان نے کہا: اس وقت جو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو حالتِ یقین میں ہوں۔ پیغمبرؐ خدا کو یقین کا لفظ سن کر تعجب ہوا، کیونکہ جوان نے یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے علم ہے یا میں جانتا ہوں بلکہ یہ کہا تھا کہ مجھے یقین ہے آنحضرتؐ نے اس جوان سے یقین کی علامت پوچھی تو وہ بولا، میں قیامت کا یقین اس طرح کرتا ہوں کہ اس نے میری نیند اڑا دی ہے گویا ایک طرف جہنم اور اس کے آتشیں شعلے اور دوسری طرف جنت کی کثیر نعمتیں، عدل خداوندی کا دربار، لوگوں کا ہجوم اور اعمال کے حساب کتاب کے لیے خود اپنی حاضری بھی دیکھ رہا ہوں۔

پیغمبرؐ خدا نے جب جوان کی علامتیں سنیں تو اس کا دعویٰ مان لیا۔ پھر اس نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے راہ خدا میں شہید ہونے کی دعا فرمائیں۔ آپ نے اس کے لیے دعا کی اور کچھ عرصے کے بعد ایک جنگ ہوئی جس میں وہ شریک ہوا اور صرف وہی شخص تھا جو حق و باطل کی اس جنگ میں راہِ خدا میں شہادت کے درجے پہ فائز ہوا۔

آسمانی رہبر کے لیے عصمت کی شرط

ہم اس شعر کے مضمون کو عصمت کے لازم ہونے کی دلیل سمجھ سکتے ہیں:

ہر چہ بگندد نمکش میزنند
وای بہ روزی کہ بگندد نمک

جو چیز خراب ہونے لگتی ہے اس پر نمک چھڑک دیتے ہیں۔
اس دن پر افسوس ہے جب نمک بھی خراب ہو جائے گا۔

ہمیں معصوم رہبر کی ضرورت ہے اس کی دلیل ہماری وہی لغزش، غلطی اور فکر و عمل کی کجی ہے۔ اس دن پر افسوس ہے جب ہمارا رہبر بھی غلطیاں کرنے لگے کیونکہ اس صورت میں اس کو بھی ایک معصوم رہبر کی ضرورت پڑجائیگی۔

دوسری طرف یہ ضروری ہے کہ خدا بندوں پر اپنی حجت پوری کرے اور ان کے لیے بہانے کی گنجائش باقی نہ چھوڑے۔ یہ بات معصوم رہبروں کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی۔

رہبری کی ذمہ داری کسی ایسے شخص کے کندھوں پر کیسے رکھی جا سکتی ہے جو خود خطا، غلطی اور گناہ سے محفوظ نہیں ہے۔

مزید برآں کیا لوگوں کی رہبری کسی گنہگار آدمی کے سپرد کر دینا انسان کی اہانت نہیں ہے؟

قرآن مجید ہم سب کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل کرتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

اے خدا! پیشوائی اور رہبری کا منصب میرے بعد میری اولاد کو بھی عطا فرما لیکن بلا تاخیر یہ جواب آیا: خدا کا یہ عہد یعنی رہبری کا منصب ظالم اور گنہگار انسان کو نہیں مل سکے گا۔ (سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴)۔

علاوہ ازیں قرآن میں ہمیں جا بجا حکم دیا گیا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت کرو۔ چنانچہ یہ حکم پیغمبروں کی عصمت کی دلیل ہے کیونکہ اگر پیغمبر ہر قسم کی کمزوری گمراہی اور گناہ کے مرتکب ہوا کرتے تو چاہیے تھا کہ رسولؐ خدا کی اطاعت کے بارے میں کتاب خدا کا حکم مشروط ہوتا جس طرح والدین کی اطاعت نہایت ضروری ہونے کے باوجود مشروط ہے چنانچہ وہ مقام بھی آتا ہے جب اولاد کو صاف صاف بتا دیا جاتا ہے کہ والدین کی پیروی نہ کرو:

> اگر تمھارے ماں باپ کوشش کریں کہ تم کسی ایسی چیز کو میرا شریک بناؤ جس کے بارے میں تم نہیں جانتے تو انکی اطاعت مت کرو (سورۂ لقمان۔ آیت ۱۵)۔

محترم قارئین! والدین کی مشروط اطاعت اور رسولؐ کی بے قید اور بلا شرط اطاعت کا مقابلہ کرنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ پیغمبر عصمت کی اس منزل پر ہوتا ہے کہ اس کی پیروی میں کسی قید اور شرط کی ضرورت نہیں ہے۔ بقول قرآن کریم:

> وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے۔ ان کی گفتگو وحی کے مطابق ہوتی ہے (سورۂ نجم۔ آیت ۳)۔

کچھ یاد دہانیاں

۱۔ بعض لوگوں کے خیال کے برعکس جو کچھ قرآنی آیات کی آڑ لیکر پیمبروں کی عصمت کو مجروح کرتے ہیں۔ آیات، روایات اور عقلی دلیلوں کے اس مجموعے میں جو ہمارے پاس ہے عصمت کا منصب ان تنبیہوں

اعلانوں اور خفگیوں سے جو قرآن میں ہیں کوئی تضاد نہیں رکھتا یہی خفگیاں خود عصمت کا راستا کھولنے والی ہو سکتی ہیں اور انبیاءؑ کے بارے میں غلو کرنے سے روک سکتی ہیں۔ ہم چونکہ مختصربات کہنے اور آسان نویسی کا ارادہ رکھتے ہیں اس لیے ان مباحث سے احتراز کرتے ہیں۔

ب۔ چونکہ آسمانی رہبروں میں کوئی ایسی کمزوری اور خامی نظر نہیں آنی چاہیے جو دشمنوں کے لیے بہانہ بن جائے اور دوستوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے اس لیے یہ لازم ہے کہ پیغمبر نہ صرف تبلیغ میں بلکہ عقائد اور احکام میں بھی اور نہ صرف گناہان کبیرہ میں بلکہ تمام گناہوں میں اور نہ صرف ارادی غلطیوں میں بلکہ غیرارادی غلطیوں اور بھول چوک میں بھی معصوم ہوں تاکہ مذکورہ بالا بیان کے مطابق دشمنوں کو کسی قسم کی آڑ یا بہانہ ہاتھ نہ آئے اور دوستوں کے اعتماد کے اکھڑ جانے کا سبب باقی نہ رہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

خدا کے لیے پوری پوری اور کامیاب حجت ہے (سورۂ انعام آیت ۱۴۹)۔

واقعی اگر پیغمبر یا امام معصوم نہ ہوں تو لوگ ان کے قول و عمل میں تضاد پائیں گے اور پھر ایسے رہبروں کی موجودگی میں کیا یہ کہا جا سکے گا کہ خدا نے لوگوں کے لیے اپنی حجت تمام کر دی ہے؟

ج۔ عصمت، پیغمبروں کے استغفار اور دعاؤں سے بھی تضاد نہیں رکھتی بلکہ پیغمبر خود کو خدا کے سامنے حاضر جانتا ہے اور اس نے دل و جان سے مان لیا ہے کہ خدا اس کے خیال اور دل سے واقف اور ان کا دیکھنے والا

ہے اور اس کی تمام باتیں محفوظ ہوتی ہیں تو اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ان اعمال سے بھی جو گناہ نہیں ہیں شرمندگی محسوس کرتا ہے۔

میں خود اگر گھر میں چند بار بھی کھانسوں تو شرمندگی محسوس نہیں کرتا لیکن جب میں ٹیلی ویژن کے کیمرے کے سامنے درس قرآن دینے کھڑا ہوتا ہوں تو ایکبار کھانسنے سے بھی بے چین ہو جاتا ہوں حالانکہ یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت میں اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پاتا ہوں۔ اولیاءاللہ جو خود کو خدا کے روبرو حاضر جانتے ہیں وہ اپنے ذرا سے عمل کا بھی ایسا احساس رکھتے ہیں جیسا دوسرے نہیں رکھ پاتے اور یہی ہے پیغمبر اور معصوم اماموں کی بخشش طلبی، مناجات اور دعاؤں کا فلسفہ۔

انبیاءؑ کی کچھ خصوصیات

آیات اور روایات کے مجموعے سے پیغمبروں کی صفات شمار کی جا سکتی ہیں جن کی فہرست یوں ہے:

۱۔ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم ہو۔

۲۔ ایسی بیماریوں سے محفوظ ہو جن سے عوام نفرت کرتے ہیں۔

۳۔ قوت، صلاحیت، صبر، برداشت، حسن کارکردگی اور حسن اخلاق رکھنے اور خود اپنے کہے پر عمل کرنے والا ہو بلکہ ان صفات میں اپنے زمانے کے تمام لوگوں سے بڑھا ہوا ہو۔

۴۔ عقل کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔

۵۔ اس سے پہلے کے پیغمبر اس کی اطلاع دے چکے ہوں۔

۶۔ انسان کو بخوبی سمجھنے والا ہو۔

۷۔ انسانوں کے تمام جذبوں، جبلتوں اور تربیت و ہدایت کے طریقے سے واقف ہو۔

۸۔ سماجی حالات، سماج کی ترقی و تنزل کے اسباب، مفید اور ضروری عاقبت اندیشی اور فرد اور سماج کی پیش رفت کے لیے سب سے آسان اور موثر طریقے جانتا ہو۔

۹۔ اس کی تعلیمات فطرت کے مطابق اور دیگر پیغمبروں کی تعلیم سے میل رکھتی ہوں۔

۱۰۔ خاندانی شرافت رکھنے والا اور نجیب الطرفین ہو، بھولنے اور بھٹکنے والا نہ ہو، نہایت عاجزانہ قسم کی عبادت کرنے والا اور شجاعت کے سب سے بلند اور سب سے قوی مقام پر فائز ہو۔ ان اوصاف کے دسیوں نمونے سیکڑوں آیتوں اور حدیثوں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

خدا کی اطاعت

ایسے تمام لوگوں کے برعکس جن کے سوچ، عمل، قیافے اور خود نمائی پر ادنیٰ سا منصب یا ذمہ داری بھی اثر ڈال دیتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام بلند مناصب کے باوجود جن پر وہ فائز ہیں خدا کی طاعت اور مومنوں کے ساتھ فروتنی کے دائرے سے کبھی باہر نہیں نکلے۔ وہ بچوں تک کو سلام کرتے اور گھر میں یا سفر میں اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ میدان جنگ میں دوسروں کی بہ نسبت دشمنوں سے زیادہ قریب رہتے تھے جیسا کہ

قرآن کا بیان ہے۔ آپ نے بار بار فرمایا کہ "میں بھی تمہاری ہی طرح کا انسان ہوں۔" آپ دوسروں کے مقابل کسی قسم کا احساس برتری یا شخصی دباؤ نہیں رکھتے تھے۔ قرآن صاف صاف کہتا ہے: کوئی شخص اس وجہ سے کہ ہم نے اسے وحی، کتاب، نبوت، انصاف اور حکومت کا منصب عطا کر دیا ہے، یہ حق نہیں رکھتا جو لوگوں سے کہے کہ میری اطاعت قبول کرو (سورۂ آل عمران۔ آیت ۷۹)۔

بے شک پیغمبر اپنے بیٹے کی سفارش کا حق نہیں رکھتا جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت نوح ؑ کی اپنے بیٹے کے بارے میں سفارش اس جملے سے رد کر دی گئی تھی کہ وہ تجھ سے اور تیری پیروی میں نہیں ہے (سورۂ ہود آیت ۴۶)۔

علم غیب

نبیوں کی ایک خصوصیت ان کا علم غیب سے واقف ہونا ہے۔ اس بارے میں قرآن کہتا ہے:

> خدا غیب کا علم رکھتا ہے اور سوائے ان لوگوں کے جو اس کے پسندیدہ ہیں مثلاً پیغمبر وغیرہ اس سے اور کسی کو آگاہ نہیں کرتا (سورۂ جن۔ آیت ۲۶، ۲۷)۔

ایک سوال

قرآن کی بعض آیتوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی غیب

کا حال نہیں جانتا (سورۂ انعام - آیت ۵۹) تو ان آیات کی موجودگی میں جو علم غیب کو صرف خدا میں منحصر کرتی ہیں، آپ پیغمبروں اور اماموں میں علم غیب کس طرح ثابت کرتے ہیں؟

جواب

علم غیب بنیادی طور پر صرف خدا کے لیے ہے اور اگر پیغمبر اور امام کوئی بات جان لیتا ہے تو خدا ہی انھیں بتاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ خدا کی طرح از خود غیب کا حال جانتے ہوں۔ ایک واقعے کے سلسلے میں جب پیغمبر خدا کی کسی زوجہ نے آپ سے پوچھا کہ آپ کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی تو آنحضرت نے جواب دیا: مجھے دانا اور آگاہ خدا نے خبر دی ہے (سورۂ تحریم آیت ۳)۔

دوسری بات یہ ہے کہ علم غیب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ایسے معاملات کا علم ہے جن کا علم صرف خدا سے مخصوص ہے اور وہ اس علم سے کسی کو آگاہ نہیں کرتا جیسا کہ ہم دعا میں پڑھتے ہیں: اے خدا! اس علم کے طفیل میں جو صرف تیرے اختیار میں ہے۔

لیکن کچھ دوسرے امور بھی ہیں جن کا تعلق اگرچہ علم غیب ہی سے ہے لیکن خدا اپنے اولیاء کو ان کے بارے میں علم عطا فرما دیتا ہے[۱] یہی علم غیب، خدا کی اطاعت، عصمت، اعجاز، قطعیت، عشق، گریہ اور مناجاتیں ہیں جو دوسروں سے انبیاءؑ کا درجہ بلند کرتی ہیں۔ ہم نے کچھ مصلح (اصلاح کرنیوالے)

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب فلسفۂ ولایت مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی

دیکھے ہیں یا انکے بارے میں سنا ہے کہ انکا واحد مقصد ایک ایسے سماج کی تشکیل تھا جس کے افراد نیک اور فرض شناس ہوں لیکن یہ صرف انبیاءؑ ہی ہیں جو ایک طرف مختلف صفات رکھنے اور دوسری طرف غیبی امداد حاصل ہونے کے باعث دوسرے لوگوں سے الگ نظر آتے ہیں۔

انبیاءؑ کی بہت سی صفات میں سے چند ایک مثلاً علم غیب رکھنا، عصمت کے منصب پر فائز ہونا، خدا کی اطاعت اور یقین وغیرہ کے بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت طیبہ کے بارے میں بھی کچھ گفتگو کریں۔ شاید آنحضرتؐ کی زندگی سے واقفیت آپ کی امت کے لیے نصیحت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت کی ایک جھلک

تمام نبیوں میں صرف پیغمبرؐ اسلام ہی ہیں جن کی زندگی کے متعلق معمولی سے معمولی واقعات بھی ضبط تحریر میں آگئے ہیں اور یہ مسلمانوں کا ایک باعث فخر اور شاندار کارنامہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ دوسرے نبیوں کے سوانح حیات ان کے مدتوں بعد بہت زیادہ ردوبدل اور کئی ایک غلط باتوں کے اضافے کے ساتھ ان کے بعض دوستوں کے ہاتھوں لکھے گئے ہیں۔ تاہم ہمارے پیغمبرؐ کے اخلاق کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے زیادہ تر عربی زبان میں ہیں اور چونکہ ہم نے اس کتاب کے سابقہ ابواب میں انبیاءؑ کی پہچان، ان کے کارناموں اور صفات کے متعلق بحثیں کی ہیں لہٰذا ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ

اس مرحلے پر جزوی طور پر اپنے محترم پیغمبرؐ کی سیرت بھی بیان کر دیں کیونکہ آنحضرتؐ کی سیرت، زندگی کے نہج اور انفرادی روش سے واقفیت بلا استثناء سب لوگوں کے لیے مفید ہے۔ میں یہاں جو کچھ کہنے والا ہوں وہ میں نے بحار الانوار کی سولھویں جلد، سیرت ابن ہشام، کحل البصر اور تفسیر المیزان کی چھٹی جلد وغیرہ سے اخذ کیا ہے۔

آپؐ کی غمخواری اور ہمدردی

پیغمبرؐ خدا کی بعثت سے پہلے ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ لوگوں پر سخت مصیبت آ گئی۔ کچھ کچھ قحط کے آثار پیدا ہو گئے۔ حضرت ابوطالبؑ بھی اور لوگوں کے ساتھ پریشان تھے کیونکہ آپ کے وسائل محدود اور کنبہ بڑا تھا۔

پیغمبرؐ خدا نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے کہا کہ حضرت ابوطالبؑ کے پاس چلیں اور ہم میں سے ہر ایک ان کا ایک ایک بیٹا اپنے گھر لے آئے اور اس طرح ان پر سے یومیہ اخراجات کا کچھ بوجھ کم کر دیں۔ اس فیصلے پر عمل کیا گیا چنانچہ حضرت عباسؓ جعفرؓ کو اپنے گھر لے آئے اور پیغمبرؐ خدا امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کو اپنے گھر لے آئے اور اسی بچپن کے زمانے میں انکے مربی بن گئے۔ یہ تھی ایک مثال رسولؐ خدا کی ہمدردی کے جذبے کی۔

آپؐ کا اخلاق

آپؐ سادہ فرش اور چٹائی پر سوتے تھے۔ اپنے جوتوں اور کپڑوں میں خود پیوند لگاتے تھے۔ جب آپؐ کی توہین بھی ہوتی تھی تو آپ مسکرا دیتے

تھے۔ خود بازار جاتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں گھر لے آتے تھے۔

انس بن مالکؓ کہتے ہیں: میں برسوں پیغمبرؐ خدا کے گھر میں رہا لیکن آپؐ نے کبھی مجھے کسی بات پر نہیں ٹوکا۔

آپؐ گھر میں بکریوں کا دودھ دوہتے، بچوں تک کو سلام کرتے، غلاموں کی دعوت قبول کر لیتے اور جس کھانے سے رغبت نہیں ہوتی تھی اس کی بھی برائی نہیں کرتے تھے مسواک کرنے، عطر لگانے، روز جمعہ غسل کرنے اور گھر سے نکلتے وقت وضع قطع کی درستی کے بارے میں اور سفید لباس پہننے پر کافی دھیان دیتے اور اہتمام کرتے تھے۔ کھانا کھاتے وقت کسی چیز پر ٹیک نہیں لگاتے تھے تاکہ خدا کی نعمتوں کے سامنے بیٹھنے کا انداز پر غرور نہ ہو جائے۔

ازواج سے برتاؤ

اس کے باوجود کہ رسولِ خدا کی اکثر بیویاں سن رسیدہ، یتیم بچوں کی مائیں، بیوائیں اور مختلف عادتیں رکھنے والی تھیں لیکن جیسا کہ قرآن میں آیا ہے کہ بیویوں سے اچھا سلوک کرتے رہو (سورۂ نساء۔ آیت ۱۹) ان کے ساتھ پیغمبرؐ خدا کا برتاؤ بالکل نیک اور فطری تھا۔ ان میں سے بعض بیویاں کبھی کبھی ایسا نامناسب برتاؤ کرتی تھیں کہ پیغمبرؐ خدا کے اصحاب بھی ان کے چلن سے ناخوش ہو جاتے تھے اور کہتے تھے یا رسول اللہ انھیں چھوڑ دیجیے۔ آپؐ فرماتے تھے کہ عورتوں کی خامیوں کو ان کی اچھی باتوں اور بعض خوبیوں کے برابر رکھ کر حساب لگاؤ۔ انسان کو یہ نہیں چاہیے کہ ذرسی ناخوشی اور برے سلوک کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دیدے کیونکہ عورتیں کچھ خوبیاں اور کمالات بھی

رکھتی ہیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: جو شخص مال و دولت کے لحاظ سے خوشحال ہو اور پھر بھی اپنے بیوی بچوں سے کنجوسی برتے وہ ہم میں سے نہیں ہے (مستدرک جلد۲ صفحہ ۶۴۳)۔

حضرت خدیجہ علیہا السلام کی محبت کے باعث ان کے انتقال کے بعد آنحضرتؐ ان عورتوں کا بھی احترام کرتے تھے جو خدیجہ کی سہیلیاں تھیں۔

پیغمبرؐ خدا فرمایا کرتے تھے: میں اپنے گھر والوں سے سب سے بہتر سلوک کرتا ہوں (وسائل جلد۱۴ صفحہ ۱۲۲)۔

آپؐ اپنی ازواج کے درمیان ایسے انصاف سے کام لیتے تھے کہ ان دنوں میں بھی جبکہ آپ کی بیماری شدت پکڑ گئی تھی ہر رات کو آپ کا بستر باری باری سے کسی ایک کے کمرے میں لگا دیا جاتا تھا۔

بچے کی حالت کا لحاظ

لوگ ایک نومولود بچے کو آنحضرتؐ کے پاس دعا کے لیے یا نام رکھنے کی غرض سے لیکر آئے۔ نومولود نے آپؐ کی گود میں پیشاب کر دیا۔ بچے کی ماں اور پاس کھڑے ہوئے دوسرے لوگ بہت پریشان ہو گئے لیکن آپ نے فرمایا: اس بات کو جانے دو میں اپنے کپڑے دھوئے لیتا ہوں۔ تمہارے شور مچانے سے معصوم بچہ ڈرا جاتا ہے (کحل البصر)

آپؐ بچوں کو سلام کرتے تھے

آپ لڑکوں اور بچوں کا نام عزت سے لیتے تھے اور خاص طور پر

لڑکی کے بارے میں خصوصی ہدایات دیتے تھے۔ آپ کے مکتبِ فکر میں عورت کی عزت کرنے کا حکم موجود تھا اور آپؐ کا یہ نظریہ اس زمانے میں تھا جب لڑکی کی پیدائش سے باپ اس قدر غضبناک ہو جاتے تھے کہ جوش اور غصے سے ان کے چہرے کا رنگ کالا ہو جاتا تھا (سورۂ نحل۔ آیت ۵۸)۔ ایسی فضا میں لڑکے لڑکی کا خصوصی احترام نہایت نمایاں اور قابلِ قدر ہے۔

بے شک جس زمانے میں لڑکی کا وجود بے عزتی سمجھا جاتا تھا پیغمبرِ خدا فرماتے تھے: تمھاری بہترین اولادیں لڑکیاں ہیں اور عورت کی بھاگوانی کی علامت یہ ہے کہ اس کی پہلی اولاد لڑکی ہو (مستدرک جلد ۲ صفحات ۶۱۴، ۶۱۵)۔ آپؐ کے ایک صحابی آپؐ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو خبر ملی کہ ان کی بیوی کے لڑکی ہوئی ہے، وہ ناخوش ہو گئے۔ آپؐ نے یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا: زمین اس کے رہنے کی جگہ، آسمان اس کے لیے سایہ اور اس کا رزق خدا کے پاس ہے، تم کیوں ناخوش ہو گئے؟ وہ ایک خوشبودار پھول کی طرح ہے جس سے تم کو فیض پہنچے گا (وسائل جلد ۱۵ صفحہ ۱۰۱)۔

ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے اپنے بچے کو کبھی پیار نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا: یہ تمھاری سنگدلی کی علامت ہے۔

آپ بچوں میں برابری قائم رکھنے کے سلسلے میں بھی بہ تاکید اور ہدایت فرماتے ہیں کہ: اگر تم نے ایک بچے کو دوسرے کے سامنے پیار کیا ہے تو دوسرے کو بھی پیار کرو۔

آپ موقع پرست نہیں تھے

آنحضرتؐ کے ایک صاحبزادے کا نام ابراہیم تھا۔ ان کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی موت کے بعد سورج گہن ہوا تو لوگوں نے خیال کیا کہ یہ گہن ابراہیم کی موت کے سبب سے لگا ہے لیکن آپ نے فوراً لوگوں کو اکٹھا کیا اور فرمایا کہ سورج گہن میرے بیٹے ابراہیم کی موت کے سبب سے نہیں ہوا اور اس طرح آپ نے لوگوں کو جہالت، توہم پرستی اور بیجا محبت سے بچا لیا۔ ایسے موقع پر اگر کوئی سیاسی آدمی ہوتا تو وہ اپنے مقصد کے مطابق اس واقعے کی توجیہہ بیان کرتا، لوگوں کے اس خیال اور سوچ سے غلط فائدہ اٹھاتا اور بے جا محبت پر زور دیتا۔

آپؐ آگے آگے رہتے تھے

جنگ احزاب میں آپ کی مخالف مشرکوں، کافروں اور منافقوں کی تمام جماعتوں نے اسلام کو مٹا دینے کے ارادے سے وسیع پیمانے پر فوج کشی کی تو پیغمبرؐ خدا نے ان سے لڑنے اور اپنا بچاؤ کرنے کا فیصلہ کیا اور اصحاب کے مشورے سے یہ طے کیا کہ شہر مدینہ کے چاروں طرف ایک کھائی کھود لیں۔ اس مقام پر ہم رسولؐ خدا کو دیکھتے ہیں کہ آپ ہی نے خندق کھودنے میں پہل کی اور باوجود اس کے کہ کچھ مسلمان اجازت لیکر اور کچھ اجازت کے بغیر ہی کام چھوڑ کر چلے جاتے تھے، آپ اخیر تک خندق کھودنے میں لگے رہے۔

پیغمبرؐ خدا کی مہمان نوازی

حضرت سلمانؓ فارسی بیان کرتے ہیں: میں پیغمبرؐ خدا کے گھر پہنچا۔ جو تکیہ آپ کا تھا وہی آپؐ نے مجھے دیدیا۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آپ یہ برتاؤ ہر مسلمان کے ساتھ کرتے تھے۔

ایک دن آپ کے دودھ شریک[1] بہن بھائیوں میں سے ہر ایک آپ کی خدمت میں الگ الگ حاضر ہوا تو آپ نے بہن کا زیادہ احترام کیا۔ بعض لوگوں نے اس فرق کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا: چونکہ یہ بہن اپنے ماں باپ کی زیادہ عزت کرتی تھی اس لیے میں بھی اس سے زیادہ محبت کرتا اور اسکی عزت کرتا ہوں (بحار الانوار۔ جلد ۱۶ صفحہ ۲۸۱)۔

کبھی کبھی آپؐ کے مہمان کھانا کھانے کے بعد رخصت نہ ہوتے اور بدستور بات چیت میں لگے رہتے تھے، پھر بھی آپ برداشت کرتے تھے یہاں تک کہ آیت نازل ہوئی کہ تم جب مہمان بلائے جاؤ تو کھانا کھانے کے بعد چلے جایا کرو کیونکہ تمہارے سب بیٹھے رہنا رسولؐ خدا کو ذاتی اور اجتماعی کاموں سے روکے رکھتا ہے اور لازمی طور پہ آپ کی تکلیف کا موجب بنتا ہے (سورۂ احزاب۔ آیت ۵۳)۔

---

[1] جو بچے شریعت کی شرطوں کے مطابق ایک ہی عورت کا دودھ پیتے ہیں چاہے انکے ماں باپ الگ الگ ہوں ایک دوسرے کے دودھ شریک بہن بھائی بن جاتے ہیں اور انھیں رضاعی بہن بھائی کہتے ہیں۔

رسولِ خدا کی عبادت گزاری

جب ایک پہر رات گزر جاتی تھی تو آپؐ بستر سے اٹھ بیٹھتے تھے اور سجدہ مسواک اور کچھ آیتوں کی تلاوت کے بعد ایک طرف عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ آپؐ کی بعض بیویاں آپؐ کو اس حال میں دیکھتی تھیں تو کہتی تھیں کہ آپؐ تو معصوم ہیں، پھر اس قدر گریہ کیوں کرتے ہیں؟ آپؐ جواب دیتے تھے: کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

جب رمضان کا مہینا آتا تھا تو آپ اپنے غلاموں کو آزاد کر دیتے تھے۔ نماز کے وقت آپ پر کپکپی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ جب اکیلے نماز پڑھتے تھے تو اپنے رکوع اور سجدے لمبے کر دیتے تھے اور جب باجماعت نماز پڑھاتے تھے تو اس وقت اختصار اور سہولت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے ایک صحابی کو جو تمام مسلمانوں کے لیے امام جماعت مقرر کیے گئے تھے یہ ہدایت کی تھی کہ جب لوگوں کے ساتھ جماعت کے لیے کھڑے ہو تو کوشش کرو کہ سورۂ حمد کے بعد کوئی چھوٹی سی سورت پڑھو اور نماز کو طول نہ دیا کرو۔

پیغمبرؐ خدا کی فراست

آپ مشکلات حل کرنے میں منصوبہ بندی، اپج اور راست بازی سے کام لیتے تھے۔ ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ عرب کے مختلف قبیلوں نے مل کر کعبے کو از سرِ نو تعمیر کیا لیکن جب حجرِ اسود لگانے کا وقت آیا تو ہر ایک قبیلہ دوسرے پر سبقت کرنا چاہتا تھا تاکہ اسی کو یہ فخر حاصل ہو۔ اس پر باہمی گفتگو میں تلخی آگئی

اور جھگڑے کی سی فضا پیدا ہو گئی۔ ایک شخص نے کہا کہ کیوں نہ ہم لڑنے کے بجائے صبر سے کام لیں اور جو پہلا شخص مسجد حرام میں داخل ہو اسے اپنا پنچ اور ثالث تسلیم کرلیں۔ انھوں نے دیکھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبے میں داخل ہوئے چنانچہ لوگوں نے آپ کو اپنا پنچ اور ثالث تسلیم کرلیا۔ آپ نے حکم دیا کہ ایک چادر لے آؤ۔ جب چادر آگئی تو آپ نے حجرِ اسود کو اس کے بیچ میں رکھ دیا اور آپ کے کہنے پر ہر قبیلے کے ایک ایک آدمی نے چادر کا ایک ایک حصہ پکڑ لیا اور یوں سب مل کر اسے کعبے کے پاس لے آئے۔ پھر رسولِ خدا نے حجرِ اسود کو اٹھا کر اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دیا اور جھگڑا ختم کر دیا۔

پیغمبرِ خدا اور میدانِ جہاد

امیرالمومنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ لڑائیوں میں حضرت رسولِ خدا ہم سب سے آگے بڑھ کر دشمن کے قریب رہتے تھے اور جنگ احزاب میں جب یہ طے ہوا کہ مدینے کے گرد خندق کھودی جائے تو پیغمبرِ خدا ہی نے پہلا کدال مارا اور پھر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مسلسل اور بغیر قوم کو چھوڑے خندق کی کھدائی کے اخیر تک ذاتی طور سے نگرانی کرتے رہے جناب امیرالمومنین علیہ السلام یہ بھی فرماتے ہیں کہ لڑائیوں میں جب ہم کو کوئی مشکل پیش آجاتی تھی تو ہم لوگ رسولِ خدا سے امداد کے طالب ہوتے تھے۔

فیصلہ کن انداز

آپؐ اپنے ماننے والوں کی تعداد بڑھانے کی خاطر اپنے نظریاتی پروگرام

یا اس کے کسی ایک اصول سے بھی چشم پوشی کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ طائف سے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں پہنچے اور کہنے لگے کہ ہم آپ پر ایمان لاتے ہیں بشرطیکہ :

۱۔ آپؐ ہم کو بت پرستی کی اجازت دیدیں۔

۲۔ آپؐ ہم کو نماز پڑھنے سے معاف رکھیں۔

آپ نے ان کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ آپؐ اس بات کے لیے قطعی آمادہ نہیں تھے کہ مکتب اسلام کا ایک معمولی سا جزو بھی پامال ہو، چاہے اس کے عوض پیروؤں کی ایک بڑی تعداد کو چھوڑنا ہی پڑے۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو اپنے پیروؤں کی تعداد بڑھانے کے لیے اکثر و بیشتر ہر گھڑی اپنی شکل، نام اور نعرے کا انداز بدلتے رہتے ہیں اور سوداگروں کی طرح گاہک بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

پیغمبرؐ کا زہد

پیغمبرؐ خدا نے امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کو بارہ درہم دیے اور فرمایا کہ میرے لیے کپڑے لادو۔ امام علیؑ بازار گئے اور اسی قیمت کا لباس لیکر رسول اکرمؐ کی خدمت میں واپس آئے۔ آنحضرتؐ نے لباس دیکھا تو فرمایا: اگر لباس کچھ اور زیادہ سادہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔ اگر بیچنے والا سودے کی واپسی پر رضامند ہوجائے تو یہ لباس اسے واپس کردو۔ امام علیؑ نے وہ لباس دکاندار کو واپس کردیا اور رقم لیکر آنحضرتؐ کی خدمت میں واپس تشریف لائے۔ اس مرتبہ جناب رسولِ خداؐ خود امام علیؑ کے ساتھ بازار گئے۔ راستے میں

آپ نے ایک کنیز کو روتے دیکھا تو اس کا حال پوچھا۔

اس نے کہا: مجھے سامان خریدنے کو چار درہم دیے گئے تھے لیکن رقم مجھ سے کھو گئی ہے۔ اب میں واپس گھر جاتے ڈرتی ہوں۔

رسولؐ خدا نے ان بارہ درہم میں سے چار درہم اسے دیدیے اور بازار چلے گئے۔ چار درہم کا لباس خریدا اور پہن لیا۔ واپسی میں ایک ننگے کو دیکھا تو لباس اتار کر اسے دیدیا اور دوبارہ بازار چل دیے اور دوسرا لباس خریدا۔ گھر واپس آتے ہیں دوبارہ اسی کنیز کو دیکھا کہ پریشان ہے اور کہتی ہے کہ چونکہ گھر واپس آنے میں مجھے دیر ہو گئی ہے اس لیے میں ڈرتی ہوں کہ میرے مالک مجھے ماریں گے۔ پیغمبرؐ خدا اس کے ساتھ اس کے آقا کے گھر تک گئے چنانچہ اس نے پیغمبرؐ خدا کے تشریف لانے کے احترام میں کنیز کو معاف تو کیا ہی تھا آزاد بھی کر دیا۔ پیغمبرؐ خدا نے فرمایا کہ بارہ درہم کتنے بابرکت تھے جنھوں نے دو ننگوں کو کپڑے پہنائے اور ایک کنیز کو آزاد کرایا (بحار الانوار جلد ۱۶ طبع جدید۔ صفحہ ۲۱۵)۔

بے شک اگر ہم زندگی کے اخراجات میں سے تھوڑا سا بھی کم کر دیں تو اس سے ہمارے بہت سے بھائیوں کو کچھ ساز و سامان فراہم ہو سکتا ہے۔

پیغمبرؐ خدا کے ذمے ایک یہودی کے چند درہم آتے تھے۔ ایک دن اس نے تقاضا کیا لیکن آپؐ کے پاس رقم نہیں تھی۔ یہودی نے کہا: جب تک آپ اپنا قرض ادا نہیں کریںگے میں یہیں آپ کے پاس بیٹھا رہوں گا۔ وہ آپ کی نگرانی کرتا رہا یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ لوگوں نے ظہر کی نماز پڑھی۔ عصر کا وقت بھی گزر گیا یہاں تک کہ مغرب اور عشا کا وقت آگیا"

وہ پیغمبرؐ خدا کو بدستور روکے رہا تو اس پر لوگوں کو غصہ آگیا لیکن آپ نے فرمایا: ہمیں ظلم کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس کے نتیجے میں وہ یہودی جو آپ کو دوسرے دن تک بدستور روکے ہوئے تھا مسلمان ہوگیا اور اس نے اپنا کچھ مال بھی راہِ خدا میں خیرات کر دیا اور کہا: میرا یہ کام رسولؐ کی آزمائش کے لیے تھا۔ میں نے گستاخی نہیں کی تھی۔

پیغمبرؐ خدا کا اجتماعی طرزِ عمل

وفاداری

حضرت عمار بن یاسرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے میں اور آپ دونوں اکٹھے گلہ بانی کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ان کو صلاح دی کہ فلاں علاقے کی چراگاہ بھیڑ بکریاں چرانے کے لیے بہت اچھی ہے۔ ہم لوگ وہاں چلیں۔ حضرت نے مان لیا۔ دوسرے دن جب میں وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پیغمبرؐ خدا مجھ سے پہلے وہاں موجود ہیں لیکن اپنی بھیڑوں کو چرنے سے روکے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا آپ بھیڑوں کو چرنے کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے فرمایا چونکہ تم سے میرا معاہدہ یہ تھا کہ ہم لوگ ساتھ ساتھ یہ کام شروع کریں گے اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمہارے آنے سے پہلے میری بھیڑیں اس چراگاہ سے کچھ چرلیں۔

طریقۂ تعلیم

آپ لوگوں کو اسلامی عقائد و اعمال سکھاتے یا ان کے سوالات کا جواب

دیتے وقت اپنی بات کو تین بار دہراتے تھے تاکہ سننے والا اچھی طرح سمجھ جائے۔

دشمن کو پناہ دیتے ہیں

سن ۸ ہجری میں پیغمبرؐ خدا مدینے سے ایک لشکر کے ہمراہ نکلے اور مکہ کو فتح کر کے کعبے کے اندر رکھے ہوئے بت توڑ ڈالے۔ بت پرستوں کا ایک سردار صفوان نامی جو قبیلہ بنی امیہ سے تھا شہر جدہ کو بھاگ گیا جو مکے سے چند فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے۔ کچھ لوگ آنحضرتؐ کے پاس آئے اور انھوں نے آپ سے اس کے لیے معافی کی درخواست کی۔ آپ نے اس کے لیے اپنا عمامہ بھیج دیا تاکہ اس نشانی کی بدولت امان میں رہے اور مکہ میں داخل ہوسکے۔ صفوان جدے سے پلٹا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا اور کہنے لگا: مجھے اسلام کے متعلق سوچنے کے لیے دو ماہ کی مہلت دیجیے۔ آپ نے اسے چار ماہ کی مہلت دیدی۔ صفوان جو کئی سفروں میں رسولؐ خدا کے ساتھ رہا اس مکتب فکر اور اس کے رہنما کی کشش سے خوشی خوشی مسلمان ہوگیا۔ سورۂ توبہ کی چھٹی آیت میں اور فقہ اسلامی میں بھی جہاد کی بحث کے ضمن میں امان اور پناہ دینے کی بابت گفتگو کی گئی ہے جسے ہم مختصر نویسی کے خیال سے نقل نہیں کرتے۔

دشمن سے سلوک

فتح مکہ کے موقع پر آپ نے اپنے جانی دشمنوں کو معاف کردیا یہانتک کہ اس کافرہ کو بھی بخش دیا جس نے زہریلا کھانا پکا کر آپ کے قتل کی سازش

کی تھی۔

ایک دن پیغمبرؐ خدا کا ایک دشمن آپ کی خدمت میں آیا اور اس نے السلام علیک (آپ سلامت رہیں) کہنے کی جگہ السام علیک (آپ مر جائیں) کہا اور نہایت گستاخی سے کئی بار یہ بات دہرائی لیکن پیغمبرؐ خدا نے بدلے کی قوت رکھنے کے باوجود اسے صرف ایک لفظ وعلیک (اور تو بھی) سے جواب دیا۔ بعض حاضرین نے جو سخت برہم ہو گئے تھے آپ سے عرض کیا: آپ نے اس کی اس توہین کا جواب کیوں نہیں دیا؟ آپ نے جواب دیا میں نے اسے اسی کلمے (وعلیک) سے جواب دے دیا یعنی جو تو میرے لیے کہتا ہے وہی تیرے لیے بھی ہو۔

دوستوں سے رفاقت

اصحاب کے ساتھ سفر میں کھانا پکاتے وقت جب ہر شخص ایک نہ ایک کام اپنے ذمہ لیتا تھا، پیغمبرؐ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی لکڑیاں اکٹھی کرنے کی ذمہ داری قبول کر لیتے تھے اور اصحاب چاہے جتنی کوشش کرتے کہ آپ کو کوئی کام نہ کرنے دیں آپ نہیں مانتے تھے۔

ایک اور موقع پر جب پیغمبرؐ خدا اپنے اونٹ سے اتر کر اسے ایک طرف باندھنے جا رہے تھے کچھ اصحاب آگے بڑھے کہ آپ سے اونٹ لے کر خود باندھ دیں لیکن آپ نے قبول نہیں کیا اور فرمایا: تم بھی اپنا کام دوسروں پر ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔

پیغمبرؐ خدا کے دیگر اوصاف

آپ غلاموں کی دعوت قبول کر لیتے تھے اور ان کا احترام کرنا ایسا ہی ضروری سمجھتے تھے جیسا ان افراد کا جن کا لوگوں اور قبیلوں میں احترام اور اعتبار تھا تاہم عملاً آپ ان لوگوں کی قیادت کسی ایسے ہی شخص کے سپرد کرتے تھے جس کا وہ لوگ احترام کرتے تھے۔

آپ اچھے برے کاموں سے بے پروا نہیں تھے بلکہ حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے اور سرزنش بھی۔ لوگوں کی ہدایت کے بارے میں بے حد فکر مند تھے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: ہم نے قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم اپنے آپ کو پریشانی اور تکلیف میں ڈالو (سورہ طٰہٰ آیت ۲)۔

محفل میں ایک ایک آدمی سے اتنے تپاک سے ملتے تھے کہ ہر ایک یہ خیال کرنے لگتا تھا کہ صرف میں ہی سب سے بڑھ کر پیغمبرؐ خدا کے قریب ہوں۔

کبھی کبھی بعض اصحاب آپ سے درخواست کرتے تھے کہ آپ اپنے دشمنوں پر لعنت کریں لیکن آپ آمادہ نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ دعا فرماتے تھے کہ اے خدا! ان لوگوں کو ہدایت عطا کر دے۔

جب کسی شخص سے مصافحہ کرتے تھے تو اس وقت تک اپنا ہاتھ پیچھے نہیں کھینچتے تھے جب تک وہ خود آپ کا ہاتھ نہیں چھوڑ دیتا تھا۔

جب آپ سوار ہو کر چلتے تھے تو کسی کو اپنے پیچھے پیدل نہیں چلنے دیتے تھے یا تو اسے بھی سوار کر لیتے تھے یا فرماتے تھے تم لوگ آگے سے جاؤ اور میں

مقررہ مقام پر تم سے آملوں گا۔

جہاں تک ہو سکتا تھا مانگنے والے کو مایوس نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ ایک دن ایک عورت نے اپنے بیٹے کے ذریعے سے آنحضرتؐ کو کہلا بھیجا کہ آپ اپنا لباس مجھے دے دیجیے۔ اس کا بیٹا آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا اور آپ کا لباس مانگا۔ آپ نے اپنا لباس اسے دے ڈالا لیکن آیت اتری: تمہارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ راہِ خدا میں دے ڈالو (سورہ بنی اسرائیل آیت ۲۹)۔

آپ جب کسی مجلس میں پہنچتے تھے تو نیچے کی طرف بیٹھتے تھے اور تحفہ چاہے کتنا ہی تھوڑا ہوتا قبول کر لیتے تھے۔ جب کسی مسلمان یا اپنے صحابی کو نہیں پاتے تھے تو فوراً اس کی تلاش شروع کر دیتے تھے۔ اگر وہ سفر میں ہوتا تھا تو اس کے لیے دعا فرماتے تھے اور اگر بیمار ہوتا تھا تو اس کی خیریت پوچھنے جاتے تھے۔ محفلوں میں لوگوں کو دائرے کی شکل میں بٹھاتے تھے تاکہ اونچ نیچ کا کوئی امتیاز نہ رہے۔

قانون کے نفاذ میں کسی شخص کا لحاظ نہیں رکھتے تھے چنانچہ ایکبار ایک صحابی نے آپ سے سفارش کی کہ ایک مشہور اور نامور قبیلے کی عورت پر خدا کی مقررہ حد جاری نہ کی جائے۔ آپ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر میری بیٹی بھی چوری کرے تو میں اس پر بھی خدا کی حد ضرور جاری کروں گا اور قانون نافذ کرنے میں کسی قسم کا فرق نہیں کروں گا۔

قیدیوں اور غلاموں کے متعلق غیر معمولی تاکید فرمایا کرتے تھے خود آپ نے ایک قیدی عورت سے نکاح کیا چنانچہ آپ کے اس عمل سے لوگوں کو

قیدیوں اور ان کی شخصیت سے محبت پیدا ہوئی اور مسلمانوں نے بہت سے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ آپ فرماتے تھے کہ ان لوگوں کو اپنا ہی سا کھانا اور کپڑا دو اور جواں مرد کے نام سے پکارا کرو تاکہ انھیں تکلیف کا احساس نہ ہو۔

آپ امیر اور غریب سب سے یکساں طور پر ملتے تھے۔ گفتگو میں جھگڑے اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرتے تھے کبھی تیری میری عیب جوئی اور بدگوئی نہیں کرتے تھے اور قہقہہ نہیں لگاتے تھے۔

آپؐ کو سب سے پہلے عوام کی فکر ہوتی تھی

ان رہبروں کے برعکس جو خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں یا اپنے دوستوں اور حامیوں کو مصیبت میں چھوڑ کر اپنے شہر یا ملک سے ہجرت کر جاتے ہیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مکے میں رہے اور آپ نے اپنے دوستوں کو ملک حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم جاری کیا۔ مدینے کی طرف ہجرت کرنے کے وقت بھی پہلے مسلمانوں کو بھیجا پھر خود ہجرت فرمائی۔

آپؐ لوگوں سے مشورہ کرتے تھے

جن کاموں کے بارے میں خدا کی طرف سے خاص حکم جاری نہیں ہوتا تھا اور وہ خود قوم اور اس کے مشورے پر چھوڑ دیے جاتے تھے ایسے امور میں آپ وقتاً فوقتاً دوسروں کی رائے کو اپنے خیال پر مقدم رکھتے تھے مثلاً اُحد کی لڑائی میں آپ نے مجلس مشاورت ترتیب دی اور اس بارے میں

مشورہ کیا کہ مسلمان لڑنے کے لیے مدینے سے باہر جائیں یا مدینے ہی میں مورچہ بند ہوں۔ پیغمبرؐ خدا اور چند لوگوں کا خیال یہ تھا کہ مدینے ہی میں ٹھہریں اور مورچہ بندی کریں لیکن اکثر جوانوں نے جو آپ کے ساتھی تھے مدینے سے باہر نکلنے کی رائے ظاہر کی اور کہا کہ یا رسولؐ اللہ! ہم آپ کے فرمانبردار ہیں لیکن آپ نے جو ہماری رائے دریافت کی ہے تو ہمارا خیال باہر جانے کا ہے۔ اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ خدا نے ان ایمان دار اور جوشیلے جوانوں کی رائے کو دوسروں کی بلکہ خود اپنی رائے پر ترجیح دی اور اپنے ہتھیار سجا کر میدان احد کو روانہ ہو گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ (ان سے کام کاج میں مشورہ کر لیا کرو)[1] اُحد میں مسلمانوں کی ہار کے بعد نازل ہوئی اور اس کے باوجود کہ اصحاب کی رائے کے مطابق عمل کر کے مسلمانوں نے جنگ میں کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ وہ ہار گئے۔ خدا حکم دیتا ہے کہ (ایسا نہ ہو جو امت پر تمہارا اعتماد کم ہو جائے) ان سے پھر مشورہ کرنا چاہیے[2] لیکن آخری فیصلہ رہبر کا ہے کیونکہ قرآن اسی آیت کے آخر میں پیغمبرؐ خدا سے کہتا ہے: جب تم فیصلہ کر لو تو خدا پر توکل کرو[3] اور اپنا کام شروع کر دو۔

مخالف گروہوں سے پیغمبرؐ خدا کا سلوک

بیشک دشمنوں کے ساتھ پیغمبرؐ خدا کا رویہ اسی ضابطے کے مطابق تھا کہ

---

[1] تفسیر نمونہ جلد سوم ص ۱۴۲ [2] مقالات سیرت نبوی از استاد مرتضیٰ مطہری
[3] تفسیر نمونہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ کی تفسیر مطالعہ فرمائیے۔

"اگر مخالف صلح کی خواہش ظاہر کریں تو تم بھی ان کا ہاتھ نہ جھٹکو اور اپنا جھکاؤ ظاہر کرو (سورۂ انفال آیت ۶۱) البتہ ہم ایک دوسری آیت میں پڑھتے ہیں کہ جب تم کو کسی سازش اور بدنیتی کا شک گزرے تو فوراً پہلے سے اعلان کر کے معاہدہ منسوخ کر دو۔ سورۂ انفال کی آیت ۵۸ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور قرآن یہی کہتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو ان معاملات میں جن پر ان دو گروہوں کا اتفاق ہو اتحاد اور اشتراک کی دعوت دو: اہل کتاب سے کہہ دو کہ توحید کے مرکز میں آئیں اور شرک کے خلاف لڑنے اور طاغوت کو مٹانے میں ہم ایک دوسرے کی موافقت کریں (سورۂ آل عمران آیت ۶۴)۔ بے شک توحید کی موافقت اور شرک کی کاٹ میں یک جہتی اسلام کی نظر میں وقعت کی حامل ہے۔

دشمنوں کی ان محفلوں میں شرکت سے پرہیز کرو جو بے تکی اور غلط بحثوں کے لیے منعقد ہوتی ہیں ممکن ہے کہ اسی طرح وہ اپنی باتوں کا موضوع بدل دیں۔ (سورۂ انعام آیت ۶۸) (رسولؐ) ان کی باتیں اس طرح سنتے ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں پیغمبرؐ جلدی یقین کرتے والا اور نہایت توجہ سے سننے والا ہے لیکن عمل میں وہ ان کی کہی ہوئی باتوں سے ہرگز متاثر نہیں ہوتا (سورۂ توبہ۔ آیت ۶۱)۔

باطل سے لڑائی کے لیے آپ تمام فوجی تیاریوں اور وسیلوں سے کام لیتے، نوجوانوں کو تیراندازی سکھانے کے مسئلے کو لازم قرار دیتے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی تدابیر کو جائز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس ایک تیر کے بدلے میں جو دشمن خدا کی طرف پھینکا جاتا ہے اس کا بنانے والا، اس

کا پھینکنے والا اور وہ بھی جس نے اسے خرید کر اسلام کے مجاہدوں کے قبضے میں دیدیا ہے" یہ تینوں افراد جنت میں جائیں گے۔

منافقوں کے معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ان کی بنائی ہوئی مسجد کو ڈھا دیتے ہیں۔ تبوک کی لڑائی کے وقت منافق ایک کارواں سرائے کے کمرے میں سازش کر رہے تھے۔ پیغمبرؐ خدا نے جو دیکھا کہ اس نازک وقت میں دشمن ایسا منصوبہ بنا رہا ہے تو کمرہ گرانے کا حکم دیدیا اور لوگوں نے وہ کمرہ منافقوں کے سروں پر گرا دیا[1] اور ان میں سے زندہ بچ جانے والوں سے سختی کا برتاؤ کیا)۔ آپ نے ان منافقوں کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تاہم جب کوئی کافر تحقیق مذہب کے لیے امان اور مہلت مانگتا تھا تو مہلت دیدیتے تھے۔

خاندانی محبت کا آپ کے مکتب فکر کے قطعی فیصلے پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ یہ پیغمبرؐ خدا کا چچا ہی تو تھا جس کے متعلق سورۂ تبت سخت لہجے میں نازل ہوئی۔ بے شک تخریب کار کا ہاتھ کٹ جانا چاہیئے چاہے وہ پیغمبرؐ خدا کا چچا ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں قرآن میں صاف صاف حکم آیا ہے کہ پیغمبرؐ اور خدا پر ایمان لانے والے بندے مشرکوں کی بخشش کے لیے دعا کرنے کا حق نہیں رکھتے چاہے یہ مشرک ان کے رشتہ دار ہی ہوں (سورۂ توبہ آیت ۱۱۳)۔

بہت سی آیتوں میں خدا اپنے پیغمبرؐ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو دشمن کی کوشش اور سازش تمہارے ارادے پر کوئی اثر ڈالے: "تم ان کی دی ہوئی

---

[1] بیشک یہ گھر پیغمبرؐ خدا کے ذاتی حکم سے ڈھایا گیا تھا اس لیے اسلامی حدود اور تعزیرات حاکم اسلامی کے ماتحت ہونا چاہیے اور محکوم کا جو عمل خودسرانہ ہو اس پر غور کرنا چاہیے۔

تکلیف کو نظر انداز کرو اور خدا پر بھروسا رکھو" (سورۂ احزاب - آیت ۴۸)۔ ہرگز رنج نہ کرو اور ان کے فریب اور بہانے کی وجہ سے اپنے اوپر سختی نہ کرو (سورۂ نحل - آیت ۱۲۷)۔ ہم تمہارے دشمن کی تمام پوشیدہ اور کھلی ہوئی تدبیروں سے واقف ہیں (سورۂ یٰسٓ - آیت ۷۶) جو کچھ یہ کافر بکا کرتے ہیں تمہارا کام اس پر صبر کرنا اور سورج نکلنے اور ڈوبنے سے پہلے خدا کی تعریف کرنا ہے (سورۂ قٓ آیت ۳۹)۔

رسولؐ خدا سے معذرت

میں اپنی بے بضاعتی کے سبب رسولِؐ خدا کی سیرت لکھتے ہوئے خفت محسوس کر رہا ہوں کیونکہ پیغمبرؐ اسلام کی تعریف تو امیرالمومنین علی علیہ السلام کی سی شخصیت کو کرنا چاہیے۔ وہ پیغمبرؐ جس کی تعریف خدا کرتا ہے، وہ پیغمبرؐ جسے خدا آسمان پر لے جاتا ہے اور جس کے پاک قدموں سے فرشتوں کے مقام کو مبارک بنا دیتا ہے۔

وہ پیغمبرؐ جنھیں آسمانی سواری ایک رات میں مکے اور مسجد الحرام سے بیت المقدس تک لے جاتی ہے (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱)۔ یہ روحانی مقامات ان کی شخصیت کا ایک پہلو ہیں۔ دوسرے پہلو میں ہم ان کی خوش گوئی، غور و فکر اور ہمدردی کی ایک دنیا دیکھتے ہیں کیونکہ وہ بہت سے معمولی اور پامال معاملات پر توجہ اور نظر رکھتے ہیں اور محبت و ہمدردی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں:

بحارالانوار کی سولھویں جلد میں ہم ایک حدیث پڑھتے ہیں کہ وہ ایک پیاسی بلی دیکھتے ہیں جو ان کے وضو کے پانی پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ آپ وضو کو روک کر پانی بلی کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ آپ دشمن کے مقابلے میں پہاڑ سے

بھی زیادہ مضبوط اور دوست کے ساتھ پانی سے بھی زیادہ نرم ہیں۔ اپنا ذاتی حق معاف کر دیتے ہیں اور اپنے شدید ترین دشمن سے آسانی کے ساتھ درگزر کرتے ہیں لیکن قانون کے نفاذ کے موقع پر اس قدر اٹل ہیں کہ یوں قسم کھاتے ہیں اگر میری بیٹی بھی خلاف ورزی کرتی ہے تو میں خدا کی حدود جاری کر کے اس کو بھی سزا دوں گا۔

پیغمبرؐ خدا کے بارے میں بات کرنے کی کسے مجال ہے جبکہ ہم نہج البلاغہ میں پڑھتے ہیں کہ اس زمانے میں جب کوئی لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا آنحضرتؐ نے فرمایا: علم حاصل کرنا فرض ہے اور اب چودہ صدیاں گزر جانے پر بھی علم کی اہمیت کے بارے میں اس سے زیادہ کامیاب کوئی اور نعرہ نہیں ہے۔

جس زمانے میں قبیلے کے ایک آدمی کے قتل پر پورے کا پورا قبیلہ قصاص کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا اور قاتل کے قبیلے کے کئی کئی آدمی بے گناہ مارے جاتے تھے اور بے رحمی اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی آپ حکم دیتے ہیں کہ جو شخص اپنے جانور کو مکے کے سفر میں بھی بھگائے گا اس کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ جو شخص اپنے جانور کو تھکا مارتا ہے وہ سنگدل ہے اور ایسے شخص کی گواہی جائز نہیں ہے۔ بیشک یہ احکام اور وہ شفقت جو ان میں موجزن تھی وہی اس قوم کی زندگی اور سرفرازی کا سبب بن گئی۔ اس (رسولؐ) نے ان باتوں کی طرف بلایا جو تم کو زندہ کر سکتی ہیں (سورۂ انفال آیت ۲۴)۔

خدا کا یہ ارشاد بے سبب نہیں ہے: جو کوئی پیغمبرؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل میری اطاعت کرتا ہے (سورۂ نساء۔ آیت ۸۰) کیونکہ وہ اپنی خواہش یا لالچ سے کبھی کوئی بات نہیں کہتا (سورۂ نجم۔ آیت ۳) اور وہ ہمیشہ راہ راست پر ہے (سورۂ زخرف آیت ۴۳)۔

اس ذات قدسی صفات کی سیرت لکھنے کی کسے مجال ہے جس کی خصوصی مدد کرنے والا خدا ہے (سورۂ فتح۔ آیت ۳)۔

چند سطریں لکھ کر پیغمبر خدا کا تعارف کیسے کرایا جا سکتا ہے جبکہ خدا نے آپ کا نام اور پیغام خود بلند اور محترم کر دیا ہے (سورۂ انشراح۔ آیت ۴)۔

کیا اس کتاب کے چند صفحوں میں اس ذات کا اخلاق جھلک سکتا ہے جس کے بارے میں خدا نے فرما دیا ہے: بلاشبہ تم اخلاق کے بلند ترین درجے پر فائز ہو (سورۂ قلم۔ آیت ۴)۔

یہی قرآن جو دنیا کو متاع قلیل کے لفظ سے یاد کرتا ہے پیغمبر خدا کے اخلاق کی تعریف "عظیم" کے لفظ سے کرتا ہے۔ اس پیغمبرؐ کی کیا تعریف ہو سکتی ہے جسے خدا نے دنیا میں کوثر اور کثیر نیکی عطا فرمائی ہے۔ ہم نے تم کو خیر کثیر عطا کی (سورۂ کوثر۔ آیت ۱) اور آخرت میں بھی شفاعت کا بلند مرتبہ بخشا ہے (سورۂ ضحیٰ۔ آیت ۵)

میں اس ہستی کے بارے میں کیا کہوں جس کی ولادت آتشکدۂ فارس کے شعلوں کو بجھا دیتی ہے۔ جس کی بعثت فتنہ و فساد کی آگ بجھا دیتی ہے۔ جس کی پیدائش کسرائے ایران کے محل کی بنیادیں ہلا دیتی ہے اور جس کی بعثت دانشمندوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ میں اس ذات کے بارے میں کیا لکھ سکتا ہوں جسے قرآن تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار دیتا ہے (رحمت للعالمین)۔

میں اسکے بارے میں کیا کہوں جو عظمت میں اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ معراج پا کر خدا کا مہمان ہوتا ہے اور انکسار سے کہتا ہے کہ اگر کوئی غلام مجھے

سادہ غذا کھانے کو دور کی مسافت پر بھی بلاتا ہے تو میں اسے قبول کروں گا۔

آپ کی عظمت کے لحاظ سے معراج کے آسمانی سفر کے لیے براق کی آسمانی سواری حاضر ہوتی ہے اور انکسار کے سبب سے آپ بے کاٹھی کسے خچر پر سوار ہوتے ہیں۔ آپ کی عظمت یہ ہے کہ جبریل جو وحی لانے والا فرشتہ ہے آپ کو خدا کا سلام پہنچاتا ہے اور آپ کا انکسار یہ ہے کہ آپ مکے کے بچوں کو بھی سلام کرتے ہیں۔

سجدہ کرتے وقت آپ اپنی پیشانی اور دل کو خدا کے حضور میں جھکا دیتے ہیں اور اس حالت میں گھر کے بچے جو آپ کو سجدے میں دیکھتے ہیں آپ کی پشت پر جا بیٹھتے ہیں اور آپ سجدہ لمبا کر دیتے ہیں تاکہ بچوں کا دل نہ بجھے۔

آپ کا کیا کہنا کہ ایک ہی وقت میں خداوند عالم سے راز و نیاز میں بھی مشغول ہیں اور بچوں کی دلداری کا بھی دھیان رکھتے ہیں اور ان سے محبت اور شفقت میں کمی نہیں کرتے۔ اس ذات کے یہ پہلو نہ لکھے جا سکتے ہیں نہ بیان کیے جا سکتے ہیں اور نہ سوچے جا سکتے ہیں۔ دنیا کو چاہیے کہ بچے کا یہ احترام دیکھے اور انسان، عورت، مزدور اور بچے کے حقوق کے لیے اپنے کھوکھلے نعروں سے شرمندگی محسوس کرے۔

آپ محفلوں میں خوش طبعی بھی کرتے ہیں لیکن سچائی کی حد سے باہر نہیں جاتے۔ اپنے بیٹے ابراہیم کی موت پر آنسو بہاتے ہیں لیکن خدا کے خلاف کوئی بات نہیں کہتے۔

صبح کے وقت خدا سے دعائیں مانگتے ہیں۔ دن اپنے اصحاب میں گزارتے ہیں۔ کبھی اپنے اصحاب میں ہی مقابلہ کرواتے ہیں اور جیتنے والے

کے لیے انعام مقرر کرتے ہیں لیکن کیسا مقابلہ؟ گھڑسواری اور تیراندازی جو کل اپنے نظریے کی حفاظت اور ظالم کے خلاف لڑائی میں کام آئے۔ ان جسمانی ورزشوں کا مقابلہ نہیں جو آئندہ نہ سماجی دکھ کی دوا بن سکے نہ کوئی گتھی سلجھا سکے۔ انعام کیا دیتے ہیں؟ کھجور کے پیڑ کی سی چیز جس کی لکڑی، پتے اور پھل ایندھن، سایہ اور غذا ہیں۔

چند تہمتیں

کیا واقعی اس اسلام پر طرح طرح کے بزدلانہ حملے کرنا چاہئیں جس کا پیغمبرؐ اپنے دشمنوں کو غور و فکر کے لیے دو مہینے کی جگہ چار مہینے کی مہلت دیتا ہے۔ فتح مکہ کے دن اپنے سب سے بڑے دشمن کے گھر کو امن کا مرکز قرار دیتا ہے۔ تمام مخالفوں کو معاف کر دیتا ہے اور پندرہ سال تک مختلف قسم کی سختیوں اور اذیتوں پر صبر کرتا ہے۔ اگر وہ پیغمبرؐ اپنا بچاؤ کرنے یا ظالموں سے آزادی دلانے والے جہاد کے حکم کے ذریعے سے یہ چاہتا ہے کہ مسلمان تلوار اٹھالیں تاکہ لوگوں کو ہر طرح کی غلامی کے جوئے سے نجات دلاسکیں اور راستے کے کانٹے دور کر سکیں، فکروں اور ذہنوں کو آزادی دلاسکیں اور مسلط کی ہوئی لڑائیوں میں اپنا بچاؤ کر سکیں تو کیا وہ ناجائز اور بے سروپا اعتراضوں اور بہتانوں کے قابل ہو گا؟ بعض اوقات مخالفین یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے حالانکہ قطعی اور درست اعداد و شمار کے مطابق چند معتبر تاریخیں پیغمبر خداؐ کے عہد کی بہت سی لڑائیوں میں قتل ہونیوالے کافروں اور مسلمانوں کی تعداد ۱۰۰۰ سے زیادہ نہیں بتاتیں۔

کبھی پیغمبرؐ خدا کی کئی شادیوں کے بہانے سے آپ کو ناواقف لوگوں کے سامنے دوسری طرح سے پیش کرتے اور خدانخواستہ عیاش بتاتے ہیں حالانکہ آپ نے اپنی جوانی کی عمر سے پچاس سال کی عمر تک تقریباً پچیس سال صرف حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کے ساتھ زندگی بسر کی۔ شادی کے وقت آپ ۲۵ سال کے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ ۴۰ سال کی تھیں اور شادی بھی حضرت خدیجہؑ کی تحریک پر ہوئی تھی۔ حضرت خدیجہؑ سمجھتی تھیں کہ دوسرے امیدواروں نے ان کی اعلیٰ مالی حالت کی وجہ سے پیغام دیے ہیں اس لیے انھوں نے ان کے پیام رد کر دیے تھے۔ حضرت خدیجہؑ نے آپ کا انتخاب ایک تو اس وجہ سے کیا کہ آپ کو امین اور صادق پایا اور اس کی دوسری وجہ وہ خبریں تھیں جو حضرت خدیجہؑ نے اپنے چچازاد ورقہ بن نوفل سے پچھلے پیغمبروں کی پیشین گوئیوں آنحضرتؐ کے ظہور اور ان سے اپنی شادی کے متعلق سنی تھیں۔

پیغمبرؐ خدا نے تقریباً پچیس سال صرف حضرت خدیجہؑ کے ساتھ بسر کیے اور ان کی دولت صرف توحید کی راہ میں اور لوگوں کو ظلم اور جہالت اور تفرقے سے نجات دلانے کے لیے خرچ کی حالانکہ بہترین لڑکیاں آپ سے شادی کی خواہشمند تھیں لیکن آپ نے کسی کا پیغام قبول نہیں فرمایا۔ پیغمبرؐ خدا کی دوسری بیویاں سب کی سب حضرت خدیجہؑ کے بعد اور آنحضرتؐ کی عمر پچاس سال ہو جانے کے بعد آئیں۔ یہ عورتیں بھی ایسی سن رسیدہ، بیوائیں اور یتیم دار تھیں کہ ان کے ساتھ زندگی عیش و لذت کی جگہ ریاضت اور مشقت کے حساب میں آتی تھی۔ پیغمبرؐ خدا کی یہ بیویاں قسم قسم کا مزاج رکھتی تھیں چنانچہ ان کے ہمراہ کسی آسائش کی کمترین توقع بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

آنحضرتؐ کی ان بیویوں میں سے بعض کے مسلمان شوہر کفار سے جنگوں میں کام آچکے تھے اور یوں وہ کسی سرپرست کے بغیر اور یتیم وار تھیں۔ اس حالت میں اگر وہ اپنے قبیلے میں جاتیں تو گویا کفر کی طرف لوٹ جاتیں۔ ان سے پیغمبرؐ کی شادی ان کی سرپرستی اور ایسے خطروں سے پیش بندی کے لیے تھی مثلاً بی بی سودہ سے آپ کا نکاح جن کے شوہر حبشہ کی طرف ہجرت کے بعد وہاں انتقال کر گئے تھے اور وہ کسی والی و وارث کے بغیر رہ گئی تھیں۔ اسی طرح حضرت ام سلمہؓ پیغمبرؐ کی دوسری بیوی تھیں جو بوڑھی بھی تھیں اور یتیم بچوں کی ماں بھی تھیں۔

آپ کی ایک اور بیوی زینب تھیں جو آپ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں۔ وہ پہلے زید بن حارثہ کی بیوی تھیں لیکن یہ شادی قائم نہیں رہ سکی اور طلاق ہو گئی۔ پیغمبر اکرمؐ نے خدا کے حکم سے زینب سے نکاح کر لیا تاکہ ایک غلط رسم ختم ہو جائے اور وہ رسم یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا جائز نہیں سمجھا جاتا تھا اور چونکہ زید آپ کا منہ بولا بیٹا تھا لہذا جاہلیت کی رسم کے مطابق آپ زینب سے عقد نہیں کر سکتے تھے لیکن خدا نے اس کا حکم دیا تاکہ یہ غلط رسم خود پیغمبرؐ کے ہاتھوں مٹ جائے۔

بی بی جویریہ ایک قیدی خاتون تھیں جن سے پیغمبرؐ خدا نے شادی کی اور مسلمان پیغمبرؐ خدا کے احترام کی وجہ سے قیدیوں پر زیادہ مہربان ہو گئے اور انھوں نے بہت سے اسیر رہا کر دیے۔

عرب کے بڑے بڑے قبیلوں سے تعلق قائم کرنے، ان کی تخریب کاری کی روک تھام اور اندرونی استحکام کی غرض سے پیغمبرؐ اسلام نے عائشہ،

حفصہ، ام حبیبہ، صفیہ اور میمونہ سے شادیاں کیں۔[1]

مختصر یہ کہ پیغمبرؐ خدا کی اکثر بیویاں بیوائیں تھیں اور ان کی جوانی اور عیش کا زمانہ گزر چکا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک یا دو بار نکاح ہو چکا تھا اور وہ یتیم دار تھیں۔ ان سے پیغمبرؐ خدا نے پچاس سال کی عمر کے بعد عقد کیے تھے جبکہ وہ شہرت اور نمود پیدا کر چکے تھے اور بہترین لڑکیاں ان سے شادی کو رضامند تھیں۔ یہ اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ رسولؐ خدا کی شادیاں مصلحتوں اور پاک اغراض کے لیے ہوئی تھیں چنانچہ آپ کی ذات اقدس پر عیاشی وغیرہ کی تہمت قطعی چسپاں نہیں ہوتی۔

مزید برآں پیغمبرؐ خدا متعدد بیویاں رکھنے کے باوجود اکثر رات کے وقت خدا کی عبادت کرتے تھے یہاں تک کہ خدا کا حکم آیا کہ (اے رسولؐ) کچھ وقت سویا بھی کرو (سورۂ مزمل۔ آیت ۲، ۳) چنانچہ یہ تو صرف ہمیں ہیں جو ایک بیوی کے ہوتے ہوئے بھی خدا کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ بیویوں کی زیادہ تعداد اگر رشد، روحانیت، جہاد، عبادت، سماج اور دردمندوں کی حالت پر توجہ دینے سے نہیں روکتی اور اگر بیویوں سے بے انصافی نہیں ہوتی بلکہ ان کی سرپرستی کا سبب اور افتخار، عزت اور نجات کا ذریعہ بھی ہوتی ہے تو اس کے لیے کوئی معقول رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اگر کبھی بیویوں کی تعداد کسی کی نظر میں کھٹکتی ہے تو اسکا مندرجہ ذیل اسباب میں سے کوئی ایک

---

[1] بی بی صفیہ یہودیوں کے ایک بڑے قبیلے بنی نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں۔ جب قید ہو کر آئیں تو پیغمبرؐ خدا نے ان سے شادی کر کے ایک بڑے قبیلے سے رشتہ داری کی بنیاد ڈالی۔

سبب ہوگا۔

۱۔ شوہر بیویوں کا حق ادا کرنے میں انصاف نہ کرتا ہو۔

۲۔ کئی بیویاں رکھنے کا مقصد مقدس مقاصد کی جگہ محض عیاشی ہو۔

۳۔ شوہر کی دوسری صلاحیتیں صرف بیویوں کے ناز اٹھانے میں صرف ہو جاتی ہوں۔

اب اگر کئی بیویاں ہوں اور مندرجہ بالا صورتوں میں سے کوئی ایک بھی پیدا نہ ہو تو پھر اس میں کوئی عقلی سماجی اور استحقاقی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔

چند سوالوں کے جواب

اب تک ہم نے انسان کے لیے نبیوں کی ضرورت، ان کے پہچاننے کے طریقے، صفات اور کارناموں سے متعلق باتیں لکھی ہیں۔ اب ہم اس بارے میں کچھ شکوک اور شبہات کے جواب دے رہے ہیں:

پہلا سوال: کیا انبیاءؑ نے کوئی مثالی معاشرہ قائم کیا ہے؟

جواب: ہدایت کے لیے نبیوں اور آسمانی قانون کا آنا ایک ضرورت ہے اور لوگوں کا اسے ماننا ایک دوسرا فرض ہے اور ان دونوں کا حساب الگ الگ ہے۔

خدا کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کی زبردستی ہدایت کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو سبھی ہدایت پا جاتے (سورۂ نحل آیت ۹) چنانچہ پیغمبر کا چلن بھی لوگوں پر زور زبردستی کرنا، ان کی آزادی چھین لینا اور ان پر حکم چلانا

نہیں ہے (سورۂ غاشیہ آیت ۲۲)۔ خدا کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی ہدایت کا وسیلہ مہیا کرے (سورۂ یٰسین آیت ۱۲) اور لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ ہدایت قبول کریں۔ اگر کچھ لوگوں نے خدا کی ہدایت نہیں مانی تو وہ اس کا سبب بھی نہ بنیں کہ دوسروں کے لیے خدا کی ہدایت قطع ہو جائے۔ جس طرح مالی فالتو گھاس کی موجودگی کے باعث اس باغ کی سینچائی سے دستبردار نہیں ہوتا جس میں اچھے درخت بھی ہوتے ہیں۔ ہم قرآن میں پڑھتے ہیں:

جب خدا نے انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ یہ انسان تو فساد اور خونریزی کرنے والا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا ان کے جواب میں فرماتا ہے: میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے (سورۂ بقرہ آیت ۳۰)۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ نیا مدعا ثابت کرنے کے لیے نمونے پیش کرنا اور افراد کو تربیت دینا کافی ہے۔ اگر ایک راج یا مصور اپنے ہنر کے کچھ نمونے دکھائے تو وہ اس کی لیاقت ثابت کرنے کو کافی ہوتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چند سال پہلے میرے ایک لیکچر کے بعد ایک جوان کھڑا ہوا اور پوچھنے لگا: اگر اسلام ایک اچھا مکتب فکر ہے تو ابھی تک کیوں نہیں پھیلا؟ میں نے ترت کہا: اگر محمد علی کلے اچھا مکے باز ہے تو اس نے اب تک ہمارے سینے پر مکا کیوں نہیں مارا؟ سب حاضرین ہنس پڑے۔

اچھا راج، مصور، مکے باز اور مقرر وہ نہیں ہے جو ہر فرد کے لیے راج گیری، مصوری اور لیکچر بازی کرے۔ اگر کسی مصور اور راج نے آپ کے لیے کوئی کام نہیں کیا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اس سے تقاضا ہی نہیں کیا ہے اگر

کسی مقرر کی آواز ہمارے کان میں نہیں پڑتی تو اسکا سبب یہ ہے کہ ہم اس سے دور بیٹھے ہیں۔ اگر محمد علی کلے نے ابتک ہمارے سینے پر مکا نہیں مارا ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش نہیں کیا ہے اور اگر انبیاءؑ نے کوئی مثالی معاشرہ نہیں بنایا ہے اور اسلام کا نظریہ ابتک نہیں پھیلا ہے تو یہ ہماری کوتاہی ہے۔

ایک شاعر کا قول ہے کہ اگر بھکاری ہی کاہل ہو تو گھر والے کی کیا خطا ہے؟

انبیاءؑ خدا کی طرف سے بے عیب سماج کی بنیاد رکھتے ہیں۔ خود بھی اس کے مطابق عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی جو صلاحیت رکھتے ہیں بتاتے ہیں اور سکھاتے ہیں۔ وہ ایک چھوٹا سا اتم سماج نمونے کے لیے دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں پھر سب کو دعوت دیتے ہیں کہ اسی ماڈل اور نمونے کے مطابق اپنا اپنا سماجی نظام ترتیب دیں۔ ہمارے اس محترم پیغمبرؐ نے گوروں کالوں اور مختلف قبیلوں کی ایک امت بنائی اور اس کی بنیاد خدا پر ایمان اور شرک اور طاغوت کے خلاف جنگ پر رکھی۔ انسانوں کے بیچ جو خیالی فرق تھے وہ ختم کر دیے اور اخلاق، اصلاح، عبادت، اطاعت، اتحاد، خدا کے قانون کے سامنے برابری، اسلامی بھائی چارہ، انصاف، آزادی، راستبازی، اخلاص اور عزت کی سوغات لائے۔

امام علیؑ، ابوذرؓ، سلمانؓ، مقدادؓ اور میثمؓ جیسے لوگوں کو تربیت دی۔ عقل اور فطرت کے مطابق قانون لائے اور خدائی نظام قائم کرنے کی کوشش میں اپنا اور اپنے پیروؤں کا خون دینے تک سے گریز نہیں کیا۔ اب اگر ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا نے ابھی تک انبیاءؑ کا طرزِ فکر نہیں اپنایا تو ہمیں اس کے اسباب کا کہیں اور سراغ لگانا چاہیے۔ اسے مکتب فکر کی خامی یا رہبر کا نقص نہیں سمجھنا چاہیے۔

سورج سب پر چمکتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ شیشے پر چمکا تو اس کی روشنی منعکس ہوئی اور دیوار پر چمکا تو منعکس نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود ہم سورج اور اس کی چمک میں شک نہیں کرتے کیونکہ آپ اگر لاکھوں منہ بند توپیں سمندر میں ڈال دیں تو ان میں پانی کا ایک قطرہ بھی داخل نہیں ہوگا اس لیے کہ توپوں کے منہ بند ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ان میں پانی پہنچ جائے۔

لوگ بھی آنکھ بند، کان بند اور دل بند ہوتے ہیں۔ بقول قرآن:

یہ لوگ روح، عقل اور دل تو رکھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ آنکھ رکھتے ہیں لیکن دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں۔ بیشک یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۷۹)۔

جو شخص حق کو پہچاننے، سننے اور دیکھنے کی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن ایسا کرتا نہیں دراصل وہ ان چوپایوں سے کہیں بدتر ہے جو ایسی اہلیت اور قوت نہیں رکھتے۔

وہ انسان جس کا مقصد کھانا، سونا اور جماع کرنا ہے وہ جانور سے ہرگز بہتر نہیں ہے اور وہ مکاتب فکر جو لوگوں کو روٹی، کپڑے اور مکان کا نعرہ دیتے ہیں وہ انسان کی تمام قابلیتوں کو حیوانی زندگی کے تنگ دائرے میں بند کر دیتے ہیں۔ بیشک وہ خدا کے نائب کے منصب اور انسان کی انسانیت کی سب سے بڑی توہین کرتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ یہ انسان ہی ہیں جنھیں ایک مثالی سماج بنانا چاہیے۔ نبیؐ ایسے استاد ہیں جو اپنے آپ کو سبق پڑھانے پر آمادہ کرتے ہیں اور جو شاگرد ہے اسے اس سبق کو یاد کرنا چاہیے۔ پیغمبرؐ معالج ہیں جو دوا دیتے ہیں اور معالج

کی ہدایت کے مطابق اپنا علاج کرانا چاہیے۔ اگر نبیؐ مثالی سماج نہیں بنا پائے تو اس کی وجہ تو خود لوگوں کی کوتاہی ہے۔ اب ہم قرآن مجید کی چند آیتوں سے اپنے اس جواب کو زینت بخشتے ہیں۔

۱۔ یقیناً خدا ظالم لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا (سورۂ قصص آیت ۵۰)۔

۲۔ یقیناً خدا کافروں کی ہدایت نہیں کرتا (سورۂ مائدہ آیت ۶۷)۔

۳۔ یقیناً خدا بدکاروں کی ہدایت نہیں کرتا (سورۂ منافقون آیت ۶)۔

۴۔ یقیناً خدا فضول خرچوں اور جھوٹوں کی ہدایت نہیں کرتا (سورۂ غافر آیت ۲۸)۔

ان آیتوں سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ نبیوں کی ہدایت سے الگ رہنے کے باعث ایک مثالی معاشرے کے قائم نہ ہو پانے کے ذمہ دار خود وہ لوگ ہیں جو ظلم، کفر، بدکاری، فضول خرچی اور جھوٹ بولنے کی وجہ سے ہدایت پانے کی قابلیت کھو بیٹھتے ہیں۔ قرآن کے پہلے ہی صفحے پر ایک قطعہ لگا ہوا ہے جو پکار پکار کر کہتا ہے:

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

یہ پرہیزگاروں کی رہنما ہے (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲)۔

اگرچہ قرآن تمام دنیا والوں کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے لیکن صرف پرہیزگار لوگوں ہی نے حق کی باتوں کے سامنے غرور، ہٹ دھرمی، دشمنی اور لالچ کو ترک کیا ہے اور صرف وہی حق کی تلاش میں ہیں۔ جو لوگ اپنی ہستی کی بنیادوں سے ہٹ دھرمی، تعصب، کدورت، بے جا دابستگی اور حق کی پہچان میں آڑے آنے والی دوسری رکاوٹیں دور نہیں کر دیں گے وہ کبھی نبیوں کی رہنمائی سے

فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔

دوسرا سوال : کیا وحی فطانت کی ایک قسم ہے ؟

جواب : کچھ لوگ جو دوسری دنیا سے انسان کے تعلق کو نہیں مانتے وہ کوشش کرتے ہیں کہ وحی جیسے معاملات کی کوئی عام وجہ نکالیں مثلاً وہ کہتے ہیں : مظلومیت، خاموشی، بیکاری، سماجی ابتری اور عشق و محبت ایسے امور ہیں کہ انسان کو چھٹکارے کی فکر اور تلاش پر مجبور کرتے ہیں اور لازمی طور پر انسانی فطانت کو بیدار کرتے ہیں۔

نبیوں میں یہ تموج کے اسباب رہے ہیں اس لیے اگر ہم نبیوںؑ کو بھی ایسے ہی نوابغ سمجھ لیں تو کیا مضائقہ ہے ؟

اگر آپ نے اس کتاب میں پچھلی بحث کا مطالعہ کر لیا ہے جو ہم نے نبیوں کی صفات کے بارے میں کی ہے تو آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ نوابغ اور انبیاءؑ میں دسیوں فرق ہیں۔

شک، بھول چوک، غلطی اور ہر قسم کے گناہ سے دوری، اخلاص، غیب کا علم، خدا سے راز و نیاز اور مناجات، بے لوث عبادات اور ہر کام اور ہر حکم کو خدا سے منسوب کرنا سراسر ایسی باتیں ہیں جو نوابغ میں نہیں ملتیں کیونکہ وہ ہمیشہ شک کرتے ہیں، گناہ سے پاک نہیں ہوتے، غیب سے آگاہی نہیں رکھتے، خدا کی عارفانہ حمد و ثنا سے دور ہیں اور اپنے کاموں کو بھی خدا سے منسوب نہیں کرتے اور شاید دنیا میں نوابغ ہیں ہی نہیں کیونکہ

وہ آج تک قرآن کا مثل نہیں لا سکے ہیں۔ تو ابغ اور انبیاءؑ کے درمیان محدود اور لامحدود کا مقابلہ ہے کیونکہ توابغ کے پاس جو کچھ ہے اس کا دائرہ محدود ہے جبکہ نبی خدا کی لامحدود قدرت اور علم سے رابطہ رکھنے کے باعث ہر کام کر سکتے ہیں اس لیے نبیوں کے کارنامے عمل کے ایک دو نمونوں تک محدود نہیں ہیں۔

تیسرا سوال: تمام نبی صرف مشرق میں ہی کیوں گزرے ہیں؟

جواب: ہمارے پاس اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ تمام پیغمبر مشرق میں ہی ہوئے ہیں بلکہ اس آیت سے مدد لی جا سکتی ہے کہ ہر امت کے لیے ایک رسول ہوا ہے (سورۂ یونس آیت ۴۷) مغرب کی پرانی تاریخ ہمارے سامنے واضح نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس طرح انسان ایک چراغ کمرے کے بیچوں بیچ رکھتا ہے اسی طرح اس میں کیا مضائقہ ہے کہ خدا بڑے بڑے پیغمبروں کو ایسے علاقوں میں ہی بھیجے جو نہ مشرق میں ہوں نہ مغرب میں۔

چوتھا سوال: نبی تو بہت سے گزرے ہیں پھر ان سب پر ایمان لانا کیوں لازم ہے؟

جواب: قرآن میں پچیس پیغمبروں کے نام آئے ہیں اور سورۂ مومن میں ہم یوں پڑھتے ہیں:

ہم نے تم سے پہلے بھی پیغمبر بھیجے ہیں جن میں سے کچھ کے قصے ہم نے بیان کر دیے ہیں لیکن کچھ دوسروں کے واقعات تمہارے لیے نہیں دہرائے (سورۂ مومن آیت ۷۸)۔

اس آیت سے مختصر طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبروں کی تعداد

انھیں پچیس بزرگواروں تک محدود نہیں ہے جن کے نام قرآن میں آئے ہیں۔ جب ہم روایات کا رخ کرتے ہیں تو ہمیں طرح طرح کے اقوال ملتے ہیں لیکن ان روایات میں سب سے مشہور حدیث وہ ہے جو حضرت ابوذر غفاریؓ سے منقول ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے پیغمبرِ خدا سے پوچھا کہ انبیاءؑ کتنے ہوئے ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار[۱] لیکن اس بات کا جواب کہ کیا ان سبھی پر ایمان لانا واجب ہے "ہاں" میں ہے کیونکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۶، سورۂ آل عمران کی آیت ۸۴ اور سورۂ نساء کی آیت ۱۵۰ کے مطابق تمام انبیاء پر ایمان لانے کی تاکید کی گئی ہے اور شاید اس کی دلیل بھی یہ ہے کہ ان کی بعثت کا معاملہ اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ اور خدا کا حکم ہے۔ تربیت اور پچھلے پیغمبروں پر ایمان لانے کا حکم یعنی تاریخ کی طویل مدت میں تمام مخلوقات پر خدا کی دائمی شفقت کا یقین یعنی خدا کی قائم و دائم حکمت پر ایمان یعنی ایک دائمی ضرورت پر ایمان جو معصوم کی رہبری کی ضرورت ہے یعنی تاریخ سے اچھی امیدیں لگانے پر ایمان، حق کی فتح اور تاریخی تجربے پر ایمان۔ بلاشبہ یہ عقیدہ کہ انسانی تاریخ کے طویل دور میں ایک جانب اہلِ حق اور دوسرے جانب طاغوت اور باطل کے لشکر لڑائی میں مشغول چلے آئے ہیں اور ان تمام مراحل میں آخر کار حق کو فتح اور باطل کو ذلت اور بدنامی نصیب ہوتی ہے۔ یہ علم اور خدا کی اس سنت پر ایمان تاریخ میں انسانوں کی ترقی، ثباتِ قدم اور برگزیدگی کا سبب ہوتا ہے۔

---

[۱] مجمع البیان جلد ۱ صفحہ ۴۷۶۔ بحار الانوار جلد ۱۱ صفحہ ۳۰۔

پانچواں سوال: ہم پر وحی کیوں نہیں نازل ہوتی؟

جواب: بلاشبہ ریڈیو سیٹ تمام لہروں اور آوازوں کو نہیں پکڑ پاتا اور ہر انسان کو وحی نہیں ہو سکتی۔ صدق وصفا، اخلاق و پاکیزگی، خودسازی، تقویٰ اور دسیوں دوسری شرطیں ضروری ہیں جن سے دل الہام یا وحی کو قبول کرنے کے قابل بن سکے۔

وحی تو اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور صحیح باتوں کی پہچان بھی پاک دلوں، متقی لوگوں اور سچے مومنوں ہی کو ہوتی ہے جیسے ہم قرآن میں پڑھتے ہیں:

اے مومنو! پرہیزگار بنو اور خدا اور اس کے پیغمبرؐ پر ایمان لاؤ تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا فرمائے اور تمہارے لیے نور پیدا کرے جس کے اجالے میں تم خدا کی راہ پہچان سکو اور صرف اسی راہ پر چلتے رہو (سورۂ حدید آیت ۲۸)۔

آپ دیکھتے ہیں کہ نورِ بصیرت ہر ایک کو نہیں ملتا۔ پھر خدا کی لازوال قدرت سے مستقل رابطے کا کیا کہنا! سورۂ انفال میں بھی ہم یہ پڑھتے ہیں:

اگر تم خدا سے ڈرتے رہو اور خدا کے حکم سے سرتابی نہ کرو تو وہ تم کو ایک خاص بصیرت عطا کر دے گا تاکہ اسکے ذریعے سے تم حق کو باطل سے الگ سمجھ سکو (سورۂ انفال آیت ۲۹)۔

انسان اپنی زندگی کی راہ میں حق کو باطل، نیکی کو بدی، دوست کو دشمن اور برکت کے وسیلوں کو بدبختی کے اسباب کے مقابلے میں پہچاننے کی سخت ضرورت رکھتا ہے اور انسانی عقل اس کی پہچان کی قابلیت رکھتی ہے لیکن حرص، لالچ، جذبہ، غرور، جلن اور مال، عورت، اولاد، منصب

اور مقام کی بہت زیادہ محبتیں کالے دھوئیں اور گہری دھند کی طرح نیک و بد کی پہچان کے اس عمل میں عقل کی مزاحمت کرتی ہیں جس سے اسکی یہ صلاحیت آخر کار ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے موقعے پر اگر پرہیزگاری کی بارش عقل انسانی پر تھمے ہوئے اس گرد و غبار کو دور کر دے تو وہ حقیقتوں کو ان کے اصلی روپ میں پہچان سکتی ہے۔

حقیقت سرا ے ست آراستہ
ہوئی و ہوس گرد برخاستہ
نہ بینی کہ ہر جا کہ برخاست گرد
نہ بیند نظر گرچہ بیناست مرد

حقیقت ایک سجا ہوا مکان ہے لیکن اس میں ہوا و ہوس نے دھول اڑا رکھی ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ جہاں دھول اڑتی ہے نظر کچھ نہیں دیکھ پاتی چاہے آدمی انکھیارا ہی ہو۔

ایک دوسرا شاعر یوں کہتا ہے:

جمالِ یار نہ دارد حجاب و پردہ و لے
غبار رہ بہ نشاں "تا نظر توانی کرد

معشوق کا حسن تو ظاہر و باہر ہے لیکن پہلے تو راستے کی دھول کو بٹھا دے تاکہ اسے دیکھ سکے۔

واقعی جس معاشرے میں اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نشریے اور تجزیے محض دنیاوی لالچ اور ہوس کی بنیاد پر گشت کرتی رہتی ہوں وہاں ایک ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے جس میں لوگ حیران و پریشان

ہو جاتے ہیں اور وہ یہ نہیں پہچان پاتے کہ حق کس طرف ہے تاہم اگر ذرائع ابلاغ پر خود غرض لوگوں کا تسلط نہ ہو وہ تعصب، دشمنی اور لالچ پر مبنی پروپیگنڈا نہ کریں اور غلط قضا قائم کرنے کی کوشش ترک کر کے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور انھیں مجبور نہ کریں تو معاشرہ کافی حد تک حق اور باطل کی پہچان کر سکتا ہے۔

ہم قرآن میں یہ بھی پڑھتے ہیں:

تقویٰ کو اپناؤ کہ خدا اس کی تعلیم دیتا ہے (سورۂ بقرہ آیت ۲۸۲)۔

بے شک انسان کا دل آئینے کی طرح ہے کہ اگر اس سے غبار صاف کر دیں تو اس میں خدا کا نور جگمگانے لگتا ہے۔ غور کیجیے کہ تمیز اور پہچان بھی پاک دل اور درست ذہنیت چاہتی ہے پھر وحی کا تو کہنا ہی کیا جو سب سے بلند مقام ہے۔ قرآن پیغمبرؐ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

اگر ایک لحظے کے لیے بھی تم غافل ہو جاؤ اور مجھ سے کسی شئے کو ناحق منسوب کر دو تو میں تمھاری رگِ حیات کاٹ ڈالوں گا (سورۂ حاقہ آیت ۴۶)۔

چھٹا سوال: نبیوں کا آنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیوں ختم ہو گیا؟

جواب: جب حوض کا پانی گندہ ہو جاتا ہے تو اسے بدل دیا کرتے ہیں، جب سڑک، مکان، لباس اور کاریں ٹوٹ پھوٹ، خرابی اور خستگی آجاتی ہے تو اسے درست کرتے اور بناتے ہیں۔ نئے پیغمبر کی ضرورت بھی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب پچھلے پیغمبر کی تعلیم تبدیل اور فراموش ہو جاتی ہے لیکن

جب قرآن کا ایک حرف بھی نہیں بدلا گیا اور اسلام کی کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے تو پھر کسی دوسرے پیغمبر کے آنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہاں یہ بات دوسری آسمانی کتابوں کے برعکس ہے چنانچہ آپ اگر توریت اور انجیل پر نظر ڈالیں تو آپ ان میں اتنی غلط اور عقل کے خلاف باتیں پائیں گے کہ ان کے پڑھنے سے آپ کو شرم آئے گی۔ اس پیغمبر کے آنے کی ایک دلیل آسمانی کتابوں میں تحریف اور اخفائے حقیقت ہے جس کا قرآن میں وجود نہیں ہے۔

دوسری طرف کبھی کبھی کوئی ان پڑھ آدمی یہ ارادہ کرلیتا ہے کہ کسی دُور دراز مقام پر جائے۔ اس وقت اس کے لیے بجز اس کے کوئی دوسری صورت نہیں ہوتی کہ وہ گلی گلی پتا معلوم کرتا پھرے لیکن جب کوئی پڑھا لکھا شخص یہی راہ طے کرنا چاہے گا تو ہم کاغذ پر کھنچا ہوا ایک پورا نقشہ اس کے ہاتھ میں دیدیں گے اور وہ خود اس نقشے کے مطابق اپنا راستا طے کرے گا۔ یہی حال انسان کا ہے کہ جب اس نے ایک پیغمبر سے نظام زندگی کا مکمل نقشہ لے لیا تو اُسے دوسرے پیغمبروں کی ضرورت نہیں رہی۔

دوسری مثال: کبھی انسان کو بچے سے واسطہ پڑجاتا ہے تو وہ اس کی بیماری میں کھانے کی چیزوں کا ایک ایک کرکے نام لیتا ہے مثلاً یہ کہ نہ کھانا کچے انگوروں کا عرق نہ پینا، نیبو کے رس سے پرہیز کرنا وغیرہ۔ اب اگر یہی ہدایت آپ کسی سیانے آدمی کو دیں گے تو صرف ایک بات کہہ دیں گے کہ کوئی کھٹی چیز نہ کھانا۔ اس کے سامنے تمام کھٹی چیزوں کا ایک ایک کرکے نام لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

زمانۂ قدیم کے لوگوں کو تو ایک ایک گلی کا پتا بتانے اور ایک ایک چیز

کا نام لیکر سمجھانا ضروری تھا کیونکہ وہ ذہنی طور پر ابتدائی درجے پر تھے۔ اب جبکہ سماج ذہنی طور پر کمال کو پہنچ چکا ہے، اپنی تکلیف سمجھ سکتا ہے اور اس مکمل نقشہ کی مدد سے جو اسے دیدیا گیا ہے اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہے لہٰذا اس معاشرے یا اس امت کو مزید پیغمبروں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے صرف امام اور فقیہہ ہی کافی ہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں میں سے چند ایک کے علاوہ جو صاحب کتاب تھے اکثر انبیاءؑ صرف تبلیغ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوتے تھے یہ نہیں تھا کہ وہ سب کے سب صاحب کتاب ہوں یا نئی شریعت لائے ہوں چنانچہ جب یہ بوجھ معصوم امام اور اسلام شناس اور متقی علماء اٹھا سکتے ہیں تو نبیوں کے آنے اور ان کی تبلیغ کی ضرورت نہیں ہے۔

بے شک خدا کے دین اور تعلیمات کی ہمیشہ ضرورت ہے لیکن دین کی تجدید ہمیشہ لازم نہیں ہے۔ آخر میں اجتہاد کے مسئلے سے بھی ہم کو غافل نہیں رہنا چاہیے کیونکہ عادل فقیہوں کے پاس پورے قاعدے اور اصول موجود ہیں جن سے وہ خدا کا حکم معلوم کر سکتے ہیں۔

یہ تھیں قریب قریب ان مشہور سوالات کی چند مثالیں جو وقتاً فوقتاً پوچھے جاتے ہیں لیکن ہم یہاں ان سب کا ذکر نہیں کر سکتے اور اس بحث کو اسی مقام پر ختم کرتے ہیں۔

نبیوں کا کارنامہ

گزشتہ صفحات میں نبیوں کی ضرورت، ان کی پہچان، صفات اور

خصوصیات مختصر طور پر بیان کی گئیں۔ اس بحث میں نبیوں کے کچھ کارنامے اور ان کے پاکیزہ مقاصد بھی مختصراً زیر غور آئیں گے۔ ان تمام مباحث میں وحی اور معصوم پیشواؤں کی باتوں سے سند لینا ہمارا دستور رہا ہے۔ پہلے ہم قرآن میں تلاش کرتے ہیں کہ وہ نبیوں کے فرائض کو کس طرح بیان کرتا ہے۔

۱۔ خدا حضرت موسیٰؑ سے خطاب کرتا ہے کہ:

تم فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ اس نے سرکشی کی ہے (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۲۴)۔

بے شک نبیوں کو چاہیے کہ تمام طاغوتوں اور باغیوں کا مقابلہ کریں مگر آج کے لوگوں کی طرح سے نہیں جو اپنے خیال میں ظالم اور سامراج کے خلاف جنگ کا نعرہ لگاتے ہیں اور اکثر موقعوں پر نعرے کی حد سے آگے قدم نہیں بڑھاتے تاہم طاغوتوں کے مقابلے میں حقیقی اور عملی قیام اور جدوجہد نبیوں کے کارناموں کا سرنامہ ہوتا ہے۔

ان طاغوتوں اور متکبروں کا ہٹانا بھی توحید کے لیے فضا ہموار کرتا ہے کیونکہ جب تک تمام جھوٹے معبود مٹ نہیں جاتے ہم معبود حقیقی تک پہنچ نہیں سکتے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا جملہ جو ہمارے عقیدۂ توحید کا شعار ہے ہم لَآ اِلٰہَ کے لفظ سے شروع کرتے ہیں جو تمام طاغوتوں سے انکار ہے۔ اس کے بعد ہم اللّٰہ سے واقف ہوتے ہیں۔ واقعی جب تک دل کے ظرف کو غیر خدا سے پاک نہ کرلیں وہ خدائے واحد کا مقام قرار نہیں پاسکتا۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ فرعون سے کہتے ہیں:

ان بنی اسرائیل کو جو تیرے ظلم کے چنگل میں غلامی بھگت رہے ہیں، آزاد کردے اور ان کے عذاب، اذیت اور استحصال سے ہاتھ

اٹھائے (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۴۷)۔

بے شک غریبوں اور کمزوروں کی قید ظلم سے رہائی خدا کے پیغمبروں کے دوسرے اہم فریضے کے تحت آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ غریبوں کی نجات کی بات، طاغوت سے مقابلہ اور ظلم کو مٹانا جو انبیاءؑ کی طرف سے ظہور میں آتا ہے وہ مختلف حکومتوں کے سیاسی کارندوں کے نعروں، اعلامیوں اور اجتماعوں سے الگ ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو واقعی آزاد بھی کرالیا اور فرعون کو بھی نابود کر دیا لیکن انسانی حقوق کے یہ حمایتی اپنی عمر بھر کی کمائی ہوئی بے شمار دولت میں سے ایک مہینے کی کمائی بھی محکوم انسانوں کی نجات میں نہیں لگا پاتے چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اب تک دنیا کے کسی مقام پر بھی غریبوں کی مخلصی کے لیے کوئی نمایاں قدم نہیں اٹھایا ہے بلکہ صرف انسانی حقوق کے نام پر اپنے حقوق منواتے ہیں۔ کیا اب وقت نہیں آگیا ہے کہ دنیا کے کمزور انسان ان نمائشی تنظیموں سے آس توڑ لیں اور یک جان ہو کر نبیوں کے طریقے پر چلیں؟

۳۔ خدا کی قسم! میں تمھارے بتوں سے ایک چال چلوں گا (سورۂ انبیاء آیت ۵۷)۔

تیسرا قدم جسے اٹھانے پر انبیاءؑ مامور ہیں وہ شرک اور توہمات کے خلاف جنگ ہے، انسان کی پوجا سے لیکر چاند کی پوجا تک، لکڑی پتھر کی پوجا تک، قومیت اور نظریے کی پوجا تک، منصب، دولت اور خواہش کی پوجا تک، شرک کی تمام شاخیں اور رگیں انبیاءؑ کے مضبوط ہاتھوں سے کٹ جانا چاہییں۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پکار ہے۔ اپنے بت پرست

پچا سے میٹھی میٹھی باتوں کے ساتھ، نمرود سے مناسب دلیلوں کے ساتھ اور چاند سورج کے پجاریوں سے اپنے جدید فکر کے ساتھ، جب انھوں نے یہ جان لیا کہ بات چیت اور دلیل کا اب کوئی اثر نہیں ہوتا تو ببانگِ دہل اعلان کر دیا کہ میں تمہارے بتوں کو مستقبل قریب میں توڑ ڈالوں گا اور ایسا ہی کیا بھی کیونکہ جہاں نصیحت، وعظ اور دلیل بے اثر ہو کر رہ جائے وہاں ایک فیصلہ کن اور انقلابی عمل سے لوگوں کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا دینا چاہیے چنانچہ ہم حضرت ابراہیمؑ کو دیکھتے ہیں کہ جس دن شہر خالی ہو جاتا ہے وہ اپنا کلہاڑا لیکر بتکدے میں جاتے ہیں اور بقول قرآن: بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں (سورۂ انبیاء آیت ۵۸) اور کلہاڑا ایک بڑے بت کی گردن میں لٹکا کر چلے آتے ہیں۔ جب شہر کے لوگ واپس آ کر بت خانے میں پہنچتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں: کس ظالم نے ہمارے ان خداؤں کو اس طرح توڑ پھوڑ ڈالا ہے لیکن زیادہ دیر نہیں گزری کہ سب کے سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق سوچنے لگے اور بولے کہ یہ کام صرف اسی کا ہے۔ ابراہیمؑ ہمیشہ ہماری مورتیوں اور مورتی پوجا پر سخت اعتراض کرتا رہتا تھا۔ اب اسے پکڑ کر لوگوں کے سامنے حاضر کرنا چاہیے تاکہ وہ خود بھی اپنے ظلم کا اقرار کرے، ہم بھی اس کے کام کو برا کہیں اور اس کو اس کے کیے کی سزا دیں۔ لوگ حضرت ابراہیمؑ کو پکڑ لائے تو بعض لوگوں نے ان سے پوچھا:

تم نے ہماری مورتیاں کیوں توڑیں؟

آپ نے جواب دیا: یہ بات تمھیں بڑی مورتی بتائے گی اس سے پوچھو۔

لوگوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر کہا: یہ بت تو بولتا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اس جواب کے انتظار میں ہی تھے دیکھا کہ بت پرست اچانک چکرا گئے اور انھوں نے اپنے سر جھکا لیے۔ آپ نے کڑک کر کہا: کیا تم ایسے بتوں کو پوجتے ہو جو تمھارے نفع ونقصان پر ذرا بھی اختیار نہیں رکھتے؟ کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

یہ واقعہ جو سورہٴ انبیاء کی آیت ۵۸ سے شروع ہوتا ہے محترم نبیوں کا ایک کارنامہ بیان کرتا ہے کہ وہ کس طرح تن تنہا شرک اور توہمات کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں اور سوئے ہوئے ضمیروں کو جگانے کے لیے خطرہ مول لیتے ہیں اور لوگوں کو آتش جہنم سے بچانے کے لیے خود دنیا کی آگ میں کود پڑتے ہیں کیونکہ ہم نے دیکھا کہ ظالموں نے کس طرح آگ جلائی اور توحید کے اس ہیرو کو اس میں جھونک دیا۔ وہ اس سے غافل تھے کہ ان کا منصوبہ ناپائیدار ہے اور خدا کی مہربانی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ سے زندہ سلامت بچ نکلے۔

۴۔ اے داؤدؑ! ہم نے تمھیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا ہے اس لیے تمھیں چاہیے کہ تم لوگوں کے درمیان حق اور انصاف سے فیصلے کیا کرو (سورہٴ ص آیت ۲۶)۔

یہ آیت بھی رسالت کا ایک اور گوشہ اور انبیاءؑ کا ایک اور کارنامہ یعنی حق کے مطابق ثالثی اور منصفانہ فیصلہ کرنے کی ذمہ داری کو بیان کرتی ہے۔ ایک دوسری آیت میں بھی ہم یہی پڑھتے ہیں:

ہر امت کے لیے ایک پیغمبر ہے۔ جیسے ہی پیغمبر ان کے پاس

آیا انصاف سے لوگوں میں فیصلہ ہوگا اور کسی پر ظلم نہیں ہوگا(سورۂ یونس آیت ۴۷)۔

۵۔ پیغمبر لوگوں کو اچھے اور نیک کاموں کا حکم دیتے تھے(سورۂ اعراف آیت ۱۵۷)۔

وہ ان لوگوں کو لوٹ مار سے ایثار تک، بت سے خدا تک، اختلاف سے اتحاد تک، قتل و غارت سے اخوت تک، تجاوز اور زیادتی سے پارسائی تک، جہالت سے علم تک، ظلم سے انصاف تک، تفریق سے برابری تک، غرور سے عاجزی تک اور شرک سے اخلاص تک لے گئے اور انھوں نے وسیع، جامع اور حقیقی معنوں میں ایک تہذیبی انقلاب برپا کردیا۔

۶۔ پیغمبرؐ اسلام دوسرے نبیوں کی طرح لوگوں کو تمام ناجائز کاموں سے روکتے تھے۔

آپؐ کی بعثت سے پہلے اہل عرب کی زندگی واقعی فکری، تہذیبی، ایمانی، طبی، معاشی، انتظامی اور سماجی لحاظ سے بے حد بری حالت میں تھی۔ ہم یہاں پر بات کے لیے امیرالمومنین علی علیہ السلام کے ارشادات سے ثبوت پیش کرتے ہیں۔

فکری لحاظ سے ہدایت کی روشنی گُل تھی اور حیرت، بدحواسی اور بے بصیرتی نے سب کو گھیر رکھا تھا(نہج البلاغہ خطبہ۲ نبیض الاسلام) تہذیبی لحاظ سے ایسا کوئی آدمی موجود ہی نہیں تھا جو کتاب پڑھ سکتا ہو(نہج البلاغہ خطبہ ۲۳) ایمان کے لحاظ سے انکے یہاں لکڑی پتھر کے بت گڑھے ہوتے تھے اور یہ انسان ان بے جان بتوں کے چاروں طرف پروانوں کی طرح چکر کاٹتے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔

حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے وہ لوگ گدلا پانی پیتے (نہج البلاغہ خطبہ ۲۶) اور مردار کھاتے تھے (نہج البلاغہ خطبہ ۸۸)۔ معاشی اعتبار سے ان پر ایسا افلاس طاری تھا کہ اکثر لوگوں کو صرف خشک روٹی نصیب ہوتی تھی یا فاقہ (نہج البلاغہ خطبہ ۲۶)۔

امن و امان کے لحاظ سے لوگوں کے دلوں پر ڈر اور سروں پر تلوار کی حکومت تھی۔ جو دلوں پر بیٹھا ہوا تھا وہ ڈر تھا اور جو اُن سے الگ تھا وہ تلوار تھی (نہج البلاغہ خطبہ ۸۸)۔ ایک طرف تو سب ڈرتے تھے اور ڈر سب پر چھایا ہوا تھا لیکن ظاہری صورت بہادروں، طاقتوروں اور تلواروں کی رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو دھمکاتے رہتے تھے۔ سماجی لحاظ سے اختلاف، سرد اور گرم جنگ اور قبیلوں میں جھگڑا اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کا خون کر دیتے تھے۔ خاندانی بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ حق کمزور اور شیطان قوی تھا اور آنسو آنکھوں کی زینت بن گئے تھے۔

امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کے بیان میں یہ مناظر اس طرح مجسم ہو جاتے ہیں: وہ تمہارا خون بہاتے ہیں اور قطع رحم کرتے ہیں (نہج البلاغہ خطبہ ۲۶)۔ مختصر یہ کہ وہ لوگ بدترین حالات میں، توہمات میں ڈوبے ہوئے، شرک، نفاق، ظلم اور افلاس کے اندھیروں میں حیران و سرگرداں زندگی بسر کر رہے تھے۔

پیغمبر اسلام آئے اور انھوں نے ظلم اور زیادتی کے یہ تمام پردے اور کالے بادل ہٹا دیے۔ بیشک انبیاء کا ایک کام ناجائز باتوں سے روکنا اور برائیوں سے ٹکرانا ہے چاہے وہ آدمیوں کو قتل کرنا ہو یا بے گناہ لڑکیوں کا قتل، خواہ وہ ایران میں بادشاہوں کو اور عرب میں بتوں کو سجدہ کرنا ہو یا سود اور شراب کا عام ہونا، ان سے بڑے حرام کام اور کیا ہو سکتے ہیں اور انسانوں کی نجات کے لیے

ان حرام کاموں کے خلاف جنگ کرنے سے بڑی خدمت کونسی ہوسکتی ہے؟

اگر ہم آسمانی رہبروں اور حقیقی مصلحوں کی زندگی اور قربانی سے تھوڑے بہت واقف ہوتے تو ان معصوم پیشواؤں کی جگہ ان رہبروں کو ہرگز نہ دیتے جو مزدور اور غریب کے نام پر بہترین محلوں میں رہتے ہیں اور ان نام کے فلسفیوں کو اپنا رہنما نہ بناتے جنھوں نے علم اور فلسفے کے نام پر لاکھوں کروڑ ں انسانوں کو فنا کروا دیا ہے بلکہ ہم بدستور نبیوں کی سیدھی راہ پر چلتے رہتے کیونکہ نبی سچے بھی تھے اور کامیاب بھی جبکہ دوسرے لوگ نہ سچے ہیں نہ کامیاب۔ جب ہم گزرے ہوئے چند سالوں پر غور کرتے ہیں تو نظریات کی خامیاں اور ان کے غلط نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں کیونکہ اگر وہ دانشور کبھی سماج کے لیے کوئی حق بات کہتے اور کوئی صحیح تجویز پیش کرتے ہیں تو نبیوں کے طرز فکر کو ہم اس سے بھی بہتر پاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ان غیر آسمانی مصلحوں اور رہبروں کی نظر موت سے آگے نہیں جاتی لیکن زندگی کے لیے وہ راستا جو انبیاء علیہم السلام دکھاتے ہیں وہ جاودانی اثر رکھتا ہے۔

دوسری طرف وہ راہ جو دوسرے رہنما دکھاتے ہیں کبھی زندگی کے ایک پہلو کو بہتر بناتی ہے تو عین ممکن ہے کہ دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کردے مثلاً کبھی کبھی انسان کی حقیقت اور آزادی کے عنوان سے دوسری تمام اخلاقی اور سماجی قدریں بے توجہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کبھی معاش پر ایسی توجہ ہو جاتی ہے کہ اس کو بنیاد بنا لیتے ہیں اور تمام سماجی، سیاسی، اعتقادی اور فوجی حالات کی معاشی تشریح کرتے ہیں اور دوسری تمام قدریں بھول جاتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کسی قدر کو کم یا کسی حقیقی قدر کو نظر انداز کیے بغیر انسان کے

سامنے زندگی کا خاکہ پیش کرتے ہیں اور یہ خود انبیاءؑ کے راستے کی ایک خصوصیت ہے۔ صرف اسلام ہی ایسا دین ہے جو میدان جنگ میں بھی نماز، اخلاق اور اصلاح کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس میں نماز جماعت صرف عبادت ہی نہیں ہے بلکہ یہ اپنے اندر سیاسی اور سماجی پہلو بھی رکھتی ہے۔ بات کچھ لمبی ہوگئی جس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔ اب ہم انبیاءؑ کے کارنامے کے ساتویں نقطے پر پہنچتے ہیں۔

۷۔ ان کو پاک کرتے ہیں اور تعلیم دیتے ہیں: انبیاءؑ کا ایک مقصد تزکیہ کرنا اور تعلیم دینا بھی ہے۔ تزکیہ یعنی ترقی دینا، پاک کرنا۔ انسان جب تک اپنے آپ کو آلائشوں، خودغرضی اور جہالت کی ضدوں وغیرہ سے نہ چھڑائے وہ حرکت اور ترقی نہیں کرسکتا۔ اگر ہم اس جگہ ایک قصہ بیان کردیں تو نا موزوں نہیں ہوگا۔

ایک گھڑسوار ایک کم گہری ندی کے کنارے پہنچا۔ اس کا گھوڑا پانی میں اتر کر پار جانے کے بجائے پانی کے قریب پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ گھڑسوار اتر پڑا۔ اس نے اپنا لباس اوپر چڑھالیا اور اس کے آگے کھڑے ہوکر اس کی لگام کھینچی۔ جب اس نے دیکھا کہ گھوڑا حرکت نہیں کرتا تو گھوڑے کے پیچھے جاکر اسے کوڑے مارنے لگا مگر اس نے دیکھا کہ اس سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو وہ مجبور ہوگیا۔ ایک بوڑھا ایک طرف کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کے مالک کو قریب بلایا اور کہا: اگر تم ایک لکڑی سے پانی کو بلو کر گدلا کردو تو گھوڑا آسانی سے حرکت کرنے لگے گا۔ اس نے بوڑھے کی نصیحت پر عمل کیا تو گھوڑا چلنے لگا۔ گھوڑے کے مالک نے ندی کے دوسرے

کنارے سے بوڑھے کا تشکر ہوا اور پانی کو گدلا کرنے کی حکمت پوچھی۔

بوڑھے نے کہا: شروع میں جب پانی صاف اور نتھرا ہوا تھا تو گھوڑے کو پانی میں اپنا عکس نظر آتا تھا اور چونکہ وہ خود کو دیکھتا تھا اس لیے اپنے منہ پر پاؤں نہیں رکھتا تھا۔ بے شک انسان بھی جب اپنے آپ کو دیکھتا ہے اور خود پسند، خود غرض، مغرور اور اپنے آپ پر عاشق ہوتا ہے وہ اپنا پاؤں اپنے اوپر اور اپنی خواہشات پر نہیں رکھتا اور حرکت نہیں کر سکتا اور جو شخص اپنے آپ سے نہیں گزرے گا وہ خدا تک نہیں پہنچ سکے گا۔

تزکیہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی خواہشوں میں نہ دھنس جائے۔ اپنے باطنی مطالبوں کے چنگل میں گرفتار نہ ہو جائے۔ روح کو شرک، حسد، جاہ طلبی، ذلت، خوف، سنگدلی اور تن پروری کی آلودگی سے پاک کرے۔ سوچ کو جہالت، وہم کچے پن اور بے حسی سے نجات دلائے۔ سماج کو گھٹن فریب دہی، استحصال، جبر اور طاغوت کی اطاعت سے بچائے۔ وہ مصیبت جس میں کل کی دنیا بھی اور آج کی دنیا بھی اس علمی ترقی کے باوجود جو اس نے مختلف سمتوں میں کی ہے گرفتار ہے وہ تزکیہ نفس کے نہ ہونے کی مصیبت ہے۔ روز بروز دانشوروں کی تعداد بڑھ رہی ہے لیکن جرائم کی تعداد کم نہیں ہوئی ہے۔ انسانی حقوق کے وکیل جتنے زیادہ ہو رہے ہیں کمزور قوموں کے حقوق اتنے ہی زیادہ پامال ہو رہے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ انھوں نے برتن صاف کیے بغیر اس میں دودھ بھرا ہے، گویا کہ آج کے ایسے انسان کو تعلیم دی جا رہی ہے جس کا تزکیہ نہیں ہوا ہے چنانچہ اعداد و شمار کے مطابق جائزہ لینے اور اندازہ لگانے سے نبیوں کے مکتب فکر میں تربیت

پائے ہوئے لوگوں اور غیر آسمانی تہذیبوں میں پروان چڑھے ہوئے افراد کے درمیان ایک واضح فرق بخوبی معلوم کیا جا سکتا ہے البتہ ہر اس شخص کو جس نے اپنی پیشانی پر مسلمان کا لیبل لگا لیا ہے ہم اسے اسلامی تربیت کا حامل نہیں کہہ سکتے۔ بے شک تعلیم و تربیت نبیوں کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے اور ایک وسیع دائرے میں جانوروں پر انسانوں کی فضیلت کا باعث یہی تعلیم و تربیت ہے جس کی داغ بیل انبیاءؑ کے مضبوط ہاتھوں سے پڑی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ ترقی یافتہ ممالک جنھیں متمدن اور مہذب کہا جاتا ہے وہاں کے ذہین ترین لوگ سیاسی مناصب حاصل کرنے کے لیے اپنی انتخابی مہم میں ہر قسم کی غیر انسانی سازش، غلط پروپیگنڈا اور جھوٹے اور خوش کن وعدے کرتے ہیں اور اس طرح مہذب دنیا کے ماتھے پر روحانی مفلسی کی سیاہی صاف نظر آتی ہے۔ تزکیہ، پرہیزگاری اور شرافت انسان کو تمام سکھوں اور دکھوں کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح قائم رکھتی ہے اور کبھی اس پر آمادہ نہیں ہوتی کہ ہفت اقلیم حاصل کرنے کی خاطر ایک چیونٹی پر بھی ظلم کرے (نہج البلاغہ)۔

۸۔ تاکہ لوگ انصاف کریں (سورۂ حدید۔ آیت ۲۵)۔

انبیاءؑ اس لیے آتے ہیں کہ ایک ایسے سماج کی تنظیم کریں جس میں لوگ خود ہی عدل اور انصاف قائم کریں۔ وہ ایسا سماج بنانے کے لیے آئے جو نہ دوسروں پر دھونس جمائے اور نہ خود دوسروں کی دھونس میں آئے اور بقول قرآن: نہ کسی پر ظلم کریں نہ کسی کا ظلم سہیں۔ ان کا مقصد ایک ایسی امت کو وجود میں لانا تھا جو قرآن کے الفاظ میں میانہ روی کی

حائل ہو، جو ایک اصول کو دوسرے اصول پر قربان نہ کرے، جہاں وہ فرد اور فرد کی آزادیوں کی قدر اور وقعت کی قائل ہو وہاں سماج کی وقعت کی بھی قائل ہو۔ اگر اس دنیوی زندگی کی بہتری کی بات کرے تو دوسری دنیا کی زندگی پر بھی اس کی توجہ ہو۔ پیغمبرؐ آئے تاکہ ایسی امت تیار کریں جس کے نعرے کے ساتھ ساتھ شعور بھی ہو، جس کے رونے کے ساتھ حیات بخش نعرہ[1] بھی ہو اور جس کی نماز کے ساتھ ساتھ زکات بھی ہو۔ انبیاءؑ کا مقصد ایسا سماج قائم کرنا تھا جو خدائی رنگ رکھتا ہو اور قرآن کے الفاظ میں صِبْغَةَ اللّٰہِ (سورۂ بقرہ آیت ۱۳۸) ہو۔

جو انسان یا سماج خدائی رنگ اختیار کر لیتا ہے وہ پھر نہ بڑی طاقتوں کا رنگ قبول کرے گا نہ طاغوتوں کا، نہ ماحول قبیلے اور نسل کا اور نہ تیری میری ذاتی خواہشوں کا۔ خدا کا رنگ اپنانا یعنی تمام مشرقی اور مغربی رنگوں سے محفوظ ہو جانا۔ ہم جو یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ہمارا سماج ابھی انصاف قائم کرنے میں کمزور ہے یا ظلم جبیل رہا ہے یا ابھی تک میانہ رو اُمت نہیں بن پایا ہے اور اس نے خدائی رنگ نہیں پکڑا ہے تو یہ سب اس وجہ سے ہے کہ قوم نے قطعی طور پر اور گہرائی میں اتر کر اپنے محترم پیغمبرؐ اپنے معصوم پیشواؤں یا ان بزرگ ہستیوں کے جانشینوں کی راہ میں قدم نہیں رکھا ہے۔

۹۔ وہ (پیغمبرؐ) اس بوجھ کو جو لوگوں کی گردنوں پر تھا اور وہ پھندے

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب فلسفۂ شہادت مؤلفہ مرتضیٰ مطہری مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی کراچی۔

جو ان پر پڑے تھے ہٹا دیتا ہے (سورۂ اعراف - آیت ۱۵۷)۔ دوسری بات جو ہمیں انبیاءؑ کے کارناموں میں نظر آتی ہے وہ ان باتوں کا خاتمہ ہے جس کے لیے ان کا تقرر ہوا ہے مثلاً وہ معمولات اور سخت احکام جو ان کے سر آ پڑے تھے یعنی مشکل کام، بے جا امیدیں، غلط رسمیں وغیرہ۔ مندرجہ بالا آیت لوگوں کو مجبور کر دینے والی پابندیوں اور بے جا تکلفات کے خاتمہ کو پیغمبر کے فرائض میں شمار کرتی ہے چنانچہ رسول اکرمؐ نے وہ بھاری بوجھ دور کر دیے جو انسان کو بنیادی کاموں سے روکتے تھے۔ اب جبکہ قرآن کی اس پکار کو چودہ سو سال ہو چکے ہیں، انھیں سماجوں میں جو قرآن کو بظاہر عزیز رکھتے ہیں ہم بیشتر انسانوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کا خیالی آداب و رسوم میں مقید ہونا خود ان کی اپنی ہی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے مثلاً ایک خاص قسم کا لباس نہ ہونے کی وجہ سے تعلیمی جلسوں میں شرکت سے رک جاتے ہیں یا حج کے بعد کی رسوم کی خاطر اس اسلامی کانگریس میں شرکت سے انکار کر دیتے ہیں۔ ضابطے کی کارروائیوں کے جھمیلوں کے ڈر سے اس بات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ اپنا حق چھوڑ دیں اور مجرم کا پیچھا نہ کریں یا شادی کے تکلفات اور اس کی غلط رسموں کی وجہ سے برسوں تک شادی کا معاملہ کھٹائی میں ڈال دیتے ہیں لیکن جب رسول اکرمؐ کی سی کوئی ہستی آئی اور اس نے سماج سے یہ بھاری بوجھ ہٹائے اور فضول پابندیاں ختم کر دیں تو ایسا ہوتا ہے کہ مدینے میں مٹی کی ایک سادہ سی مسجد تعمیر کر کے ایک مرکز قائم کر دیتی ہے جس کا حاصل بڑے بڑے کانفرنس ہالوں اور سیمیناروں کے بڑے بڑے کمروں، محکمۂ انصاف کی بلند عمارتوں، نگہبانی کے اونچے برجوں

اور عظیم مدرسوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔[1]

ہمیں ان معاملات پر ذرا رک کر غور کرنا چاہیے۔ اگر ہم اپنی نظر کے دائرے کو کچھ اور وسیع کر لیں اور تمام دنیا کو نگاہ میں رکھیں اور سوچیں کہ دنیا کے بیشتر ممالک جو رقوم غیر ضروری کاموں، تکلفات اور بیجا رسومات پر خرچ کرتے ہیں، اگر وہ اخراجات گھٹا دیں اور اس سرمائے کو کم پیداواری یا غیر پیداواری منصوبوں پر خرچ کریں تو شاید مختلف پسماندہ علاقوں کی بہت سی مشکلیں بہت جلد دور ہو جائیں۔ یہ باتیں جملہ "ان پر سے بوجھ ہٹا دیتا ہے" کی مختصر شرح بن سکتی ہیں کہ کس طرح پیغمبرؐ اپنے حکم اور روش سے سخت کام کو اپنی اُمت کے سر سے ہٹا دیتے ہیں۔ اس طرح بعد کا جملہ بھی انھیں معنوں میں ہے جو کہتا ہے کہ لوگوں کی عقل اور سمجھ میں لوگوں کے قلم اور زبان میں اور لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں میں جو زنجیریں پڑی ہوئی تھیں وہ پیغمبرؐ نے ایک ایک کر کے سب کھول دیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ امنگیں رکھتے ہیں لیکن کچھ کہہ نہیں سکتے یا لکھ نہیں سکتے یا کبھی کبھی کرائے کے ڈھنڈورچیوں کے چھپانے کی وجہ سے لوگ حقائق کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے جیسے کہ وہ ہیں۔ اس مقام پہ ایک ہوشیار اور جانباز لیڈر سامنے آتا ہے۔ وہ حقائق کو کھولنے اور واضح

---

[1] بے شک آپ حسینیہ جماران میں انقلاب ایران کے رہنما کی ملاقات اور کسی یورپی یا امریکی جمہوریہ کے صدر یا پاپائے روم کی ملاقات میں ایک سادہ سے موازنے سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک میں سادگی، کم خرچی اور علمی وزن کیساتھ ساتھ خلوص خدا اور وحدت کا رنگ اور دوسرے میں تکلفات شان و شوکت اور دوسروں کے لیے پریشانیاں اور مماتعتیں ہیں۔

کرنے لگتا ہے پھر اچانک زبانیں کھل جاتی ہیں۔ وہ ایک اعلان کرتا ہے تو قلم کھل جاتے ہیں۔ ظالم پر حملہ کرتا ہے تو خوف دُور کر دیتا ہے اور جو کام عوام کی نظر میں ناممکن تھے وہ کر کے دکھا دیتا ہے۔[1]

خوشخبری دینے اور ڈرانے والے

انبیاءؑ کا ایک اور کام خوشخبری دینا، آس بندھانا، پر امید کرنا اور ایک روشن مستقبل کا حال دلیل کیساتھ بیان کرنا ہے اور واقعی انسان امید پر زندہ رہتا ہے۔ وہ مکاتب جو انسان کے مستقبل کو عدم اور لغو جانتے ہیں، انسان کی موت کو ایک جانور کے مر جانے کی طرح سمجھتے ہیں، زندگی کو اسی دنیا کے چار دن میں محدود سمجھتے ہیں جس کا ہر میٹھا شربت سیکڑوں کڑواہٹوں میں گھرا ہوا ہے اگر ان سے تعلق رکھنے والوں کے اندر روحانی بیماروں کی تعداد ہر روز ہر گھڑی اور ہر لمحہ بڑھتی چلی جا رہی ہے اور نشہ آور چیزوں کی پناہوں، شراب کے پیگوں، خودکشی کی وارداتوں اور خواب آور گولیوں کے استعمال میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے تو بالکل درست ہے۔ ہپی گری کا مشرب اپنانا اور تمام حقوق انسانی قواعد فطری

---

[1] ہم نے اس روش کا ایک چھوٹا سا نمونہ آیت اللہ خمینی کی رہبری میں ایران کے بڑے انقلاب میں دیکھا کہ کس طرح ایک ہوشیار رہنما نے زبانوں کے تالے کھول دیئے اور پوری قوم حکومت پر لعن طعن کرنے لگی۔ کس طرح قلم آزاد ہو گئے اور کس طرح اس قوم نے جو امریکی ڈنڈوں سے ڈرتی تھی اس نے امریکہ کے بڑے بڑے مہروں کو یرغمال بنا لیا۔ نگاہوں پہ جو پردے پڑے ہوئے تھے وہ اٹھا دیئے اور امریکہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ چھوٹی سی مثال تھی جو پیغمبرؐ کے بڑے کارناموں کے آثار بتا سکتی ہے۔

اور قوانین اجتماعی کو پاؤں تلے روندنا ان سوغاتوں میں سے ہے جو مستقبل سے بیخبری ناامیدی اور مایوسی کی وجہ سے انسانی سماج کو ڈرا رہی ہیں۔ واقعی اگر انسان کو حیات جاودانی اور کمال مطلق میں جذب ہو جانے کی امید، خوشخبری اور توقع نہ ہو اور ہم اپنی موت کیساتھ ہی فنا ہو جائیں تو پھر اپنے آپکو جلد سے جلد کیوں نہ فنا کر دیں۔ اگر ہمکو برسوں تک غم اٹھا کر بھی فنا ہی ہونا ہے تو پھر جلد سے جلد کیوں نہ اپنے آپ کو مٹا دیں۔ فرض کیجیے کہ ہم کچھ سال اور زندہ رہ لیے اور ہم نے چند ہزار کلو کھانا اور کھا لیا اور چند ہزار لیٹر پانی اور پی لیا تو پھر آخر میں کیا ہوگا؟ یہ ہے مادی جہاں بینی کی منظر کشی اور ایسے آدمی کا عقیدہ جو اپنے آپکو خدا کے سامنے حاضر نہیں سمجھتا اور جس کے نزدیک خدا کی رضامندی کا معاملہ، اس سے نزدیکی حیات دوام اور بہشت جاودانی کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن خدائی جہاں بینی جو مضبوط دلیلوں سے انسان کو فنا نہ ہونیوالی مخلوق، اسکے مستقبل کو بہت تابناک اور انسان کے چھوٹے بڑے کام کا صلہ تسلیم کرتی ہے اور زندگی کو صرف اسی چار دن کی زندگی میں محدود نہیں سمجھتی ہے جن میں تمام تلخیاں اور تکلیفیں بھی خدا کی پوشیدہ مہربانی اور انسان کی ترقی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور چونکہ الٰہی جہاں بینی زندگی کو ایک دوسری نظر سے دیکھتی ہے لہٰذا اسکے لیے زندگی کا مزا ہی دوسرا ہوتا ہے اس لیے ایک طرف امید کی تصویر، خدا کی بخشش کی خوشخبری اور متعدد انعامات اور دوسری طرف خدا کی نزدیکی کیساتھ ساتھ حیات دوام اور بہشت جاودانی میں اولیاء اللہ کا قرب انسان میں امید کی ایک نئی روح پھونکتا اور اسے خدا اور کائنات سے پرامید بنا دیتا ہے۔ اسکے لیے نہ زندگی دھوکا ہے نہ اسکی کوشش اور محنت اڑتی ہوئی دھول ہے۔ اب جو ہم نے زندگی میں امید کا کردار سمجھ لیا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ خوشخبری دینے اور امید بندھانے کا معاملہ آسمانی پیغمبروں کا ایک مقصد اور انکے کارنامے کا ایک

حصہ ہے اور اسی طرح ڈرانے کا سلسلہ بھی۔

نبیوں کا دوسرا کام ڈرانا ہے۔ خوف انسان کے بہت سی بری باتوں سے بچنے کا سبب ہوتا ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ انسان مستقبل کے خطروں سے واقف ہو تاکہ ان سے ڈرتا رہے۔ جو بچہ سانپ کے ڈسنے سے ناواقف ہے وہ سانپ کو رسی کی طرح بے ضرر سمجھتا ہے۔ یہ ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ اسے سانپ کے زہر سے واقف کرائیں تاکہ وہ خطرے کو جان جائے۔

انبیاءؑ پچھلی امتوں کی تاریخ بیان کرکے کہ وہ کس طرح ظلم، کفر، غرور، وعدہ خلافی، فریب دہی، سستی، نفاق، بے جا خوف، ناشکری، ناامیدی، قتل، گناہ اور خود نمائی کی وجہ سے خدا کے غضب میں گرفتار ہو کر ہلاک ہوگئیں لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں کہ خدا کی ناخوشی اور ناراضی بھی اس کی مہربانی اور رحمت ہی کی طرح کا ایک قانون ہے چنانچہ جو قوم جس حق یا باطل راستے کو اپنائے گی ویسی ہی اس کی قسمت ہوگی۔ قوموں کے درمیان اس سلسلے میں کوئی فرق نہیں ہے

اس قسم کا خوف جو گزشتہ لوگوں کی تاریخ بیان کرنے سے پیدا ہوتا ہے وہ عوام کی تنبیہ اور قوم کی قسمت سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسری قسم کا خوف انسان کی ذات سے متعلق ہے جس سے پیغمبر ہم کو خبردار کرتے ہیں، جہنم کی آگ سے آگاہ کرتے ہیں اور ایسے مناظر کی خبر دیتے ہیں کہ کس طرح مجرم کے تمام بھید مرنے کے بعد عدل الٰہی کی کچہری میں تمام نبیوں، آدمیوں اور خدا کے فرشتوں کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی کا اعمالنامہ کھل جاتا ہے اور وہ اپنے تمام چھوٹے بڑے کام اس

میں درج پاتا ہے تو فریاد کرتا ہے کہ ہائے! یہ کیسی کتاب ہے جس میں میرے تمام اعمال درج ہیں۔

انبیاءؑ اس دن کی خبر دیتے ہیں کہ جب ہمیں اپنی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی باتوں کی پوچھ گچھ اور حساب کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لینا چاہیے۔ اس دن خطرہ اس قدر ہے کہ مجرم انسان اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کے تمام بیوی اور بچے، باپ، ماں اور اس کے دوست یہاں تک کہ ساری خدائی اس کے بدلے میں یرغمال بنالی جائے لیکن اسے دوزخ سے چھٹکارا مل جائے۔

کیا واقعی قیامت کے دن خدا کی ناراضی، آگ، اذیتوں اور ذلتوں کا خوف مختلف برائیوں اور جرائم سے بچانے والا سب سے بڑا سبب نہیں ہے؟

ہم جو دیکھتے ہیں کہ قرآن میں حشر کے متعلق ہزار سے زیادہ آیتیں اور پچھلی قوموں کی ہلاکت اور زوال کے متعلق سیکڑوں آیتیں آئی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان غفلت سے چونکے، ان خطروں کی طرف توجہ کرے جو فرد اور سماج کو خبردار کرتے ہیں، خدا سے ڈرے اور اپنے آپ کو بچائے۔ بیشک انبیاءؑ کا فریضہ خدا کی بخشش، مہربانی اور انعام کا امیدوار بنانے کیساتھ ساتھ قیامت میں خدا کے غضب اور دنیا میں زوال، ذلت اور ہلاکت سے ڈرانا ہے۔

۱۱- تاکہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے جائے (سورۂ احزاب۔ آیت ۴۳)۔

انبیاءؑ آئے تاکہ تم کو تمام تاریکیوں سے نکالیں اور روشنی کی طرف لائیں۔

جہالت کی تاریکی سے علم کی روشنی میں نفاق کی تاریکی سے صفائے قلب کی روشنی میں، شرک کی تاریکی سے توحید کی روشنی میں، اختلافات کی تاریکی سے اتحاد کی روشنی میں، ڈر کی تاریکی سے امن وسکون کی روشنی میں، ہٹ دھرمی کی تاریکی سے تحقیق کی روشنی میں، اندھی تقلید کی تاریکی سے غور وفکر کی روشنی میں، خواہش کی تاریکی سے ہدایت کی روشنی میں۔

یہ نبیوں کے فرائض کے مکمل خطوط ہیں لیکن جو کچھ اوپر کہا گیا ہے ان خدائی رہبروں کا کارنامہ اسی تک محدود نہیں ہے۔ توحید کی طرف بلاوا، مختلف قسم کے شرک کے خلاف جنگ، مظلوم انسانوں کی نجات، توہمات کے خلاف جنگ، اچھی باتوں کا حکم اور بری باتوں کی ممانعت، خدا کے غضب سے ڈرانا اور اس کی رحمت کی امید دلانا ان محترم ہستیوں کے کام کا سلسلہ ہے لیکن اگر ہم چاہیں کہ ان کے کارنامے سے کچھ زیادہ واقف ہو جائیں تو ہم قرآن کے اسباق کا سہارا لیں گے اور قرآن نبیوں کی جو خدمات بیان کرتا ہے ان میں سے ایک ایک کا تجزیہ اور مطالعہ کریں گے۔

۱۲۔ اے ایمان والو! جب خدا اور پیغمبر تمہیں زندگی عطا کرنے والے احکام کی طرف بلائیں تو تم اس دعوت کو قبول کرو (سورۂ انفال۔ آیت ۲۴)۔

اس آیت میں پیغمبرؐ کے احکام کو فرد اور سماج کا زندہ کرنے والا کہا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے مامور ہونے سے پہلے سماج زندہ نہیں مردہ تھا۔ وہ سماج جو بت پرست پرکھوں کی تقلید کے علاوہ کوئی چلتی نہیں چلتا، وہ سماج جو ستم جھیلنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتا

اور اپنی یا دوسروں کی رہائی کے لیے کوشش پر آمادہ نہیں ہے، وہ سماج جو اولاد کا قائل ہے اور لڑکیوں کی پیدائش کو بے عزتی سمجھتا ہے، تو ہمات میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسے لوگ جو نہ تہذیب رکھتے ہیں، نہ حفظانِ صحت، نہ سوچ بچار کی قوت رکھتے ہیں، نہ آزادیٔ اظہار۔ ایسے سماج میں جسے واقعی مردہ سماج کہنا چاہیے ایک پیغمبر بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو خدا کی طرف بلائے۔ سوچنے کو عبادت سمجھے، علم حاصل کرنے کو ہر عورت اور مرد کے لیے لازمی قرار دے۔ ظالم کو کچلنا اور مظلوم کی غمخواری کرنا ہر انسان کا فرض جانے، بالوں اور دانتوں، جسم اور لباس کے لیے انسان کو حفظانِ صحت کے سیکڑوں اصول بتائے۔ اقرباپروازی، بے جا تعلق، سرداری و جاگیرداری نظام، بے کار ترجیحات، شخصیت پرستی، بے جا ہمدردی اور ظالموں پر بھروسے وغیرہ کی برائی کرے۔

وہ پیغمبر برا جانے، نفاق، بدظنی اور بتوں کی پوجا کی جگہ اچھی عادتیں، پاکیزگی، اتفاق، درگزر، باہمی امداد، نیک خیالی اور خدا کی عبادت کو فروغ دے اور اپنی تمام وسعتوں میں ایک تہذیبی انقلاب برپا کرے اور وہ بھی ان احکامات کے ساتھ جو خدا کی طرف سے اس پر بذریعہ وحی نازل ہوتے ہیں۔ وہ احکامات جو ہر قسم کی خود غرضی سے خالی اور غلطی، شک اور بھول چوک سے پاک ہیں۔ ہم اس انقلاب کو ایک مردہ سماج کو جتنا بھی زندہ کرنیوالا سمجھیں کم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے پیغمبرؐ کے کام کو زندہ کرنیوالا عمل قرار دیا ہے۔ پیغمبرؐ تمھیں ایسی چیز کی طرف بلاتا ہے جو واقعی زندہ کرنیوالی ہے۔

یہ بات اس وقت زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے جب ہم وحی اور انبیاءؑ سے خالی دنیا میں ان ترقیوں کے باوجود جو علم اور صنعت میں

ہوچکی ہیں اس کی بے ایمانیوں، جرموں، اضطرابوں، بدگمانیوں اور خرابیوں پر غور کرتے ہیں۔ دنیا میں ٹیلیفون ایجاد ہوا لیکن اس پر جھوٹ بولا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز بنا لیکن اس کے ذریعے سے شہروں پر بموں کی بارش ہوتی ہے اور سیکڑوں گھروں کو ویران اور ہزاروں کو خاک و خون میں ملا دیا جاتا ہے اس لیے اگر اس ترقی کے پہلو بہ پہلو ایمان اور تقویٰ نہ ہو تو اس تباہی کے سوا اس سے اور کوئی امید نہیں رکھنا چاہیے۔ ہماری تاریخی بصیرت کے مطابق جو ہم نے قرآن سے حاصل کی ہے، آخر کار علم و ہنر کی یہ دنیا جو انبیاءؑ کی ہدایت سے خالی ہے اپنے بے تقویٰ علم کے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کرے گی اور کمزور ہو جائیگی جیسا کہ اسکے آثار سے ظاہر ہے۔ بین الاقوامی تنظیموں، ملکوں کے سربراہوں اور بڑی طاقتوں سے بھی اپنے فائدے، ویٹو سے سامراج کی حفاظت اور دوسروں کے استحصال کے سوا کوئی کام نہیں ہو سکا۔ آخر کار دنیا کے کمزور لوگ ان سب سے آس توڑ لیں گے اور دنیا دوبارہ ایک آسمانی رہبر اور خدائی قانون کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ ہماری بصیرت کے مطابق ظلم اور بے انصافی کی یہ سخت گرہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے طاقتور ہاتھ سے کھلے گی اور ہم کو جو آپ کے ظہور کے منتظر ہیں چاہیے کہ اپنی تاریک رات میں اجالا کرنے کے لیے اپنی پوری تلاش جاری رکھیں۔

اگر ہم چاہیں کہ کسی مالی کے کام سے زیادہ واقف ہو جائیں تو ہمیں چاہیے کہ اس باغ کے پھلوں اور آمدنی پر نظر ڈالیں تا کہ یہ سمجھ سکیں کہ اس تیار زمین پہ کتنی محنت ہوتی ہے۔ اسی طرح انبیاءؑ کے مشرب کے تربیت یافتہ لوگوں پر ایک نظر ڈال کر ہم ان کے کام کی قدر و قیمت کا پتا لگا سکتے ہیں اور یہ بجائے خود

ایک لمبی چوڑی بحث ہے جو انبیاء کے حقیقی تربیت یافتگان کی زندگی پر گہری نظر ڈالے جانے کی محتاج ہے۔

ان دنوں دنیا کی توجہ اسلام کی طرف ہے۔ ان حالات میں ہم کو چاہیے کہ مشرقی اور مغربی دنیا کو نبیوںؑ کے سچے پیروؤں کے حالات زندگی سے آگاہ کریں یا اس سلسلے میں کچھ فلمیں تیار کریں اور اپنے سفارت خانوں کی معرفت وہ فلمیں اپنے مسلک اور مشرب کے طور طریقے بیان کرنے والی کتابوں کے ساتھ ساتھ ساری متمدن دنیا کے سامنے پیش کریں۔ حضرت امام علی رضاؑ نے فرمایا ہے: اگر لوگ ہماری اچھی باتوں سے واقف ہو جائیں تو وہ ہمارے پیرو بن جائیں گے (بحار الانوار جلد اول)۔ دوسری حدیث میں ہم یوں پڑھتے ہیں کہ امام علیہ السلام نے اپنے پاس موجود دو آدمیوں سے فرمایا: تم چاہے مشرق میں چلے جاؤ چاہے مغرب میں ایسا درست علم جو ہر قسم کی غلطی اور کجی سے پاک ہو سوائے ہمارے مکتب فکر کے تم کو کہیں نہیں ملے گا (بحار الانوار جلد اول)۔
مثال کے لیے ہم چند جملے نقل کرتے ہیں جس سے ہم یہ جان لیں گے کہ قرآن کریم ہمارے لیے کتنا اجنبی ہو گیا ہے اور غیروں کے دلکش نعروں نے ہمیں کس قدر موہ لیا ہے۔

۱۔ تقسیم زر کا نظام ایسی بنیاد پر قائم ہو کہ مال و دولت صرف مالداروں کے طبقے ہی کے ہاتھوں میں گردش نہ کرے بلکہ وہ عوام تک اس طرح پہنچے کہ حصہ رسد کے طور پر سبھی کو اس سے آسائش حاصل ہو سکے۔
کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ (سورہ حشر آیت ۷)۔

۲۔ سماج کو نہ ظلم اٹھانا چاہیے نہ کسی پر ظلم کرنا چاہیے بلکہ سماجی انصاف

کے ساتھ ساتھ بڑی طاقتوں اور ظالم لوگوں کے خلاف جنگ کی بنیاد پر آگے بڑھے لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (سورہ بقرہ آیت ۲۷۹)

۳۔ مشورے اور انتخاب کی بنیاد پر کام اچھی طرح سرانجام پاتے ہیں۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (سورہ شوریٰ۔ آیت ۳۸)۔

۴۔ آپ مختلف میدانوں میں ایسے طور طریقوں کا انتخاب کیجیے کہ دوسرے آپ پر غالب نہ ہونے پائیں اور آپ پر احسان نہ دھریں تاکہ آپ کسی کے ناز اٹھانے اور اس کے سامنے ذلیل بننے پر مجبور نہ ہوں لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ (سورہ بقرہ۔ آیت۔ ۱۵۰)۔

۵۔ جس طرح سماجی فائدے کے لیے دوسروں سے درگزر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اسی طرح اپنی جگہ پر بدلہ لینے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے کہ تیز دانتوں کے تیندوے پر رحم کرنا بے ضرر بھیڑوں پر ظلم کرنے کے مترادف ہوتا ہے قرآن کہتا ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَّا اُولِي الْاَلْبَابِ (سورہ بقرہ۔ آیت ۱۷۹)۔

۶۔ خارجی سیاست میں غیروں کو ہر قسم کے دباؤ، سرپرستی اور دخل اندازی کی ممانعت ہونا چاہیے کیونکہ یہ قرآن کا صاف حکم ہے وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (سورہ نساء۔ آیت ۱۴۱)۔

۷۔ اپنے ملک کا بجٹ اور اپنا مال کمینے اور پیچ اور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہ دیجیے جو امام علیہ السلام کے الفاظ میں عیاش، شرابی اور جواری ہیں اس لیے کہ معصوم اماموں کی نظر میں وہ بھی دراصل کمینے ہی ہیں۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۤءَ اَمْوَالَكُمْ (سورہ نساء۔ آیت ۵)۔

۸- اپنے اخراجات پورے کرنا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونا اسلام کے ایک مثالی سماج کی علامت ہے۔ قرآن مجید اسلامی معاشرے کو ایک ایسی گھاس سے تشبیہ دیتا ہے جو خود اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی ہو اور جملہ "وہ پھر اپنی جڑ پر سیدھی کھڑی ہو گئی ہو (سورۂ فتح۔ آیت ۲۹) سے لوگوں کو خبردار کرتا ہے کہ اپنے اخراجات خود پورے کرو اور اگر تمہاری زندگی کے وسائل برباد ہو گئے ہیں تو محنت کرو اور انھیں دوبارہ قائم کرو تاکہ تمھیں دوسروں کا محتاج نہ ہونا پڑے کیونکہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: اِسْتِصْلَاحُ الْمَالِ اِسْتِغْنَاءٌ عَنِ اللَّئِيْمِ اگر اپنے پیسے خود دولت کماؤ گے تو کنجوس مالداروں سے بے نیاز ہو جاؤ گے۔

۹- عہدے اور ذمے داریاں اہل، دیندار اور لائق افراد کے سپرد کیجیے کیونکہ یہ عہدے قوم کی امانت ہیں اور ہمیں چاہیے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کے سپرد کریں (سورۂ نساء۔ آیت ۵۸)۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ حکومت کے لیے لوگوں میں سب سے زیادہ حقدار وہ آدمی ہے جو ان پر حکومت کرنے میں سب سے زیادہ قوی اور احکام الٰہی کا سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔ اَيُّهَا النَّاسُ، اِنَّ اَحَقَّ النَّاسِ بِهٰذَا الْاَمْرِ اَقْوَاهُمْ عَلَيْهِ، وَاَعْلَمُهُمْ بِاَمْرِ اللّٰهِ فِيْهِ۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۲)

۱۰- فوجی تنظیم اور فنون کے لحاظ سے آراستہ اور ہوشیار رہو تاکہ خدا کے اور تمھارے تمام دشمن دہل جائیں اور اس سلسلے میں ہر قسم کی جنگی قابلیت سے بہرہ ور رہو۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ ...... تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔ (سورۃ الانفال آیت ۶۰)

۱۱۔ اپنے مشرب کی واضح اور قطعی روش میں بڑی طاقتوں سے ان کے پٹھوؤں، ان کے اخباروں، رسالوں اور جلسوں سے ہرگز نہ ڈریں اور نہ نئے نئے بہروپوں سے خوف کھائیں اس لیے کہ مردانِ خدا اپنا فرض پورا کرنے میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (سورہٴ مائدہ آیت ۵۴)

۱۲۔ اپنے بارے میں دشمن کے خیالات سے باخبر رہو کیونکہ ان کی کچھ خواہشیں ہوتی ہیں:

ا۔ تمہارے دشمن چاہتے ہیں کہ تم ان سے کچھ میل ملاپ کرو تاکہ وہ بھی تمہارے قریب آئیں۔ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ (سورۂ قلم آیت ۹)۔

ب۔ وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تم مصیبت میں پھنس جاؤ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ (سورہ آل عمران آیت ۱۱۸)۔

ج۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے لیے ہتھیاروں کی فراہمی اور اپنے سرمائے کی حفاظت سے غافل ہو جاؤ۔ وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ۔ (سورہٴ نساء آیت ۱۰۲)

۱۳۔ اسلامی سماج کو اتنا چوکنا رہنا چاہیے کہ جیسے ہی کوئی شخص یا گروہ اندر سے یا باہر سے سامنے آئے اور وہ کچھ باتیں تیرے میرے کان میں یا محفلوں میں کسی بھی بہانے اور کسی بھی ڈھنگ سے کہے لوگ ترت اس کی اسکیم اور مقصد کو سمجھ لیں اور اسے بے اثر بنا دیں۔

قرآن اس سلسلے میں یوں کہتا ہے: إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ۔

جب گھومتے پھرتے شیطان خدا کے بندوں سے ملتے ہیں تو وہ (خدا کے بندے) فوراً چوکنے ہوجاتے ہیں اور پوری دانائی سے ان کی اسکیم کو بھانپ کر اپنی حفاظت کرنے لگتے ہیں (سورۂ اعراف آیت ۲۰۱)
(یہاں شیطان ہر شیطانی شکل میں ہوتا ہے چاہے وہ انسان کی جنس سے ہو چاہے اس کی غیر جنس سے ہو)۔

۱۴۔ مسلم امہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ مشیر یا ماہر کی حیثیت سے غیروں کو اس بات کی اجازت دیدے کہ وہ ہمارے چھوٹے بڑے کاموں اور ہماری مملکت کے رازوں سے واقف ہوجائیں۔ واقعی قرآن کیا خوب فرماتا ہے يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ۔
اے مسلمانو! غیروں کو اپنا ہمراز نہ بناؤ (سورۂ آل عمران آیت ۱۱۸)

۱۵۔ ہر ایسی بات کہنے سے گریز کرو جو تمہارے دشمنوں کو تمہارے بارے میں چوکنا کردے۔ زیر زمین پرانے خزانوں اور فن کی یادگار قلمی کتابوں سے لیکر اہل فطانت کے خیالات اور فوجی رازوں وغیرہ تک کے اتنے حصے کو ظاہر کرنے کی ممانعت کردی جائے جو اگر بیان کردیا جائے تو دشمن کو ہوشیار کردے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک معنی خیز خواب دیکھا تھا۔ جب انھوں نے اپنے باپ کے سامنے بیان کیا تو انھوں نے یوں ہدایت فرمائی: قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا۔
اے پیارے بیٹے! یہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا کیونکہ وہ تیرے خلاف منصوبے بنائیں گے (سورۂ یوسف آیت ۵)۔

جب ایسے خواب کے بیان کرنے کی بھی ممانعت ہے جو دشمن کو چوکنا کر دیتا ہے تو تمام علمی اور مالی سرمائے وغیرہ کا بتانا اور ظاہر کرنا تو قطعی طور پر ممنوع ہونا چاہیے۔

بات ذرا بڑھ گئی لیکن ہم جو آیت بھی پڑھتے ہیں اس میں ایک نہ ایک راز اور کوئی نہ کوئی سبق ضرور ہوتا ہے۔ انگلستان کے وزیراعظم نے قرآن کو ہم سے بہتر پہچانا تھا جو اس نے کہا تھا کہ جب تک یہ قرآن مسلمانوں میں موجود رہے گا ان پر ہماری حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

اے بھائیو اور بہنو! کیا وہ وقت نہیں آ گیا ہے کہ ہم آسمانی کتاب اور اس کے مکتبِ فکر اور طریقے کی طرف توجہ کریں؟

کیا ابھی تک آپ قرآن کا ایک صفحہ نہیں پڑھ سکتے؟

کیا اب بھی آپ اس کے رموز سے واقف ہونا نہیں چاہتے؟

کیا ہم نے جتنی عمر بتائی ہے اس کے ہر سال کی ایک آیت کے حساب سے ہم نے اپنا دستورالعمل بنا لیا ہے؟

معاف کیجیے میں کم علم ہوں اور ڈرتا ہوں کہ آپ بھی اکتا جائیں گے اس لیے انبیاءؑ کے کارنامے اور ان بزرگ ہستیوں کے احکام کا اتنا ہی بیان کافی ہے کیونکہ میں نے اس کتاب میں اختصار اور سادہ نگاری کو ملحوظ رکھا ہے۔

نبیوں کے دوست اور دشمن

جو شخص بھی اپنا ایک مقصد اور اپنی ایک راہ رکھتا ہے، قدرتی طور پر اس کے موافق اور مخالف لوگ بھی ہوتے ہیں۔ دوست اور دشمن رکھنا اتنا

اہم نہیں جتنا اہم یہ امر ہے کہ ان دوستیوں اور دشمنیوں کا سبب کیا ہے؟

قرآن کی کچھ آیات انبیاءؑ کے موافقوں اور مخالفوں کی تاریخ بیان کرتی ہیں اور چونکہ ان کی تاریخ سے واقفیت ہماری آج کی نسل کے لیے تربیتی درجہ رکھتی ہے اس لیے ہم اس باب کو انبیاءؑ کے کارنامے اور نبوت کی اس بحث کے سلسلے کے ساتھ مربوط کرتے ہیں جو ہم اس سے پہلے تحریر کر چکے ہیں۔

سب سے پہلے ہم مخالفوں کی بات کرتے ہیں۔ قرآن انبیاءؑ کے مخالفوں کے کئی گروہوں کا تعارف کراتا ہے۔

۱۔ طاغوت

قرآن مجید میں لفظِ طاغوت ۸ بار آیا ہے جس سے جھوٹے خدا، غاصب اور ظالم لوگ مراد ہوتے ہیں۔ یہ لفظ ایک فرد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور ایک گروہ کے لیے بھی۔ انبیاءؑ کا ایک بہت بڑا مقصد طاغوت کے خلاف لڑنا بھی ہے۔ خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتا ہے:

تم فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ اس نے سرکشی کی ہے (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۲۴)۔

"سامراج کے خلاف لڑائی" کا نعرہ جو آج آزادی چاہنے والوں کا مشہور نعرہ ہے مندرجہ بالا آیت کا مختصر اور نامکمل سا ترجمہ ہے۔

وہ پیغمبرؑ جو اپنے سادہ سے لباس میں فرعون کے دربار کو لرزا دیتا ہے

اور بلند آواز سے کہتا ہے کہ بنی اسرائیل کو آزاد کردے اور ان کی اذیت رسانی سے ہاتھ اٹھالے (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۴۷)۔ سب سے اہم بات جو وہ فرعون سے کہتا ہے یہ ہے کہ تو دوسروں پر کوئی فضیلت نہیں رکھتا اس لیے ہم سب کے سر ایک چوکھٹ پر جھکنے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ فرعون کی شخصیت، درباری نظام خدائی دعوے اور غریبوں کے استحصال سے بنی ہے اور یہ موسیٰؑ ہیں کہ سادہ لباس میں اس کے سجے سجائے دربار میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی بےخوف آواز میں غلاموں کو آزادی دلوانے کی بات کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر فرعون اور اس کے حمایتی بھی بیکار اور خاموش نہیں بیٹھتے اور آسمانی رہبروں کو کچلنے کے لیے کسی کوشش سے دریغ نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فرعون ایک جلسے کا انتظام کرتا ہے۔ شاہی حکم صادر کر کے تمام جادوگروں کو ایک مقام پر اکٹھا کرتا ہے اور اس جادوگر کے لیے انعام مقرر کرتا ہے جو حضرت موسیٰؑ کو عاجز کردے۔ اس کام کے لیے ایک خاص دن مقرر کرتا ہے۔ شہر کے تمام لوگ اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ اور جادوگروں کے کارنامے دیکھنے کو ایک جگہ پر جو پہلے سے بتادی گئی تھی جمع ہو جاتے ہیں۔ پہلے جادوگر اپنا اپنا کمال دکھاتے اور رسیوں کے سانپ بناتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دیتے ہیں جو اژدہا بن جاتی ہے اور وہ اژدہا جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو نگل لیتا ہے۔ جادوگر جب اس کام کی معجزنمائی پر غور کرتے ہیں اور اپنا کام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کا نہیں پاتے تو ایک دم بدل جاتے ہیں اور اسی مقابلے کے میدان میں فرعون کی جھوٹی خدائی کی بجائے سچے خدا پر ایمان لے آتے ہیں۔ فرعون نے جب اپنی سازش

ناکام ہوتے دیکھی اور دیکھا کہ اگرچہ اس نے اپنی قوت اور دولت سے اپنے بہترین ماننے والوں کو مختلف مقامات سے حضرت موسیٰؑ کے خلاف جمع کر لیا تھا لیکن جادوگروں کا خدائے واحد پر ایمان لانا ان تمام لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تھا اس لیے اچانک اس کا بے جا غرور اور کھوکھلی شان و شوکت ڈھے گئی تو وہ الزام لگانے اور دھونس جمانے لگا اور بولا یہ موسیٰؑ تم جادوگروں کا استاد رہا ہے اس لیے میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سخت اذیت میں مبتلا کیے دیتا ہوں۔ وہ اس بات سے غافل تھا کہ ان جادوگروں میں ایک ذہنی اور باطنی انقلاب آچکا ہے۔ یہ جادوگر ایک گھڑی پہلے کے جادوگر نہیں رہے تھے جو انعام میں ایک فرعونی سکہ لینے کی آس لگائے ہوئے تھے اور کہتے تھے: "کیا تو ہمیں انعام اور مزدوری دے گا؟"

یہ لوگ آج پورے فرعونی نظام کی ہنسی اڑا رہے تھے اور فرعون کی دھمکیوں کے مقابلے میں نہایت دلیری سے کہہ رہے تھے کہ: (اے فرعون!)، تو ہماری اذیت رسانی کے لیے جو حکم چاہے جاری کر دے کیونکہ تیرا حکم تو صرف اسی دنیا تک محدود ہے (سورۂ طٰہٰ آیات ۶۱ تا ۷۳ اور سورۂ شعراء آیات ۳۵ تا ۵۰)۔

آج ہم تیرے چند سکوں کی امید نہیں رکھتے بلکہ خدا کی لامحدود مہربانی کی آس لگائے ہوئے ہیں۔ ہم مادیت سے گزر کر روحانیت کی وادی میں پہنچ چکے ہیں۔ ہم ایک کمزور بندے کی غلامی سے گزر کر قدرت والے خالق کی بندگی تک پہنچ گئے ہیں۔ اب ہم تیرے سامنے سجدہ نہیں کریں گے کیونکہ ہم نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا ہے اور اپنا خالق، رہبر اور راستہ بھی تلاش کر لیا ہے۔ بے شک یہ ہے باطنی اور ذہنی انقلاب کا جلوہ۔

مختصر یہ ہے کہ طاغوت ہمیشہ انبیاءؑ کے مخالفوں کی سب سے اگلی صف میں رہے ہیں اور مخالفت کی راہ میں انھوں نے کسی جرم کی کمی نہیں رکھی ہے چاہے وہ حضرت ابراہیمؑ کا جلا دینا ہی ہو۔

۲۔ مترفان

یہ وہ دولتمند اور خوشحال لوگ ہیں جو انبیاءؑ کے طور طریقے اور تبلیغ کو اپنی مادر پدر آزادی کے خلاف پاتے ہیں تو مخالفت اور تخریب پر کمربستہ ہو جاتے ہیں (سورۂ ہود۔ آیت ۱۱۶ و سورۂ سبا۔ آیت ۳۴)۔

مثلاً وہ حضرت شعیب علیہ السلام سے کہتے ہیں: کیا تمھاری نماز تمھیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم انھیں چھوڑ دیں جنھیں ہمارے بزرگ پوجتے تھے اور مال و دولت خرچ کرنے میں ہمیں جو آزادی حاصل ہے اس سے دستبردار ہو جائیں: أَصَلَوٰتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ

ہم سورۂ سبا میں یوں پڑھتے ہیں: وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ۔

ہم نے جس شہر میں بھی پیغمبر بھیجا وہاں کے عیاش، دولتمند اس کی مخالفت پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ تمھیں جس کام کے لیے بھیجا گیا ہے ہم اس سے انکار کرتے ہیں (سورۂ سبا۔ آیت ۳۴)۔

جب ہم نبیوں کی تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ کس طرح غریب طبقہ ان

کے گرد سمٹ آتا تھا اور عیاش اور دولتمند ان کی مخالفت کرتے تھے اور اس کے بعد ہم اشتمالیوں کی باتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اسلام اشرافیہ کا حامی ہے تو ہمیں تعجب ہوتا ہے۔

۳- علما اور دانشور

یہودیوں اور عیسائیوں کے علما اور دانشور پیغمبرؐ اسلام کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے جس طرح وہ اپنی اولاد کو پہچانتے تھے (سورۂ بقرہ- آیت ۱۴۶) لیکن دل میں یہ سوچتے تھے کہ اگر ہم لوگوں کے سامنے حقیقت کھول دیں اور ان سے کہہ دیں کہ یہ محمدؐ وہی پیغمبرؐ ہیں جن کی بابت پیشین گوئی کی گئی ہے اور جن کی بشارت توریت میں موجود ہے تو ہم اجتماعی فائدے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اس لیے انھوں نے سچ کو چھپالیا جو سب سے بڑا اور ناقابلِ تلافی گناہ ہے۔

ہم حق کو چھپانے والوں کے بارے میں پڑھتے ہیں اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ خدا، ملائکہ اور انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان پر لعنت بھیجتے ہیں (سورۂ بقرہ- آیت ۱۵۹)۔ واقعی اگر رسولؐ کی بعثت کے زمانے میں یہودی اور عیسائی علماء پیغمبرؐ اسلام کی سچائی پر پردہ نہ ڈالتے تو کیا آج یہ سب کے سب یہودی اور عیسائی اسلام کے خلاف جنگ کرتے؟

لوگ انبیاءؑ کی مخالفت کیوں کرتے تھے؟

قرآن انبیاءؑ کی مخالفت کے اسباب میں بہت سی بنیادی باتیں بیان کرتا ہے۔ ہم اپنے محترم قارئین کے لیے ان میں سے چند ایک

یہاں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ہم عصری کی چشمک

بعض اوقات انسان کسی کی صحیح بات نہیں مانتا اور اس سے انکار کے لیے اس کے سوا اور کوئی دلیل نہیں رکھتا کہ بات کہنے والا ابھی اسی زمانے کا ایک فرد ہے لیکن اس شخص نے یہ بات اگر دو ایک صدی پہلے کہی ہوتی اور مر چکا ہوتا تو لوگ اسے وحیِ آسمانی کی طرح قبول کر لیتے۔

اکثر عالموں کی قدر و قیمت ان کی زندگی میں چھپی رہتی ہے اور لوگ انھیں پہچانتے نہیں۔ اگر کوئی پاکستانی باشندہ اصلاحِ احوال کے لیے بہترین نقشہ پیش کرے اور اس کی حیثیت معمولی ہو تو اس کے نقشے کو کوئی بھی قبول نہیں کرے گا اور اگر یہی نقشہ کوئی غیر ملکی پیش کرتا ہے تو ہم اسے بہت عظیم بتائیں گے۔

کبھی کبھی ہمارے بعض مصنف یا مدرس یا استاد اپنی گفتگو یا تحریر میں کوئی ایسی بات نقل کرتے ہیں جس کا پہلے پہل کہنے والا آدمی معمولی حیثیت کا اور زندہ ہو تو اس کا نام لینے سے کترائیں گے اور اگر کسی بات کو سب سے پہلے کہنے والا ہم سے دور ہو گا یا دو ایک صدی پہلے کا ہو گا یا کوئی مشہور شخص ہو گا تو ہم آسانی سے اس کا نام لے دیں گے۔

جب ہم تاریخ کی طرف آتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ خدا کے ایک پیغمبر نے جس وقت طالوت کو ایک لشکر کا کمانڈر بنا دیا تو لوگوں نے نافرمانی کی اور کہا: ایسے شخص کو کمانڈاری سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے جس کی حیثیت ایک

معمولی آدمی سے زیادہ نہیں ہے ؟

ہر چند خدا کے پیغمبر نے احتجاج کیا کہ طالوت خدا کا مقبول بندہ ہے اور کمانداری کی لیاقت رکھتا ہے لیکن لوگوں نے نہیں مانا کیونکہ وہ عوام میں سے ایک معمولی حیثیت کا انسان نظر آتا تھا۔

ہم حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے آخری وقت میں ایک لشکر تیار کرتے ہیں اور اسامہ نامی ایک جوان کو جو ۱۸ سال سے زیادہ کا نہیں تھا اس کا کماندار بنا دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خدا اس پر لعنت کرے جو اس لشکر میں شرکت سے کترائے اور اسامہ کے حکم کی مخالفت کرے۔

لیکن حضرت رسولؐ خدا کی اس قدر تاکید کے باوجود بوڑھے بوڑھے لوگ جو بڑا نام اور شہرت رکھتے تھے اس کے لیے تیار نہیں ہوئے کہ خود پر ایک اٹھارہ سال کے نوجوان کی سرداری برداشت کریں۔ یہ ہے غرور، خود پسندی یا ہم عصری کی چشمک۔

قاری سے ایک بات

میں چونکہ آپ کو نہیں پہچانتا اس لیے اس میں آپ کے لیے کوئی برائی نہیں ہو گی۔ اگر آپ اس مقام پر کتاب کو ایک طرف رکھ دیں اور چند لمحوں تک خود اپنے متعلق سوچیں کہ اگر آپ کے کسی ہم عصر اور ایک ایسے شخص نے جو آپ سے کم عمر یا زیادہ غریب ہے یا بے نام ونشان ہے یا بنیادی طور پر آپ کے طریقے یا ذوق کے خلاف ہے، ایک سچی بات کہہ دی ہے یا

ایک اچھی تجویز پیش کردی ہے تو کیا آپ اس کی یہ چیز آسانی سے قبول کریں گے یا تامل سے قبول کریں گے یا بالکل قبول نہیں کریں گے ؟ اصولاً انسان کی وقعت شخصیت پرستی میں نہیں اس کی حق پرستی میں مضمر ہے۔ انسان کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب وہ خدا کی خوشنودی اور سچ کی طرفداری کی خاطر اپنی خواہشوں اور رغبتوں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جنھیں ہم بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو اچھا آدمی تصور کرتے ہیں لیکن جب امتحان کا وقت آتا ہے اور کوئی حریف پیدا ہو جاتا ہے تو ایسا شخص یہ دیکھتا ہے کہ اس کا بازار سرد ہوا جا رہا ہے۔ اس سے لوگوں کی محبت کم ہو رہی ہے اور اس کا حلقہ تنگ ہو رہا ہے تو وہ اچانک غم میں ڈوب جاتا ہے۔ ذلت کا احساس کرتا ہے اور ایسی صورت میں تخریب کاری پہ اتر آتا ہے یا اپنے حریف کے متعلق دوسروں کی تخریب کاری کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے یہ سب کچھ اس بیماری کی وجہ سے ہے جسے ہم عصری کی چشمک کہتے ہیں۔

ہم قرآن کے پاس جاتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ اس نے نبیوں کی دعوت کو قبول کرنے میں ہم عصری کی چشمک کو کس طرح رکاوٹ سمجھا ہے :

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ :

کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ہی ایک پر وحی نازل کی ؟ (سورۂ یونس۔ آیت ۲)۔

سورۂ فرقان کی آیت ۴۱ میں بھی ہم یہی پڑھتے ہیں :

اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا۔

کیا یہی وہ شخص ہے جسے خدا نے رسالت پر مقرر فرمایا ہے ؟

ان دونوں آیتوں سے اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کی

مخالفت کی بنیاد صرف یہ تھی کہ پیغمبرؐ ایک عام انسان کیوں ہے۔

تکبّر اور بہانہ

قرآن میں نبیوں کے مخالفوں کے پیش کیے ہوئے بہانوں سے متعلق کافی آیتیں موجود ہیں جن میں سے ہم چند ایک بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

ا۔ اِئۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَيۡرِ هٰذَاۤ موجودہ قرآن کے علاوہ ایک اور قرآن لاؤ (سورۂ یونس۔ آیت ۱۵)۔

ب۔ پورا قرآن ایک ہی بار نازل ہونے کے بجائے رفتہ رفتہ کیوں نازل ہوتا ہے؟ لَوۡلَا نُزِّلَ عَلَيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ جُمۡلَةً وَّاحِدَةً۔

وہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ صحیح تعلیم و تربیت کا بہترین طریقہ رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت دینا ہے کیونکہ کسی دوسری صورت میں باتیں ذہنشیں نہیں ہو پاتیں اور روح کی گہرائیوں میں نہیں اتر پاتیں۔

ج۔ اس پیغمبرؐ کے پاس باغ، خزانہ اور عمدہ سا گھر کیوں نہیں ہے؟ اَوۡ يُلۡقٰۤى اِلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ تَكُوۡنُ لَهٗ جَنَّةٌ۔ (سورۂ فرقان۔ آیت ۸)

انھیں یہ خبر نہیں تھی کہ مال و دولت رکھنے کا معاملہ خدا سے رابطہ رکھنے کے معاملے سے الگ ہوتا ہے۔ قرآن سورۂ طور کی بہت سی آیتوں میں ان تمام بہانوں کی راہیں بند کر کے نبیوںؑ کے مخالفوں سے ضمیر کی عدالت میں جرح کرتا ہے اور کہتا ہے:

کیا ان آسمانی پیغمبروں نے عقل کے خلاف کوئی بات کہی ہے جو تم عقل کی رو سے اعتراض اور نافرمانی کرتے ہو؟ (سورۂ طور۔ آیت ۳۱)۔

دوسری آیت میں وہ ان سے پوچھتا ہے۔ کیا یہ آیتیں خدا پہ بہتان ہیں اور تمھیں ان کے وحی ہونے میں شک ہے ؟ کیا تم اس جیسی ایک سورت بھی پیش کرسکتے ہو ؟

کیا نبیوں کے یہ مخالف اور منکر اپنے آپ کو پیدائش کے لحاظ سے برتر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو پیدا کرنے والے کے بغیر جانتے ہیں ؟ (سورۂ طور آیت ۳۵)۔

کیا یہ لوگ خود کو خالق سمجھتے ہیں ؟ (سورۂ طور۔ آیت ۳۵)۔

کیا تم ان سے اجرت اور رقم چاہتے ہو جو اس کا ادا کرنا ان پر بھاری ہے اور وہ تمھاری دعوت قبول نہیں کرتے ؟ (سورۂ طور آیت ۴۰)۔

کیا اللہ کے علاوہ ان کا کوئی اور معبود موجود ہے جو اس کی جانب سے وحی اور دوسرے پیغمبر کے منتظر ہیں ؟ (سورۂ طور آیت ۴۳)۔

کیا نبیوں کی دعوت کے ان مخالفوں نے کوئی اور زمین اور آسمان بنا لیا ہے ؟ (سورۂ طور آیت ۳۶)۔

مختصر یہ کہ قرآن اس سورت میں نبیوں کے مخالفوں کو ضمیر کی پیشی میں لے آتا ہے اور وہ تمام راہیں بند کر دیتا ہے جو کسی بھی طرح نبیوںؑ کی مخالفت کا بہانہ بن سکتی ہیں۔

بے جا مطالبات کی وجہ سے انکار

قرآن کی بعض آیتوں میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ لوگ اپنے نبیوں سے

بیجا امیدیں رکھتے تھے۔ کبھی وہ کہتے تھے ہمارے مرے ہوئے باپ داداؤں کو جِلا دو۔ (سورۂ دخان۔ آیت ۳۵) اور جب یہ مردے بھی زندہ ہو جائیں گے تو وہ بھی لازمی طور پر اپنے سے پہلے باپ داداؤں کے متعلق یہی امید رکھیں گے اور اس طرح پیغمبر کو خلقت اور خدا کی سنت کا پہیا اُلٹا گھمانا پڑے گا۔ اس صورت میں جبکہ انسان ضدی نہ ہو تو اس کے لیے پیغمبروں کی صحیح دلیل اور دو ایک معجزے کافی ہو جاتے ہیں اور وہ بیجا امیدیں ترک کر دیتا ہے۔

ہم بعض آیتوں میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ایک گروہ نے پیغمبرِ اسلام سے یہ خواہش کی کہ خود ان پر آسمانی کتاب نازل ہو (سورۂ نساء۔ آیت ۱۵۲) یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے بیمار کہے کہ میں خود طبیب بن جاؤں، میں دوسرے طبیب کے پاس جانے کو تیار نہیں ہوں چاہے مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وحی کوئی ایسی چیز نہیں جو ہر قلب پر نازل ہو سکے۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمیں خدا دکھا دو (سورۂ نساء۔ آیت ۱۵۲)۔ قرآن ان بیجا مطالبات کے بارے میں یہ کہتا ہے:

> اگر ہم وحی کو ایک کاغذ پر تحریر کی صورت میں نازل کریں اور یہ لوگ اس کاغذ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں پھر بھی یہ ضدی کافر لوگ کہیں گے کہ یہ بھی جادو ہے (سورۂ انعام۔ آیت ۷)۔

بیشک ایسے لوگ موجود ہیں کہ وہ ہر آیت، نشانی اور معجزہ دیکھ لیں پھر بھی ایمان لانے کو آمادہ نہیں ہیں (سورۂ انعام۔ آیت ۲۵)۔

عیش کوشی کی وجہ سے انکار

کبھی کبھی مخالفوں کے پاس نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے نہ کوئی غلط مطالبہ کرتے ہیں لیکن صرف اس وجہ سے کہ نبیوں کے کچھ احکام ان لوگوں کی خواہشات اور ذوق سے میل نہیں کھاتے۔ وہ پیغمبروں کی دعوت قبول کرنے سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن یوں کہتا ہے:

جب پیغمبر ایسے احکام لاتے تھے جو ان لوگوں کی ہوا و ہوس سے مطابقت نہیں رکھتے تھے تو وہ یا ان مردانِ خدا کو جھٹلاتے تھے یا انھیں شہید کر دیتے تھے (سورۂ مائدہ۔ آیت ۷۰)۔

یہ تھے تھوڑے سے اسباب انبیاءؑ کی مخالفت کے البتہ بزرگوں کی تقلید کا معاملہ بھی ان کفار کی ضد میں بڑی حد تک شامل تھا۔ اب جو ہم نبیوں کے مخالفوں اور ان کی مخالفت کے اسباب سے واقف ہو چکے ہیں تو ان کے رویے سے متعلق کچھ اور باتیں بیان کر دیتے ہیں۔

حضرت موسٰی علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کی اذیتوں سے نجات دلائی اور اس راستے کی ہر قسم کی سختی خود جھیلی لیکن جب تھوڑے دنوں کے لیے امت کی رہنمائی اپنے بھائی کے سپرد کر کے کوہ طور پر گئے تو لوگ شرک کی طرف پلٹ گئے اور بچھڑا پوجنے لگے۔ حضرت ہارون علیہ السلام جو حضرت موسٰی علیہ السلام کے بھائی اور جانشین تھے انھوں نے ہر چند کہا سنا مگر انھوں نے کان نہ دھرا۔ جب حضرت موسٰی علیہ السلام واپس آئے اور امت کو بچھڑے کی پوجا کرتے پایا تو بہت ناراض ہوئے اور اپنے بھائی پر غصہ اتارا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کے جواب میں کہا: آزاد ہونے والے ان قیدیوں نے میری قدر دانی کی جگہ مجھے کمزور کر دیا۔ جب میں نے چاہا کہ ان کی کج روی اور بچھڑا پوجا روکوں تو مجھ پر اس طرح چڑھ آئے کہ قریب تھا کہ مجھے ہلاک کر دیں (سورۂ اعراف آیت ۱۵)۔

بیشک ہر عہد میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو آسمانی رہبروں کی مدد سے آزادی، عزت اور نجات حاصل کرتے ہیں لیکن ابھی زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ کسی نہ کسی بہانے سے ان کے خلاف صف آرائی کر کے انھیں کمزور بناتے اور دھمکاتے ہیں اور ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مقابلے میں ایک دوسرا طریقہ ایجاد کر لیتے ہیں۔

واقعی ان آیات پر سوچ بچار میں سماج کے رہبروں کے لیے بھی اور امت کے لیے بھی ایک اچھی اور سبق آموز تنبیہ ہے۔

نبیوں کو اس طرح کمزور کرنے اور ان کی آواز پر لبیک نہ کہنے کا ایک نمونہ ہم حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلے میں بھی دیکھتے ہیں جب آپ نے بستر مرگ پر فرمایا کہ کاغذ قلم لاؤ تاکہ میں تمھیں کچھ لکھ دوں تو آپ سے کیسی گستاخی کی گئی۔ امت کا پیشوا مقرر کرنے کے سلسلے میں غدیر کے واقعے سے لوگوں نے بے پروائی دکھائی اور رسول اکرمؐ کے مقرر کردہ رہنما کو نظرانداز کر کے دوسرے شخص کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ نئی گستاخیاں اسلام اور مسلمانوں کی عزت اور قوت کے زمانے میں تھیں۔ اگر ہم چاہیں کہ وہ مظالم جو پیغمبرؐ خدا نے اپنے تبلیغی کام کی ابتدا اور اپنے لفظۂ نظر کی اجنبیت کے زمانہ میں دیکھے انھیں ضابطۂ تحریر میں لائیں تو ان کی فہرست کے لیے بھی ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔

انبیاءؑ مخالفوں کے ناروا اعمال، ناروا خیالات اور ناروا گفتگوؤں میں گھرے ہوئے تھے جن کے نمونے قرآن ہمارے لیے پیش کرتا ہے۔

محترم نبیوںؑ کی بڑی بڑی تکلیفوں سے واقفیت سے دو فائدے ہوتے ہیں:

۱۔ انسان میں قدردانی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور ہم سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آسمانی نظریات آسانی سے ہمارے ہاتھ نہیں آئے ہیں بلکہ انھیں ہم تک پہنچانے میں نبیوں نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔

۲۔ نبیوں کے پیروکاروں کو پتا چلتا ہے کہ امت کی ہدایت اور سماج کی درستی کے لیے استقامت، صبر اور ہر طرح کی تکلیفوں کو برداشت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ہم قرآن سے رجوع کرتے ہیں اور اس سلسلے میں جو کچھ قرآن میں آیا ہے اس میں سے کچھ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں:

حضرت نوح علیہ السلام کے مخالف ان سے کہتے تھے کہ آپ کے ماننے والے غیر اہم اور بے جڑ بنیادی کے لوگ ہیں اور آپ کو ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے (سورۂ ہود۔ آیت ۲۷)۔

جب حضرت نوح علیہ السلام خدا کے حکم کے مطابق کشتی بنانے لگے تو کافروں کی جو ٹولی بھی ان کے پاس سے گزرتی وہ ان کی ہنسی اڑاتی اور آوازے کستی تھی کہ آپ نے پیمبری کا کام کیا سنبھالا کہ بڑھئی گیری شروع کر دی۔ (سورۂ ہود۔ آیت ۳۸)۔

لوگ حضرت شعیب علیہ السلام سے کہتے تھے: آپ ہم میں نسبتاً بہت کمزور ہیں اور ہم آپ کی بہت سی باتوں کو سمجھتے ہی نہیں (سورۂ ہود۔ آیت ۹۱)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جلانے کی سازش تو کی ہی گئی تھی حضرت ہودؑ

ہیں کہ مخالفوں نے بڑی گستاخی کرتے ہوئے ان سے کہا تھا: ہم تمھیں نادان سمجھتے ہیں (سورۂ ہود۔ آیت ۶۶-۶۷)۔

لیکن آپ نے ان کی اس بے ادبی پر نہ غصہ کیا نہ مایوس ہوئے نہ پچھتائے اور نہ اپنے کام میں ڈھیل آنے دی بلکہ اسی طرح اپنا کام کرتے رہے اور ان گمراہ لوگوں کے جواب میں صرف ایک ہی جملہ کہا اور وہ چھوٹا سا جملہ یہ تھا:

"میں نادان نہیں ہوں" (سورۂ اعراف۔ آیات ۶۶-۶۷)۔

ایک اور پیغمبر سے ان کے مخالف کہتے تھے: ہم آپ کو کھلی گمراہی میں مبتلا دیکھتے ہیں (سورۂ اعراف۔ آیت ۶۰)۔ وہ بھی ہود علیہ السلام کی طرح ایک چھوٹا سا جواب دے کر اپنا کام کرتے رہے۔ انھوں نے صرف یہ کہا: اے لوگو! میں گمراہ نہیں ہوں (سورۂ اعراف۔ آیت ۶۱)۔

قرآن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالفوں کی مکروہ سازشوں کا بھی اسی طرح ذکر کرتا ہے: مکے کے مشرک یہ منصوبے باندھ رہے تھے کہ یا تم کو جیل میں ڈال دیں گے یا کسی طرح قتل کر ڈالیں گے اور کچھ نہیں تو کم سے کم تم کو مکے سے نکال ہی دیں گے (سورۂ انفال۔ آیت ۳۰)۔

بے شک اسلام کے محترم پیغمبرؐ کے ساتھ مخالفوں کا یہ رویہ تھا۔ ہمارے پیغمبرؐ کو اپنے بعض قریب ترین رشتہ داروں سے بھی صدمہ پہنچا تھا۔ یہ ان کا چچا ابولہب تھا کہ پیغمبرؐ خدا جہاں کہیں تبلیغ اور ہدایت کے لیے جاتے یہ ساتھ ساتھ جاتا اور کام بگاڑا کرتا تھا۔ وہ پیغمبرؐ کے ابتدائی تبلیغی جلسوں میں شریک ہوتا تھا اور ہر جلسے کو درہم برہم کر کے تبلیغی مقصد سے ہٹا دیتا تھا۔ پیغمبروں پر ایک عام الزام ان کا شاعر ہونا، جادوگر ہونا، دیوانہ ہونا اور

کاہن ہونا تھا۔ قرآن کہتا ہے:

ہم نے جس قوم کے پاس پیغمبر بھیجا اس نے اس کی ہنسی اڑائی (سورۂ حجر۔ آیت ۱۱)۔

ہم فرعون کو دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بھڑکانے کے لیے آپ پر کسی قسم کا الزام لگانے سے نہیں چوکتا تھا۔ کبھی کہتا تھا موسیٰؑ اور ہارونؑ نے طے کر لیا ہے کہ تم کو نکال باہر کریں اور تمھاری زمین پر قبضہ کر لیں اور کبھی اپنی جھوٹی شان دکھا کر لوگوں سے کہتا تھا: موسیٰؑ اور ہارون چاہتے ہیں کہ تمھیں اس راہ حق سے ہٹا دیں جو تم نے پسند کی ہے۔

کبھی انبیاءؑ کی مخالفت اتنی بڑھ جاتی تھی کہ جب خدا کا پیغمبرؐ گفتگو کرنے لگتا تھا تو کفار اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے اور اپنے سر پر اپنا لباس ڈال لیتے تھے تاکہ خدا کا کلام اور پیغمبرؑ کی بات ان کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے (سورۂ نوح۔ آیت ۷)۔

وہ بہت افسوس کا مقام تھا جب پیغمبرؑ کے گھر کے اندر بھی اس سے مخالفت اور بیوفائی ہوتی تھی اور حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام دونوں کی بیویاں ان کی مخالف اور کام بگاڑنے والی تھیں اور خصوصیت کے ساتھ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی گھریلو باتیں ان کے مخالفوں کو بتا دیا کرتی تھی۔

قرآن ان دونوں بیویوں کو کفر اور بے وفائی کا نمونہ بتاتا ہے اور یوں کہتا ہے:

یہ دونوں عورتیں جو پیغمبروں کے دسترخوانوں پر کھانا کھاتی تھیں

اوران کے گھر کی آسائشوں سے استفادہ کرتی تھیں، پیغمبر کے حکم کے تحت اوران کے خاندان سے وابستہ تھیں لیکن جب وہ سچائی کو قبول کرنا نہیں چاہتی تھیں تو قبول نہیں کیا(سورۂ تحریم۔ آیت ۱۰)۔

یہ واقعہ بعض مکاتب فکر کے اس نظریہ کو کمزور بنا دیتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہر انسان کے سوچنے کا طریقہ اور راہِ حیات کا انتخاب اس کی معاش سے مکمل طور پر وابستہ ہوتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں عورتیں نبیوں کی گھر والیاں تھیں اوران کے ساتھ بود و باش رکھتی تھیں مگر ان کی آواز شرک کے حق میں اٹھتی ہے۔ ان کے برعکس ہم فرعون کی بیوی کو دیکھتے ہیں کہ محل میں رہتی ہے لیکن جھونپڑی والوں کی فکر میں ہے طاغوتی نظام میں پلی بڑھی ہے لیکن اس حکومت کی کٹر مخالف ہے۔ فرعون کے دسترخوان سے کھانا کھاتی ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت کرتی ہے۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ زندگی میں اقتصادی نظام کی بہت کچھ اہمیت کے باوجود انسان کے سوچ بچار کا طریقہ اس کی راہ و روش اور اس کا انتخاب اس کے اقتصادی نظام سے کلی طور پر وابستگی نہیں رکھتا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم یہ جاننا چاہو کہ انسان کیسے سوچتا ہے تو یہ دیکھو کہ وہ کہاں سے کھاتا ہے یا یہ کہتے ہیں کہ محلوں میں رہنے والا جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے متعلق نہیں سوچ سکتا۔ یہ ایسے نعرے ہیں جن کا کھوکھلا پن تاریخ اور تجربے سے واضح ہو چکا ہے اور شاید ہم یہ کہہ سکتے ہیں جو طرزِ فکر ان نعروں کی

بنیاد پر قائم ہوا ہے وہ اپنی عمر کے اخیر کو پہنچنے والا ہے۔[1]

یہ تھیں نبیوں کے مخالفوں کی کچھ تخریب کاریاں لیکن زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض گروہ دوستی کے نام سے ایسا کام کر جاتے ہیں جو مخالفوں نے بھی نہ کیا ہوگا۔

اسلام نے اس قسم کے لوگوں کو منافق کہا ہے جنھوں نے اسلام کے جسم پر کسی بھی طرح کا چرکہ لگانے میں کوتاہی نہیں کی ہے۔

انبیاءؑ کے پیروؤں کے لیے

طعنے اور اذیتیں

نبیوں کے ماننے والوں کی اذیت کا موضوع بھی ہمیں نہیں بھولنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے:

---

[1] سرمایہ داروں کے خلاف تحریک کا علمی طریقہ اس طرز فکر کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے جو اشتمالیت نے اندرونی تضادات پر اصرار کرتے ہوئے دکھایا ہے لیکن ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایران میں امپیریلزم کے خلاف سب سے بڑی جنگ دیکھی جس میں ہم نے اشتمالیت کے اصولوں کی علمی اصطلاحوں سے ذرا سی بھی مدد نہیں لی اور دنیا نے جان لیا کہ سرمایہ دارانہ نظام یا اشتمالیت کے اصولوں کی مدد کے علاوہ ایک تیسری راہ بھی موجود ہے جو اسلام کے انقلابی طرزِ فکر کا سہارا ہے۔ بے شک جو شخص صرف مادی لحاظ سے سوچتا ہے اور اس کے ماورا کسی قوت سے بے خبر ہے وہ انقلاب کے طریقے کو بھی مادی اصولوں کے قبول کرنے ہی سے وابستہ سمجھتا ہے۔

نبیوںؑ کے مخالف بڑی بڑی کھائیاں کھودتے تھے اور مومنوں کو ان میں دھکیل کر زندہ جلا دیتے تھے اور خود اس کے اوپر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے تھے۔ نبیوںؑ کے ان ماننے والوں کا قصور ان کا خدا پر ایمان تھا (سورۂ بروج۔ آیات ۵ تا ۸)۔

قرآن میں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ انبیاءؑ کے مخالف اور مجرم جب مومنوں کو دیکھتے ہیں تو ان کی ہنسی اڑاتے ہیں (سورۂ تطفیف۔ آیت ۲۹)۔

جب وہ لوگ ان کے پاس سے گزرتے ہیں تو آنکھ اور بھنویں مٹکا کر ان پر فقرے کستے اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں (سورۂ تطفیف۔ آیت ۳۰)۔

اور جب یہ مجرم اپنے ٹولے اور منڈلی کے ساتھ جمع ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں (سورۂ تطفیف۔ آیت ۳۱)۔

وقتاً فوقتاً جب وہ مجرم ان ایمان لانے والوں کو دیکھتے ہیں تو ان کی طرف اشارے کرتے اور انھیں کجروی اور گمراہی سے نسبت دیتے ہیں (سورۂ تطفیف۔ آیت ۳۲)۔

سورۂ تطفیف کی یہ چار آیتیں طول تاریخ میں مجرموں کے سوچنے کا طریقہ اور ان کی پسندیدہ روش کو بیان کرتی ہیں اور آج کی زبان میں یہ ایک ایسا چلن اور ایک ایسا انداز ہے جو خدا کی راہ پر چلنے والوں کی ہمت کو کچلنے کے لیے کام میں لایا جاتا ہے لیکن جنہوں نے واقعی خدا کو پہچان لیا ہے اور اس کے احکام کی سچائی اور اس کے بھیجے ہوئے رہبروں کی پاکبازی اور گناہوں سے دوری معلوم کر لی ہے وہ اس قسم کی فقرے بازیوں اور طعن وطنز کی وجہ سے اپنا راستہ چھوڑنے کو قطعاً تیار نہیں ہیں جو انھوں نے اپنے

لیے پسند کر لیا ہے کیونکہ قرآن نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ قیامت کا وہ دن بھی آنے والا ہے جب مومن ان لوگوں پر ہنسیں گے (سورہ تطفیف آیات ۳۴-۳۵)۔

اگر آج خدا کے یہ مخالف اور مجرم کوچہ و بازار کے ایک گوشے میں مومنوں پر طعن و طنز میں مشغول ہیں تو قیامت میں مومنین اور نبیوںؑ کے ماننے والے خدا کی رحمت کے سائے میں، بہشت کے تختوں پر تکیے لگائے ان مجرموں پر ہنسیں گے۔

منافقوں کی تخریب کاری

ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ پیغمبر صرف مخالفوں کے ہاتھوں ہی تکلیفیں نہیں اٹھاتے تھے بلکہ شاید ان کے برابر ہی منافقوں سے اذیت پاتے تھے۔ وہی لوگ جنھوں نے آنحضرتؐ کی مسجد کے مقابلے میں مسجد بنائی تھی تاکہ وہ مسلمانوں کی جماعت کو دو حصوں میں تقسیم کر دے اور منافقوں کے اکٹھے ہونے کا اڈہ بھی بن جائے۔ شاید آپ نے بھی سنا ہو کہ انھوں نے اپنی مسجد کے افتتاح کے لیے پیغمبرؐ خدا کو بھی بلایا تھا لیکن آپؐ نے اس کا افتتاح کرنے کی بجائے اسے منہدم کرا دیا اور جلوا دیا کیونکہ خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ آپ اس مسجد میں ہرگز نماز نہ پڑھیے گا جو مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے اور ان کی صفوں میں شگاف ڈالنے اور جاسوسی کرنے کے لیے بنائی گئی ہے (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۰۸)۔ منافقوں کی تخریب کاری ایک دو کاموں تک ہی محدود نہیں ہے۔ انکا مقصد اسلام کو نقصان پہنچانا اور پیغمبرؐ کے تمام کاموں کو ان کی اصلیت کے برعکس دکھانا ہے (سورۂ توبہ۔ آیت ۴۸)۔ یہ لوگ جھگڑے کے خواہشمند اور اس کی امید میں ہیں (سورۂ توبہ۔ آیت ۴۸)۔ یہ منافق اگر دشمن کے خلاف جنگ میں

شریک ہوں گے تو اسلام پر چوٹ لگانے، دشمنوں کو خبریں پہنچانے اور مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ پیدا کرنے ہی کے لیے ہوں گے اور دشمن کے خلاف لڑائی میں ان کی شرکت سے خرابی، وحشت، بے یقینی اور خوف پیدا ہونے کے علاوہ تمھیں اور کچھ نہیں ملے گا (سورۂ توبہ۔ آیت ۴۷)۔ یہ منافق نماز پڑھتے ہیں تو کاہلی اور سستی سے اور خیرات کرتے ہیں تو بے دلی سے بلکہ میرے تیرے دکھاوے کے لیے (سورۂ توبہ۔ آیت ۵۴)۔

اعتراضات کے الجھاوے

یہ منافق پیغمبرؐ پہ مالی مسائل میں بہت شدید نکتہ چینی کرتے تھے مثلاً وہ زکات اور محصولات کے خرچ کے بارے میں عیب نکالا کرتے تھے اور اعتراض کرتے تھے کہ فلاں جگہ کیوں خرچ ہوا یا کیوں خرچ نہیں ہوا؟ (سورۂ توبہ۔ آیت ۵۸)۔ قرآن کہتا ہے کہ منافقوں کے یہ طعنے ذاتی مفاد کی وجہ سے ہیں۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ان محصولات اور زکات کا ایک حصہ ان کو دیدیا جائے تو یہ راضی اور خاموش ہو جائیں گے (سورۂ توبہ۔ آیت ۵۸)۔

بے شک ان کی خوشی اور ناخوشی کسی نظریے یا عقیدے کی بنا پر نہیں ہے۔ ہم اپنی گفتگو کو سمیٹ کر اس موضوع کو جو نبیوں کے مخالفوں اور ان کی تخریب کاریوں سے متعلق تھا اس جگہ ختم کرتے ہیں اور اولوالعزم پیغمبروں کے حامیوں کی جانثاریوں کے بارے میں بھی کچھ بات چیت کرتے ہیں کیونکہ انکی جانثاریوں سے واقفیت بھی دینی تربیت کے لیے اچھا اثر رکھتی ہے۔

انبیاءؑ کے حامیوں کے میلان کا سبب

ان لوگوں کے خیال کے برعکس جو یہ سوچتے ہیں کہ نبیوںؑ کی جانب مومنوں کے جھکاؤ کا سبب صرف ان کی اقتصادی محرومی ہے اور چونکہ نبی ظلم، غربت اور استحصال کے خلاف لڑتے تھے اس لیے یہ غریب لوگ ان کے چاروں طرف گھر آتے تھے مگر یہ خیال حقیقت سے مربوط نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی تشریح اور معنی آفرینی اس وجہ سے کی جاتی ہے کہ انسان کی ہستی میں حق کی تلاش کے فطری جذبے کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اس کے علاوہ ہم بعض لوگوں کی تاریخ میں یہ پاتے ہیں کہ انکی مالی حالت بہت اچھی تھی اور ان کے کام اور زندگی میں بھی کوئی ظلم و ستم اور غربت موجود نہیں رہی ہے لیکن انھوں نے اشتیاق سے انبیاءؑ کی راہ اختیار کی اور اپنے مال، جان اور آسائش کو بھی اس راہ میں قربان کر دیا مثلاً فرعون کی بیوی آسیہؑ اور پیغمبرؐ اسلام کی زوجہ ام المومنین حضرت خدیجہؑ وغیرہ، اس لیے اگر کوئی یہ کہے کہ انبیاءؑ پر ایمان لانا صرف روٹی، کپڑے اور آزادی کی غرض سے ہے تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو کہتا ہے کہ ناک صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ اس پر چشمہ لگایا جائے۔ واہ ری غلط خیالی۔

انبیاءؑ کے ماننے والے دو گروہوں میں تقسیم ہیں:

۱۔ وہ پیرو جو ثابت قدم نہیں ہیں۔

۲۔ وہ پیرو جو ثابت قدم ہیں۔

بے استقامت پیرو

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے ایک نبی کے بے وفا پیروؤں کے بارے میں ایک قصہ بیان ہوا ہے جس کا خلاصہ ہم یہاں دہراتے ہیں:

بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد طاغوتوں کی طرف سے سختی، ذلت اور ظلم سے دوچار ہوئے تو ظلم کے خلاف اٹھنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ وہ اپنے پیغمبر حضرت شموئیلؑ کے پاس گئے اور ان سے ایک لائق حکمران مقرر کرنے کے لیے مدد مانگی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ اگر تم کو جہاد اور قتال کا حکم دیا جائے تو تم نافرمانی کرو۔ اس پر ان لوگوں نے ثبات قدم کا یقین دلایا اور کہا یہ ستم جو ہم پر ہوا ہے، ہمارے شہروں پر مخالفوں کا قبضہ ہوگیا ہے اور ہماری عورتیں اور بچے سرگرداں ہوگئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس کے خلاف جنگ نہ کریں۔ ہم ضرور لڑیں گے اور ہم آپ سے صرف ایک لائق حکمران کے تقرر کی درخواست کرتے ہیں۔ پیغمبرؑ نے خدا سے اس امت کو ایک لائق حکمران عطا کرنے کی دعا کی۔ دعا قبول ہوگئی اور خدا کی طرف سے طالوت نامی ایک شخص جو جسم اور علم کے لحاظ سے اس کام کے لائق تھا لوگوں پر حکمرانی کے لیے پیغمبرؑ کو بتا دیا گیا۔ پیغمبرؑ نے بھی لوگوں سے اس کا تعارف کرایا اور اسے حاکم مقرر کر دیا لیکن وہ لوگ جن کی عقل ان کی آنکھوں اور کانوں میں تھی یوں بولے یہ سربراہ جو نہ کوئی اچھی وضع قطع رکھتا ہے اور نہ نام و شہرت ہم ہرگز اس کا حکم نہیں مانیں گے کیونکہ اگر یہ طے ہوا ہے کہ وہ ہمارا حاکم بنے تو ہم اپنے آپ کو حکومت کے اس منصب کے لیے اس سے زیادہ لائق سمجھتے ہیں

اس لیے کہ ہم اس سے زیادہ مالدار ہیں۔ پیغمبرؑ نے بہت کچھ کہا کہ طالوت کی حکمرانی خدا کی طرف سے طے ہوئی ہے اور وہ بھی اس کی جسمانی اور علمی فضیلتوں کی وجہ سے لیکن وہ لوگ نہیں مانتے اور اس حیلے سے اپنے لڑنے والے ساتھیوں سے جدا ہو گئے، اس طرح انقلابیوں کی تعداد کم ہو گئی اور یہ ایک امتحان تھا جس نے ان میں سے ایک گروہ کو مردود بنا دیا۔

دوسرا امتحان یہ تھا کہ اس حاکم نے ان لوگوں سے جنھوں نے اسکی حکمرانی اور رہبری قبول کر لی تھی یہ کہا کہ اپنے وقت کے طاغوت کے خلاف لڑائی میں تم لوگ ایک معمولی سی پابندی کے ذریعے خدا کی طرف سے ایک آزمائش میں ڈالے جا رہے ہو۔ چنانچہ میں تم کو صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔ اب تم ایک نہر کے کنارے پہنچ رہے ہو تمہیں اس میں سے پانی نہیں پینا چاہیے اور جس کسی نے بھی اس میں سے پیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ پیٹو سپاہی میری لڑائی کی پہلی صف میں کوئی وقعت نہیں رکھتا (البتہ اس مقدار میں پینا جو ایک چلو سے زیادہ نہ ہو کوئی مضائقہ نہیں رکھتا)۔ وہ تمام انقلابی جو ظلم کے خلاف اٹھے تھے اور لڑائی کا تقاضا کر رہے تھے، ان سب نے یہ شرط مان لی لیکن جب عمل کا وقت آیا اور نہر تک پہنچ گئے تو اس سے منہ نہ موڑ سکے اور تھوڑے سے آدمیوں کے سوا سب نے نہر کا پانی سیر ہو کر پی لیا۔ اس جگہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح اس آزمائش نے ایک گروہ کو مردود بنا دیا اور ایک چھوٹی سی پابندی میں پیٹو اور مصنوعی انقلابی شکست کھا گئے۔

تیسرا امتحان اس وقت ہوا جب مخالفوں کے بڑے لشکر سے انقلابیوں کی مڈبھیڑ ہوئی اور وہ خوف سے اتنے بدحواس ہو گئے کہ شور مچانے لگے کہ

ہم ان کے دشمن نہیں ہیں اور پہلی صف سے نکل آئے' اس طرح ایک اور گروہ مردود ہو گیا لیکن چند لوگوں نے جو واقعی مقصد پہ ایمان رکھتے تھے اور خدا اور انبیاءؑ کی راہ پر چلتے تھے حکمرانی کے معاملے میں بھی کوئی عذر نہیں کیا اور دوسرے امتحان میں بھی پانی پینے سے پرہیز کیا' وہ ارادے کے لحاظ سے بھی قوی تھے اور خوف نہیں کھاتے تھے۔ انھوں نے نعرہ مار کر دشمن پہ حملہ کیا اور داؤدؑ نامی ایک نوجوان نے بڑے لشکر کو شکست دیدی (سورہ بقرہ۔ آیت ۲۴۹)۔

ہم نے جو کچھ یہاں بیان کیا ہے وہ ایک بہت عبرت انگیز قصے کی منظر کشی ہے جو قرآن کریم نے سورۂ بقرہ کی آیات ۲۴۷ سے ۲۵۳ میں سنایا ہے۔ اس قصے میں سچے اور جھوٹے پیروؤں اور نعرہ بازوں اور عمل کرنیوالوں کا فرق بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور ہم سب کو خبردار کرتا ہے کہ نام کا انقلابی ہونا مشکل نہیں ہے لیکن انقلابی روش پر قائم رہنا مشکل ہے۔ ان سب کا نعرہ بھی فتح تک لڑائی تھا لیکن ہر مرحلے میں ایک ایک گروہ کم ہوتا گیا یہاں میری نوکِ قلم پر کچھ اور مضامین بھی ہیں جو میں اب بیان تو نہیں کرتا لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ واقعہ صرف اسی وقت کی تاریخ سے متعلق نہیں ہے بلکہ ہمیشہ ہی دعویٰ بڑا اور عمل چھوٹا' نعرہ زیادہ اور یقین کم ہوتا ہے یعنی کام کے آغاز میں گرمی اور آخر میں ٹھنڈ پیدا ہو جاتی ہے۔

غدیر خم کے مقام پر تقریباً ایک لاکھ آدمیوں نے امیر المومنین امام علیؑ کو رہبری کے منصب پر مبارک باد دی تھی لیکن دو ہی مہینے کے بعد اسے بھول گئے۔ قتلِ عثمان کے بعد تمام طبقوں نے امام علیؑ کے گرد ہجوم کر کے ان کی بیعت کر لی لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ان کی

حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں جنھوں نے جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیاں کھڑی کروادیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کو لوگوں نے کوفے بلایا تاکہ ان کی مدد سے اموی حکومت کو تہ و بالا کردیں لیکن وہ کوفہ نہیں پہنچے تھے کہ ان کو کربلا میں شہید کردیا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کو لڑائی میں کھینچ لائے لیکن مقابلے کے وقت پہلوتہی کر کے معاویہ کے لشکر سے جا ملے۔

خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی نماز کے خطبے میں مشغول چھوڑ کر نماز کی صف سے درآمدی مال بیچنے والوں کے ڈھول کی آواز کے پیچھے چلے گئے۔

ہم روایتوں میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ امام آخر الزماں امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت ایک گروہ آپ کی مخالفت کرنے اور آپ سے لڑنے کے لیے مسجدوں سے نکلے گا۔

یہ بات بے بنیاد نہیں ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام حاسد بھائیوں کے شر، کنوئیں کے اندھیرے اور قید خانے سے چھوٹ کر اور نئی عزت تک پہنچ کر یہ دعا کرتے ہیں کہ: "اے خدا مجھے بحیثیت مسلمان مارنا۔"

جب کام کی قدر و قیمت اس بات سے ہے کہ اس کا انجام اچھا ہو تو پھر یہ بات بے وجہ نہیں جو امیر المومنین امام علی علیہ السلام پیغمبرؐ سے اپنی شہادت کی خبر سن کر یہ نہیں پوچھتے کہ مجھے کون قتل کرے گا؟ مجھے کیوں ماریگا؟ بلکہ فقط یہ پوچھتے ہیں "کیا میں دشمن کی تلوار کا وار کھاتے وقت اپنے عقیدے کی راہ پر ہونگا یا نہیں؟"

مختصر یہ ہے کہ قول اور عمل میں، وعدے اور اس کی وفا میں، دعوے اور ثبوت میں بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ اگر قرآن میں تقریباً بیس بار لوگوں کے امتحان کی بات آتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ جب تک طرح طرح کے امتحان پیش نہیں آتے انسان کی اصلی خوبیاں اور فضیلتیں نہیں کھلتیں۔ ابتدا ہی میں اسلام کی تاریخ میں ابوذرؓ، بلالؓ اور میثمؓ جیسے لوگوں نے اذیتیں جھیلیں لیکن اپنے عقیدے سے دستبردار نہیں ہوئے۔ ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے اذیت کے باعث اسلام سے ہی ہاتھ اٹھا لیا۔ ڈاکٹر محمد ابراہیم آیتی نے ان میں سے کچھ لوگوں کے نام اپنی کتاب "تاریخ پیغمبرؐ اسلام" میں گنوائے ہیں۔

اب جو ہم نے بے وفا دوستوں اور پیروؤں کے بارے میں کچھ بات چیت کی ہے تو انبیاءؑ کے وفادار دوستوں اور پیروؤں کے بارے میں بھی تھوڑی سی بات چیت کیے لیتے ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن بہت سی آیات پیش کرتا ہے جن میں سے ہم کچھ آیتیں مختصر ترجمے کے ساتھ یہاں درج کرتے ہیں۔

واقعی مومن وہ لوگ ہیں جو خدا اور اسکے رسولؐ پر ایمان لائے اور کسی وقت بھی شک و شبہ سے دوچار نہیں ہوتے (سورۂ حجرات۔ آیت ۱۵)۔

کچھ اہل عرب پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا فوراً ہی ان کے جواب میں پیغمبرؐ خدا سے خطاب کرتا ہے: ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم نے فقط اسلام کا اظہار کیا ہے۔ ابھی ایمان کی روح اور حقیقت تمہارے دل کی گہرائی میں نہیں اتری (سورۂ حجرات۔ آیت ۱۴)۔

انبیاءؑ کے سچے پیرو وہ لوگ ہیں کہ جب ثالثی کے لیے پیغمبر کے پاس بلائے جاتے ہیں تو دل وجان سے کہتے ہیں: ہم سنتے ہیں اور ہم اطاعت کرتے ہیں (سورۂ نور۔ آیت ۵۱)۔ جنگ خندق میں جب پیغمبرؐ خدا مسلمانوں کیساتھ ساتھ خندق کھودنے میں مشغول تھے اور بعض مسلمانوں نے رسولؐ خدا سے اجازت لیے بغیر اپنے کام کی جگہ چھوڑ دی لیکن ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جب ان کو ایک دو دن کے لیے کام چھوڑنے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ پیغمبرؐ سے اس کی اجازت لیتے تھے۔

قرآن سورۂ نور میں اس گروہ کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے: جب وہ پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں ایک جماعت کے طور پر مشغول کار ہوتے تھے تو وہ اپنا کام نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ رسولؐ خدا ان کو چھٹی نہیں دیتے تھے۔ صرف یہی لوگ ہیں جو خدا اور رسولؐ پر حقیقی ایمان رکھتے ہیں (سورۂ نور۔ آیت ۶۲)

ہم سورۂ آل عمران میں پڑھتے ہیں: (اے رسولؐ!) لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم واقعی خدا سے محبت کرتے ہو تو تمھیں میری اطاعت کرنا چاہیے کیونکہ میں اس کا پیغمبر ہوں (سورۂ آل عمران۔ آیت ۳۱)۔ نیز سورۂ آل عمران کی آیت ۶۸ میں بھی ہم یہی پڑھتے ہیں: ابراہیمؑ کے لیے سب سے پسندیدہ آدمی وہ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں۔

خدا اور رسولؐ پر حقیقی ایمان کی دوسری علامت یہ ہے کہ جھگڑوں میں ہم اسے ثالث مقرر کریں (سورۂ نساء۔ آیت ۵۹)۔ دوسری آیت میں قرآن کہتا ہے: وہ لوگ جو جھگڑوں میں کسی طاغوت کی ثالثی اور عدالت کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ حقیقت میں یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ مومن ہیں (سورۂ نساء۔ آیت ۶۰)۔

پیغمبرؐ خدا کے زمانے میں دو صحابیوں میں سینچائی کے معاملے میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ انصاف کے لیے آپ کی خدمت میں پہنچے۔ رسولؐ خدا نے فیصلہ کر دیا، جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا اس نے آپ سے گستاخی کی اور کہا کہ آپؐ نے فلاں کے حق میں فیصلہ کیوں دیا؟ اس موقع پر آیت نازل ہوئی کہ:

"خدا کی قسم صرف وہی لوگ حقیقی ایمان رکھتے ہیں جو جھگڑوں میں تمہارا فیصلہ قبول کرتے ہیں اور اپنے دل میں تمہاری ثالثی سے کسی قسم کی ناخوشی محسوس نہیں کرتے بلکہ تمہارا اور خدا کا حکم بخوشی مان لیتے ہیں" (سورۂ نساء - آیت ۶۵)۔

ہم سورۂ احزاب میں بھی پڑھتے ہیں:

کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا اور رسولؐ کے حکم اور فیصلے کے سامنے اپنے خیال کا اظہار کرے (سورۂ احزاب - آیت ۳۶)۔

انبیاءؑ پر حقیقی ایمان کی ایک اور علامت یہ ہے کہ ہم سیاسی، اقتصادی اور فوجی معاملوں میں بھی عبادت کے مسائل کی طرح وحی الٰہی اور نبیوںؑ سے اپنا لائحۂ عمل حاصل کریں۔ قرآن نے مسلمانوں کے اس گروہ پر شدید نکتہ چینی کی ہے جو اڑتی خبریں ملتے ہی پیغمبرؐوں سے رجوع کیے بغیر انھیں آگے بڑھانے لگتا ہے اور کہتا ہے:

جس وقت انھیں جیت اور ہار کی خبر ملتی ہے وہ اس کی چھان بین کیے بغیر اسے عام کر دیتے ہیں۔ اگر یہ لوگ ان خبروں کو پیغمبرؐ خدا اور ان رہنماؤں تک پہنچا دیں جو معاملات کو پہچاننے کی قدرت رکھتے ہیں تو وہ ان

مسائل کا تجزیہ کریں گے اور اس کے بعد صحیح صورتِ حال سے عوام کو آگاہ کریں گے (سورۂ نساء۔ آیت ۸۳)۔

یہ آیت تمام صدیوں اور زمانوں کے لیے ایک مکمل قانون بیان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ سیاسی اور فوجی مسائل وغیرہ کے سلسلے میں بھی عبادت کے مسائل کی طرح پیغمبرؐ، خاندانِ وحی اور ان بزرگوں کے جانشینوں سے براہِ راست رابطہ رکھیں ورنہ سیاست باز، معاشرے کو اپنی مرضی کے نت نئے راستوں کی طرف لے جایا کریں گے۔

نبیوںؑ کے سچے اطاعت گزاروں کے بارے قرآن یوں کہتا ہے:

وہ ایسے لوگ تھے کہ زخموں کی کثرت کے باوجود جو انھوں نے جنگ احد میں پیغمبرؐ خدا اور اسلام کی حمایت میں کھائے تھے اور مرہم پٹی اور علاج میں مشغول تھے، جب تیاری کے لیے پیغمبرؐ خدا کا نیا حکم صادر ہوا تو اپنے زخموں کو بھول گئے اور اپنے آپ کو دوسرے حملے میں شرکت کے لیے آمادہ کر لیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنی جاں نثاریوں کے باوجود قرآن ان مجاہدوں کی تعریف پرہیز گاری سے مشروط کرتا ہے (سورۂ آل عمران آیت ۱۷۲)

بے شک مکتبِ اسلام میں اگر خاتمہ نیکی اور تقویٰ کے ساتھ نہ ہو تو قید خانہ، اذیت، تلوار، ایثار اور پیغمبرؐ کا صحابی ہونا کوئی وقعت نہیں رکھے گا۔ ان مجاہدوں نے سب سے زیادہ کڑی شرطوں کے ساتھ پیغمبرؐ کی حمایت کی لیکن ان کی تعریف تقویٰ سے مشروط ہو گئی۔ سورۂ آلِ عمران میں ہی نبیوں کے پیروؤں کی جاں نثاری کے بارے میں ایک اور آیت پر نظر پڑتی ہے جس کے

بیان کے ساتھ ہی ہم اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

بہت سے پیغمبروں نے کثیر تعداد میں مردان خدا کی ہمراہی میں جنگ کی اور ان پچھلے مجاہدوں نے ان بہت سی چوٹوں کے باوجود جو انھوں نے خدا کی راہ میں کھائیں، سستی، کمزوری اور تھکن ظاہر نہیں ہونے دی اور خدا صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

پچھلی امتوں کی ان جانثاریوں کا یہ بیان، آنے والی امتوں کی تربیت پر بڑی حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے، جس طرح پچھلے پیغمبروں کی مصیبتوں کو دہرانے کا عمل رسولؐ اکرم کی ذات کو تسلی دینے اور حوصلہ بخشنے میں معقول اثر رکھتا ہے۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں پیغمبرؐ اسلام کے وفادار اطاعت گزاروں میں شمار کرے۔

اِمامت

کیا امام کو پہچاننا اصولِ دین میں داخل ہے؟

راغب اصفہانی نے کتاب مفردات القرآن میں لکھا ہے کہ امام کے معنی پیشوا کے ہیں یعنی جس کی پیروی کی جائے اسے امام کہتے ہیں چاہے وہ کتاب ہو چاہے انسان، خواہ حق ہو خواہ باطل اور اس لفظ کی جمع ائمہ ہے۔

اب جو ہم امام کے معنی سمجھ گئے ہیں تو مندرجہ بالا سوال کا جواب دیتے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم اس موضوع سے متعلق آیتیں اور روایتیں لکھ دیں اور اس امر کا فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دیں۔

۱۔ غدیر خم کے واقعے میں قرآن شریف حضرت محمد مصطفیٰؐ کو مخاطب

کرکے کہتا ہے:

اے رسولؐ! جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے اسے بہ تمام وکمال لوگوں تک پہنچادیں اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو گویا آپ نے پیامبری کا کام ہی انجام نہیں دیا (اور اب تک آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ سب حقیقت میں ضائع ہو جائیگا)۔ اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا (سورۂ مائدہ آیت ۶۷)

یہ دھیان رہے کہ سورۂ مائدہ آخری سورت ہے جو پیغمبرؐ پر اخیر عمر میں نازل ہوئی اور یہ بھی دھیان رہے کہ آنحضرتؐ توحید، شرک، بت شکنی، رسالت قیامت اور نماز کے مسائل سالہا سال تک متواتر لوگوں سے بیان کرتے چلے آرہے تھے اور یہ بھی دھیان رہے کہ جہاد، روزہ، خمس اور زکات کا حکم ۲ھ میں صادر ہوا تھا اور اب ۱۰ھ ہے جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی ہے جو ایسی سخت تاکید سے اس حکم کو بیان کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دھیان رہے کہ پیغمبرؐ خدا کوئی ڈرنے والے انسان نہیں تھے ورنہ وہ بعثت کے ابتدائی برسوں ہی میں ڈر جاتے جب وہ تنہا تھے نہ کہ آخری برسوں میں جبکہ ان کے ہزاروں پیرو اور عقیدتمند موجود تھے لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ ڈرو نہیں ہم تمہاری حفاظت کریں گے اور اس بات پر بھی غور کریں کہ یہ آیت جس مقام پر نازل ہوئی ہے وہ قافلوں کے متفرق ہو جانے کا مقام ہے۔ ہوا سخت گرم ہے اور پیغمبرؐ خدا کی عمر کا آخری سال ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو پیغام آپ اب پہنچانے والے ہیں وہ کسی ایسے موضوع سے متعلق ہے کہ پیغمبرؐ خدا کو منافقوں کی تخریبکاری کا خدشہ ہے۔ بہرحال تمام باتوں پر دھیان دینے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سورۂ مائدہ

کی ۶۷ ویں آیت اپنے اندر ایک بہت بڑا پیغام رکھتی ہے اور وہ رسولؐ کی جانشینی اور امامت اسلامی کے لیے ایک معصوم رہنما کے تقرر کا مسئلہ ہے۔ حضرت رسولِ خدا کے ایسے بہت سے اصحاب نے جو تمام مسلمانوں میں مقبول ہیں اس واقعے کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے واقعے اور جانشینی رسولؐ سے متعلق ہے۔ مزید معلومات کے لیے علامہ امینی کی کتاب "الغدیر" ملاحظہ فرمایئے۔

امامت اصول دین میں شامل ہے

۱۔ ہمارا نقطۂ نظریہ ہے کہ خدا پیغمبرؐ کو تاکید کرتا ہے کہ اگر آپ نے اپنے صحیح جانشین کے تعارف اور تقرر میں کوتاہی کی اور معاشرے کی حفاظت کے خیال اور بعض منافقوں کی تخریب کاری کے خوف سے سستی برتی تو گویا آپ نے خدا کی پیغام رسانی ہی نہیں کی۔ ہم آیت کے زوردار لہجے اور پیغمبرؐ خدا کی پوری تبلیغات کو جانشین کے تعارف اور تقرر سے وابستہ کر دینے سے یہ سمجھتے ہیں کہ امامت اصول دین میں شامل ہے۔

۲۔ کتاب وسائل الشیعہ کی پہلی جلد میں ۲۹ اور مستدرک الوسائل میں ۷ احادیث یہ بیان کرتی ہیں کہ اسلام کی بنیاد چند اصولوں پر ہے اور ان سب میں ولایت اور رہبری کا مسئلہ اس کی اہم ترین بنیاد سمجھی گئی ہے۔ ہم اس کی کچھ تشریحیں اس جگہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ جیسا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں، اسلام کی بنیاد نماز، زکات، حج، روزے اور ولایت پر قائم ہے۔ زرارہ نامی ایک شخص جو امامؑ کے بڑے صحابیوں میں شمار ہوتا ہے، امامؑ سے دریافت کرتا ہے کہ ان

بنیادوں میں سے کونسی سب سے زیادہ اہم ہے؟ امامؑ فرماتے ہیں: ولایت سب سے زیادہ اہم ہے اور پھر اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں لِاَنَّھَا مِفْتَاحُھُنَّ وَالْوَالِیُ ھُوَالدَّلِیْلُ عَلَیْھِنَّ کیونکہ ولایت نماز، روزے اور حج کی کنجی ہے اور والی تمام معاملات میں رہبر اور ہادی ہوتا ہے البتہ ولایت سے امام معصوم کی اطاعت مراد ہے کیونکہ بعض روایات میں ولایت کے لفظ کی جگہ اطاعت امام کا لفظ آیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نماز، روزے، حج اور زکات میں سے ہر ایک بنیاد مالی اور جسمانی قوت نہ ہونے کی صورت میں تبدیل ہوجاتی ہے لیکن امام حق کو تسلیم کرنے کا مسئلہ ہر حال میں یکساں طور پر قائم رہتا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبرؐ اکرم نے نماز، روزے اور حج کے احکامات بیان کرنے کے لیے نہ تو لوگوں کو جمع کیا اور نہ سب کے سامنے بہ آواز بلند اعلان کیا لیکن امام کے تعارف اور تقرر کی خاطر غدیر خم کے بیابان میں بڑی دیر تک لوگوں کے جمع ہونے کا انتظار کیا اور جیسے ہی سب لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوگئے معصوم رہبر یعنی امام کے تقرر کا علی الظاہر اعلان فرمایا۔

اس سے قطع نظر کہ لوگ اصل مسئلے ہی کو چھوڑ بیٹھے مجھے خوب یاد ہے کہ خانہ خدا کا طواف کرتے وقت جب میں نے کعبے کو دیکھا تو اس خیال میں ڈوب گیا کہ یہ کعبہ امام علی علیہ السلام کی والدہ گرامی کے لیے زچہ خانہ اور خود امام علی علیہ السلام کا گہوارہ ہے کہ جنھوں نے اسی کعبے کی چھت پر سے بتوں کو توڑ پھینکا تھا۔ پھر میں ان طواف کرنے والوں کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ یہ لوگ بچے کو گہوارے سے باہر گرا کر کس طرح اس گہوارے کے گرد گھوم رہے ہیں۔

۳۔ تیسری دلیل جو امامت کی اہمیت کے لیے دی جا سکتی ہے وہ یہ مشہور حدیث ہے: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إِمَامَ زَمَانِهِ مَاتَ مِيتَةً الْجَاهِلِيَّةِ اگر کوئی اس حال میں مر جائے کہ وہ اپنے زمانے کے امام کو نہ جانتا ہو تو گویا وہ ظہور اسلام سے پہلے کے زمانہ جاہلیت کی موت مرا۔

۴۔ اصول کافی کی تیسری جلد میں لکھا ہے کہ وہ لوگ جو امام حق سے تعلق کے بغیر از خود اعمال بجالانے کی زحمت اٹھاتے ہیں خدا ان اعمال کو قبول نہیں کرے گا۔ اسی طرح جیسے اگر کوئی شخص کسی ادارے کی نمائندگی کے حق اور اس کی اطلاع و اجازت کے بغیر اس کے لیے کچھ مال خریدے گا تو وہ اس کے ذمہ دار منتظمین کی مہربانی اور سرپرستی کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔ غرض اسلام میں محرکات، مقاصد، راہ اور رہبری کے مسئلے کو غیر معمولی اعتبار اور اہمیت حاصل ہے۔

نتیجہ

قارئین کرام مندرجہ بالا چاروں دلیلوں پر ایک سرسری نظر ڈال کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلام میں امامت اصل ہے یا فرع۔ مختصر یہ کہ توحید اس وقت تک توحید ہے جب تک کہ معاشرے کا حاکم معصوم رہبر ہے ورنہ توحید کی جگہ طاغوت پھلیں پھولیں گے۔ نبوت اور نبیوں کا قانون اس وقت تک قائم ہے جب تک کہ معصوم رہبر اس کی حفاظت کرتا ہے ورنہ آسمانی قوانین بے کار باتوں، تبدیلیوں، بدعتوں اور شخصی طریقوں میں گھل مل جائیں گے اور وحی آسمانی بے اعتبار ہو کر رہ جائے گی۔

قیامت اور اس کے روحانی مسائل سے واقفیت بھی امام کے طریقے کے علاوہ کسی اور طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ اگر ہم عقل سے کام لیں تو یہ سمجھ میں آجائے گا کہ معاشرہ قانون اور رہبر کے بغیر ایک جنگل کی طرح ہے اور قانون اور رہبر دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح رہبری اور امامت کے مسئلے اور معاشرے کے نظام اور قانون کی حفاظت اور بقا میں اس کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

توحید سے امامت کا تعلق

جس وقت امام علی رضا علیہ السلام شہر نیشا پور سے گزر رہے تھے تو ان کے عقیدتمندوں نے انھیں گھیر لیا اور ان سے ایک حدیث بیان کرنے کی التجا کی۔ امام علیہ السلام نے ایک حدیث جو انھوں نے اپنے والد سے اور ان کے والد نے اپنے والد سے یہاں تک کہ پیغمبرؐ اکرم سے اور انھوں نے جبرئیلؑ امین اور انھوں نے خداوند عالم سے سنی تھی، اس طرح بیان فرمائی کہ خدا فرماتا ہے: کَلِمَۃُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ حِصْنِیْ فَمَنْ دَخَلَ۔۔۔ عَذَابِیْ یعنی توحید میرا قلعہ ہے۔ جو شخص اس میں داخل ہو جائے گا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو جائے گا۔ امام رضا علیہ السلام یہ حدیث فرما کر آگے بڑھے۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ لوگوں نے دیکھا امام علیہ السلام رک گئے اور فرمانے لگے بِشُرُوْطِھَا وَاَنَا مِنْ شُرُوْطِھَا یعنی توحید[1] اپنی شرائط

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۳ طبع جدید۔

کے ساتھ خدائی قلعہ ہے اور میں خود ان شرائط میں سے ایک شرط ہوں۔ اس مقام پر امام ؑ نے توحید اور امامت میں شرط اور مشروط کا رشتہ قرار دیا وہی رشتہ جو مشین (گاڑی) اور اس کے پہیے میں ہے یا نماز اور وضو میں ہے یعنی امامت کے پائے کے بغیر توحید پر لوگوں کا ایمان ڈگمگانے لگتا ہے۔ جب تک توحید مورد بحث ہے معصوم کی امامت بھی زیر بحث رہے گی اور وہ بھی زندہ اور موجود امامت۔

مثال

اگر طبیب نے اپنے مریض کو یہ ہدایت دی ہو کہ تم اس انجکشن یا اس کیپسول میں سے جو چاہو اپنے آرام کے لیے استعمال کر سکتے ہو تو بیمار اس ہدایت کا یہی مطلب سمجھے گا کہ انجکشن اور کیپسول کی کیمیاوی ترکیب ضرور ایک ہی ہوگی کیونکہ دونوں کا اثر یعنی آرام اور صحت بھی ایک ہی ہے۔

تفسیر نور الثقلین اور سفینۃ البحار میں ایک حدیث یوں بیان کی گئی ہے:
وَلَایَۃُ عَلِیِّ ابْنِ اَبِیْ طَالِبٍ حِصْنِیْ فَمَنْ دَخَلَ حِصْنِیْ اٰمِنَ مِنْ عَذَابِیْ علیؑ کی امامت خدا کا قلعہ ہے جو کوئی اس قلعہ میں داخل ہو جائیگا وہ محفوظ ہو جائیگا۔

اب ذرا توجہ فرمائیے کہ توحید سے بھی قلعہ مراد لیا گیا ہے اور علی ابن ابیطالبؑ کی ولایت سے بھی اور دونوں کا افادہ بھی ایک ہی ہے یعنی عذاب الٰہی سے نجات۔ یہ ہے ایک توضیح امامت اور توحید میں ایک گہرے تعلق کی۔ بے شک اگر ہم حضرت علیؑ کی امامت قبول کرتے ہیں تو وہ ہم کو خدا کی طرف بلائیں گے

لہ سفینۃ البحار کلمہ (ولی)

اور اگر ہم خدا سے رہبری طلب کرتے ہیں تو وہ ہم کو علیؑ کی رہبری کی طرف بھیجے گا۔

امام کی ضرورت

جس دلیل کی رو سے ہمیں ایک پیغمبر کی ضرورت ہے اسی دلیل کے تحت ہم وجودِ امام کے بھی حاجتمند ہیں اور اگر انسان زندگی کی راہ تلاش کرنے میں خود کفیل ہوتا تو اسے انبیاءؑ کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ ہم نے اس سے پہلے نبوت کے متعلق جو بحث کی ہے اس میں پیغمبر کی ضرورت کی دلیلیں پیش کر چکے ہیں۔

کیا قرآن کافی نہیں ہے؟

قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ تمام اسلامی جماعتیں اور فرقے اس کی آیات کو سند مانتے ہیں اور ہر شخص ان میں سے کچھ آیتیں منتخب کر کے ان سے اپنے فائدے کے لیے استدلال کرتا ہے۔ پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآن امام کے بغیر صحیح راستہ پا لینے میں معاشرے کے لیے کافی ہے؟

کیا طب کا قانون اور کتاب طبیب کے بغیر بیماروں کو شفایاب کر سکتے ہیں؟
کیا قانون کسی حاکم، تشریح کرنے والے، جاری کرنے والے اور سمجھنے والے کے بغیر تنہا کافی ہے؟

کیا ہر نظریہ ایک صاحب نظریہ نہیں رکھتا؟
کیا یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد تو عبادت کرنا اور خدا کی راہ اختیار کرنا ہو لیکن اس سلسلے میں اسے راہ دکھانے والے کی ضرورت نہ ہو؟

کیا یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ انسان، انسانیت کے بلند مقام تک پہنچنے کا عاشق تو ہو لیکن خارج میں اسکے سامنے کسی ایسے معشوق کا وجود ہی نہ ہو؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہر داخلی و باطنی احساس کے لیے ایک خارجی و ظاہری حقیقت بھی موجود ہو جو اسکی تسکین کرتی ہے لے

مثلاً ہم اگر اندرونی طور پر پیاس محسوس کرتے ہیں تو ہمارے جسم کے باہر اس کا جواب یعنی پانی بھی وجود رکھتا ہے۔ اسی طرح آپ کو تمام اندرونی احساسات کا خارجی جواب ملے گا۔ پھر یہ بات ہم کیونکر مان لیں کہ انسان میں ترقی کا اور نیکی کی چوٹی پر پہنچنے کا جذبہ تو ہو لیکن ایسی کوئی چیز جسے اس ضرورت کی تکمیل یا جواب کہا جا سکے اس کے ذہن سے باہر کوئی وجود نہ رکھتی ہو۔

لے صوفیا کا روحانی قطب کی ہر دور میں لازمی موجودگی کا عقیدہ اور اس سے منسوب صفات بھی شیعوں کے عقیدۂ امامت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اہل بیت رسولؐ کے قول کے مطابق امام — صوفیا کی زبان میں — ایک آفاقی انسان، اسمائے الٰہی کا مظہر اور لوگوں کی زندگیوں اور اعمال کا رہنما ہوتا ہے لہٰذا اہل تشیع کے ولایت کے تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روحانی زندگی اور ولایت کے ماخذ کے لحاظ سے صوفی اکابر شیعہ ہیں گو دین کی ظاہری صورت کے لحاظ سے وہ سنی مکتب کی پیروی کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل تشیع کو امام معصوم کے پیرو ہونیکی وجہ سے وہ تمام چیزیں حاصل ہیں جو اہل تصوف بتاتے ہیں اس کے برعکس خود اہل تصوف جس قطب اور انسان کامل کا تصور کرتے ہیں وہ شیعی دنیا کے علاوہ کہیں وجود خارجی نہیں رکھتا۔ ہاں! "ماننا" اور "تصور کرنا" اور چیز ہے، "ہونا" اور "پانا" اور چیز ہے۔

یہ بات کیسے قبول کی جا سکتی ہے کہ میزبان لوگوں کو بلائے اور انہیں گھر کا پتا نہ دے یا ان کے لیے کوئی رہنما نہ بھیجے خصوصاً ایسے موقع پر کہ راستے میں ایسے لوگ مزاحم ہوں جو مہمانوں کو میزبان کے گھر سے دور کھینچ لے جائیں۔ یہاں میزبان کو چاہیے کہ وہ مہمانوں کے لیے نام اور واضح پہچان کے ساتھ ایک رہنما بھی بھیجے تاکہ وہ انھیں پتا بھی واضح طور پر بتائے اور راستے میں گمراہ کرنے والوں سے لڑائی بھی لڑے اور مہمانوں کو ان کے شر سے بھی بچائے۔

ہم یہ بات کیسے مان لیں کہ انسان زندگی کی سادہ اور محسوس راہوں میں گمراہ ہو جانے کی صورت میں تو رہنمائی کا محتاج ہو لیکن نیکی کی باطنی اور آسمانی راہیں طے کرنے اور حقیقی ترقی حاصل کرنے میں جو زیادہ پیچ دار بھی ہے اور اس سلسلے میں انسان کا علم کمتر اور شیطانی وسوسے زیادہ ہیں وہ کسی رہنما یا رہنمائی کی حاجت نہیں رکھتا۔

آج تک آپ نے کس معاشرے کے بارے میں سنا یا دیکھا ہے کہ اس کے افراد کو کسی رہبر کی ضرورت نہیں ہے اور انھوں نے کسی کو اپنا رہبر تسلیم نہیں کیا ہے؟

کیا شہد کی مکھیوں نے جو اجتماعی زندگی بسر کرتی ہیں اپنے لیے بطور سردار ایک ملکہ کو قبول نہیں کیا ہے؟

کیا آپ حکومت و سیاست اور صلح و جنگ کی تاریخ میں کسی ایسی کامیابی سے واقف ہیں جس میں رہبر کا کردار نظر انداز کر دیا گیا ہو؟

امام کے بغیر سماج کو یعنی بدنظم سماج کو کون عقلمند اور باضمیر شخص قبول کریگا؟ امام علیؑ فرماتے ہیں لَابُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِیْرٍ بَرًّا کَانَ اَوْ فَاجِرًا قوم کے لیے

ایک امیر کا ہونا ضروری ہے۔ چاہے وہ اچھا ہو چاہے برا' بہر حال بدنظمی کے انسداد کے لیے امیر کا وجود لازم و لابدّ ہے۔ ہمیں امام کی ضرورت کے بارے میں مزید بحث نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے سورج کے وجود رکھنے یا ایسی ہی دوسری واضح باتوں کی تشریح کی جائے' اس کے بجائے ہمیں امام اور رہبر کی صفات اور شرائط پر غور کرنا چاہیے۔ اس کے انتخاب کی بنیاد اور معیار پر بات چیت کرنا چاہیے اور رہبر کے تقرر اور معزولی کے موقعوں نیز جھوٹے رہبر کے مقابلے میں سچے رہبر کی پہچان کے طریقے کا جائزہ لینا چاہیے اس لیے ہم امام کی ضرورت کے متعلق بحث کو جلد ہی ختم کیے دیتے ہیں کیونکہ اس موضوع پر کہنے کو بہت کچھ باقی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ امام کی ضرورت پر بحث کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ امام اور رہبر کے بغیر اجتماعی زندگی قائم نہیں رہ سکتی اور امام کی ضرورت ناقابل تردید ہے چنانچہ سب جانتے ہیں کہ خدائی قوانین کے نفاذ اور احکام الٰہی کی حفاظت کی خاطر طاقت اور حکومت ضروری ہے اور طاقت اور حکومت کو صحیح راستے پر لے جانے کے لیے ایک لائق امام کی ضرورت ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ انسان کی رسائی پیغمبرؐ تک نہیں ہو سکتی اور اس نے ختم نبوت کو دل سے مان لیا ہے' امام کی ضرورت ناقابل تردید ہے۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا انسان کے لیے ایک پیغمبر بھیجے اور وہ سخت جانفشانی سے خدا کے احکام اور قوانین کو معاشرے میں جاری کرے اور پھر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دنیا سے رخصت ہو جائے؟ کیا یہ کام دانائی کا ہے؟ کیا امت کو بغیر ہادی کے چھوڑ کر چلا جانا پیغمبر کی اس محبت اور ہمدردی سے جس کا ہمیں علم ہے' میل کھاتا ہے؟

سچ سچ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ دین کے قیام اور امت کی تشکیل میں اس تکلیف اٹھانے کے باوجود اپنے مکتب اور امت کو کسی رہنما کے بغیر چھوڑ کر چلے گئے، وہ خدا کی دانائی اور پیغمبر کی لگن کے متعلق کیا جواب دیں گے اور پھر وہ کون ایسا ذمہ دار انسان ہے جو لوگوں کو اس قدر بے پروائی کے ساتھ چھوڑ جائے گا؟

بنیادی طور پر مکتب اور اسلام کو یا تو اندرونی جذبات اور خارجی حالات سے ہم آہنگ اور اصطلاحاً آگے بڑھنے اور بڑھانے والا ہونا چاہیے یا اس کے خشک قوانین کو کتاب کی تہوں میں دبے رہنا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فراموش ہو جانا چاہیے یعنی اسے ایک جامد مذہب ہونا چاہیے۔

اگر کسی مکتب کے پاس خصوصی اوصاف اور شرائط کا حامل امام ہو تو وہ پہلی قسم کا یعنی ترقی کرنے والا اور ترقی دینے والا ہو گا ورنہ دوسری قسم کا یعنی ایک بے جان مذہب بن کر رہ جائے گا اور اسی دلیل کے مطابق امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: اِنَّ الْاِمَامَۃَ زِمَامُ الدِّیْنِ وَنِظَامُ الْمُسْلِمِیْنَ اُسُّ الْاِسْلَامُ النَّامِیْ[1] سچی رہبری سے مکتب اور دین مستحکم ہوتا ہے اور امامت کے ہاتھوں قائم شدہ اسلامی معاشرے کا نظام اسلام کو وسعت اور ترقی دیتا ہے حتیٰ کہ وہ انسانی قافلے کی تمام انفرادی اور اجتماعی، مادی اور معنوی ضروریات کی کفالت کر سکتا ہے۔ امام علی رضا علیہ السلام ترقی پذیر اسلام کی اس تشریح سے

---

[1] سفینۃ البحار (امام)

ہمیں یہ سمجھاتے ہیں کہ امام کے بغیر اسلام نشوونما اور ترقی نہیں پاسکتا بلکہ زوال پذیر ہوجاتا ہے اور سچی بات بھی یہی ہے کیونکہ ہر روز، ہر مہینے اور ہر سال انسانی معاشرہ ایسے حوادث سے دوچار ہوتا رہتا ہے کہ اگر خدا کا حکم اور اس کی سنت وحی اور سچے رہبر سے مدد نہ کرے تو لوگوں کا چین جاتا رہے اور ہر ایک اپنی اپنی راہ پر چلنے لگے اور پھر اسلامی معاشرہ انتشار میں مبتلا ہوجائے اس لیے مکتب کے ساتھ ساتھ رہبر بھی ہونا چاہیے۔

سچ مچ کیا جھیل پر کسی تیراکی سکھانے والے یا پار لگانے والے کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتی کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا قول امام کے مطابق دنیا ایک گہرا سمندر اور طوفانی دریا نہیں ہے؟ کیا اہلبیتؑ اور معصوم امامؑ نجات کی کشتی نہیں ہیں؟ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا اس دنیا کو دریا کی طرح پیدا کرے اور لوگوں کو اس دریا میں تیرتے ہوئے دیکھے اور رات دن اس میں ہزاروں ڈوبنے والوں کی خبر نہ لے جبکہ دریا بھی ایسا ہے کہ اس میں بھنور پڑتے ہیں، خونخوار جانور رہتے ہیں، یہ خوف دلاتا ہے اور حواس باختہ کردیتا ہے اور اس میں تیرنے والے ایسے ہیں کہ اس کی گہرائی اس کے موذی جانوروں اور اس کے خطروں سے واقف نہیں ہیں پھر کس طرح خدائے دانا ان تیرنے والوں کو اس خطرناک دریا میں ان کے حال پر چھوڑ سکتا ہے؟ یہ بات خدا کی کس حکمت سے میل کھاتی ہے؟ بے شک اگر ہم ذرا سی دیر کے لیے غور کریں تو یہ بات بخوبی واضح ہوجائے گی کہ ہمارے لیے معصوم رہبروں کی موجودگی ضروری ہے۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا نے جسم کے ملک کی حکومت تو عقل کو سونپ

دی ہو تاکہ اس کے ذریعے سے آنکھ اور کان گمراہی اور غلطی سے محفوظ رہیں لیکن دنیا کے عظیم انسانی معاشرے کے لیے خدا کی طرف سے کوئی امام پریشانی دور کرنے، راستہ دکھلانے اور اختلافات مٹانے کے لیے مقرر نہ کیا ہو؟

دنیا کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس سے فائدہ[1] اٹھائے اور اس لحاظ سے انسان موجودات میں سب سے افضل یعنی اشرف المخلوقات ہے انسان کی پیدائش کا مقصد بھی یہ ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرے۔ خدا کی جانب بڑھے اور اپنے کاموں کا رخ خدا کی مرضی کی جانب رکھے۔ ہر مادی یا روحانی عمل میں کچھ چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے جن میں چند یہ ہیں:

۱۔ راستا

۲۔ وسیلہ

۳۔ مقصد

۴۔ رہبر

اس ضمن میں رہبر کا کام راستے، وسیلے اور مقصد ہر ایک سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اگر رہبر نہ ہو تو ہم راستا بھی بھول جائیں گے اور منزل بھی اور ہمارے

---

[1] خداوند عالم قرآن کی بہت سی آیات میں فرماتا ہے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۹)۔ جو کچھ زمین میں ہے وہ سب میں نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے اور ایسی ہی اور بھی آیات قرآن میں آئی ہیں کہ وَ سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ۔ (سورہ نحل۔ آیت ۱۲)۔ خدا نے رات دن اور چاند سورج کو تمہارا تابع بنا دیا ہے۔

ویسے بھی بے جہت کام کریں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کائنات ہمارے لیے پیدا کی گئی، ہم عبادت اور خدا کی جانب سفر کرنے کے لیے پیدا ہوئے۔ خدا کی جانب سفر کے لیے ایک رہنما کی ضرورت پڑتی ہے اور امام ہی اس سفر کا رہنما ہوتا ہے۔

امام کا کردار

انسان کے لیے مثال ضروری ہے تاکہ وہ جان جائے کہ کہاں جا رہا ہے کیسا تھا، کیسا ہے اور اسے کس جیسا ہونا چاہیے۔ امام وہ انسان ہے جس طرح تمام انسانوں کو ہونا چاہیے۔ امام ماڈل ہے، نمونہ ہے، مثال ہے۔ ماڈل کے بغیر انسان بھٹکتا رہتا ہے۔ اگر یہ نمونے خدا کو نہ پہچنوائیں تو اندرونی خواہشات اور توسیع پسند طاقتیں ہمارے لیے نمونے تراش دیں گی۔ اگر ہم اٹھتے بیٹھتے نیکیوں اور اپنے اصل نمونوں کا ذکر نہ کرتے رہیں، ان بزرگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مجسم نہ دیکھیں اور ان سے محبت نہ کریں تو وہ غلط پروپیگنڈوں سے ہمارے سامنے دوسروں کا ذکر کریں گے، ہمارے دل میں ان کی محبت ڈال دیں گے اور ہم کو ان کی طرف کھینچ لے جائیں گے۔ اسی لیے قرآن میں شخصیتوں کے صرف اسی حصے کا ذکر کیا جاتا ہے جو دوسروں کے لیے قابل تقلید نمونہ بن سکتا ہو جیسے حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی وغیرہ لیکن ان کی بیوی کے نام، بیٹوں کی تعداد اور ان کی ولادت اور وفات کی تاریخ سے سروکار نہیں رکھتا۔

امام صرف رہنما نہیں ہے، امام ہے اور صرف سرپرست نہیں ہے بلکہ امام ہے یعنی اس کا عمل، عبادت، کھانا، پینا، لڑنا، خاموش رہنا اور بولنا ہمارے لیے نمونہ

اور سبق ہے۔

امام اقوال کو خیالی حیثیت سے نکال کر واقعیت کی صورت بخش دیتا ہے۔ امام کہتا ہے کہ اسلام کوئی خیال نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ یہ وہم و گمان نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ اسم نہیں مسمّیٰ ہے۔ امام اپنی ان صفات، افکار اور اعمال کے ساتھ ہر جگہ امام ہے اور ہر وقت امام ہے چنانچہ اب بھی حضرت ابراہیمؑ ہمارے لیے امام ہیں۔

قیامت میں امامت کی پرچھائیں

قرآن میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ہم ہر جماعت کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۱)۔ اس سے اپنے ماننے والوں کی گمراہی دور کرنے میں امام کا کردار بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

کئی گنی سزائیں

قرآن پیغمبرؐ کی بیویوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تم میں سے جو کوئی غلطی کرے گی وہ ایسی ہی غلطی کرنے والی دوسری عورتوں سے دگنی سزا پائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی بیوی عمل میں دوسروں کے لیے نمونہ ہے اور رہبری کا کردار ادا کرتی ہے[1] حدیث میں ہے کہ عالم کا ایک گناہ معاف ہونے سے پہلے جاہل کے ستر گناہ بخشے جائیں گے[2] بے شک عالم معاشرے میں لوگوں

---

[1] سورۂ احزاب۔ آیت ۳۰۔ [2] کافی، کتاب فضل العلم۔

کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہوتا ہے اس لیے اس کی غلطی بھی بڑی شمار ہوتی ہے۔

ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی عالم اور دانشمند کوئی چھوٹا سا گناہ بھی کرتا ہے تو وہ اس کے لیے گناہ کبیرہ شمار ہوتا ہے کیونکہ اس کے عمل کا دوسروں پر اثر پڑتا ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بدعت کرنے والوں اور ایسے لوگوں کا گناہ جو سماج میں غلط طریقوں کے بانی اور مشیر ہیں، دوسروں کے کئی گنے گناہ کے برابر ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ لوگ فاسد امام کا کردار ادا کرتے ہیں۔

ایک بہت دلچسپ حدیث

لوگوں نے امام علی نقی علیہ السلام سے پوچھا کہ ایسا کیوں تھا کہ امام علیؑ جنگ جمل میں جو زخمی ہو جاتا تھا اسے چھوڑ دیتے تھے لیکن جنگ صفین میں زخمیوں کو بھی مار ڈالتے تھے؟

امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں یوں فرمایا کہ جنگ صفین میں مخالفوں کا رہبر زندہ تھا، زخمی لوگ بھاگ کر دوبارہ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے، کمی کو پورا کرتے تھے، کمزوروں کو قوت بخشتے تھے اور بیماروں کی مزاج پرسی اور دل جوئی کرتے تھے اور فساد کی جڑ باقی میں تھی (جب تک جڑ باقی میں رہتی ہے پھل کی توقع بھی رہتی ہے) لہذا فتنے کو ختم کرنے کے لیے سب کو مار ڈالنا چاہیے تھا لیکن جمل کے واقعے میں طلحہ و زبیر جیسے لوگوں کے قتل ہو جانے اور حضرت عائشہ کا اونٹ بیٹھ جانے کے بعد بھاگنے والے گمراہوں اور زخمیوں کی کوئی امید اور پناہ گاہ باقی نہیں رہی تھی اس لیے جو زخمی ہو جاتے تھے یا بھاگ جاتے تھے ان کا پیچھا نہیں کیا جاتا تھا (تحف العقول صفحہ ۵۰۸) اس واقعے سے بخوبی سمجھا

جاسکتا ہے کہ باطل کے مقابلے پہ رہبر کا کیا کردار ہوتا ہے اور ہر محاذ پر اس کے طرزِ عمل میں کیا فرق آجاتا ہے۔

امام کی یاد

توسیع پسندوں کی اثراندازی کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ وہ ہمارے جوانوں کو اپنے اماموں اور قابل تقلید نمونوں سے دور کردیں اور ان کے ذہنوں کو دوسروں کے ذکر سے بھر دیں۔ غالباً زیارت امام کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انسان جیسا ہے امام کی خدمت میں جائے اور ایک ایسے انسان کے حضور میں جاکر اسی طرح کھڑا ہو جیسے ہونا چاہیے اور اپنے اور اس کے کردار و عمل کے درمیانی فاصلے اور اپنی کمی کا پتا لگائے۔

امام حسینؑ کی عزاداری کا بھی غالباً یہی سبب ہے کہ انسان مجلس عزا میں بیٹھ جائے اور اسلام کو زندہ کرنے میں ان کے ایثار اور صبر و ثبات کی باتیں سنے پھر اپنے آپ کو پرکھے اور سمجھے کہ زندگی کس طرح بسر کرنا چاہیے، کس طرح مرنا چاہیے اور کون سی راہ اختیار کرنا چاہیے۔

امام کے معنی پر توجہ

امام کا لفظ کتنے دلچسپ معنی رکھتا ہے۔ کتنی اچھی شان رکھتا ہے اور کس قدر دل پذیر ہے۔ یہ لفظ اس قدر معنی رکھتا ہے جتنے کوئی اور لفظ جیسے معلم، مرشد، ہادی، مبلغ، واعظ وغیرہ نہیں رکھتا کیونکہ یہ تمام الفاظ تعلیم و تربیت پر دلالت کرتے ہیں، چلنے پر نہیں لیکن امام وہ ہے جو خود چلتا ہے اور عمل میں سب سے

آگے ہے اور دوسرے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

امام کے کردار کا ایک نمونہ

ایک جنگ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر خود محاذ پر جانا چاہتے تھے لیکن امام علیؑ نے انھیں اس سے منع کیا اور فرمایا کہ تم اس وقت خلیفہ ہو اگر محاذ پر جاؤ گے تو دشمن آپس میں کہیں گے کہ مسلمانوں کے پاس اب کوئی اور قوت باقی نہیں رہی جو کچھ تھی وہ اپنے ساتھ لے آئے ہیں یہاں تک کہ خود خلیفہ کو بھی۔ اس طرح ہماری طرف سے ان پر جو رعب اب تک قائم ہے وہ بھی جاتا رہے گا۔

قیامت میں مستضعفین اپنے رہبروں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیتے تو ہم اپنی فطرت کے مطابق ضرور مومن ہوتے (سورۂ سبا، آیت ۳۱)۔

سورۂ توبہ کی بارھویں آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ لڑائی اور جہاد میں کفر کے رہبروں اور ان کے سرغنوں کو اپنا نشانہ بناؤ۔ پس کفر کے پیشواؤں سے لڑو۔ ہم اپنے پیشواؤں کے بھی ایسے ہی جملے پڑھتے ہیں کہ لوگ اپنے والدین کا اتنا اثر قبول نہیں کرتے جتنے وہ اپنے رہبروں سے مشابہ اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ امام علیؑ نے فرمایا، اَلنَّاسُ بِاُمَرَائِهِمْ اَشْبَهُ مِنْهُمْ بِآبَائِهِمْ یعنی لوگ اپنے حکمرانوں سے اس طرح مشابہ ہوتے ہیں جیسے اپنے والدین سے۔

ہم ایک اور مشہور جملہ پڑھتے ہیں اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ لوگ اپنے بادشاہوں کے طریق پر چلتے ہیں۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے

جس وقت میری امت کے دو گروہ خراب ہو جائیں گے سب خراب ہو جائیں گے اور جب وہ نیک ہو جائیں گے تو سب پر اثر ڈالیں گے اور سب نیک بن جائیں گے۔ وہ دو گروہ امراء اور فقہاء کے ہیں[1]۔ ان کلمات کے مجموعی بیان سے رہبر کا کردار اور اس کا اثر سب پر واضح ہو جاتا ہے۔

حدیث میں امام کا کردار

ہم اصول کافی میں پڑھتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ لَاُعَذِّبَنَّ کُلَّ رَعِیَّۃٍ فِی الْاِسْلَامِ دَانَتْ بِوَلَایَۃِ کُلِّ اِمَامٍ جَائِرٍ لَیْسَ مِنَ اللّٰہِ وَاِنْ کَانَتِ الرَّعِیَّۃُ فِی اَعْمَالِہَا بَرَّۃً تَقِیَّۃً وَلَاَعْفُوَنَّ عَنْ کُلِّ رَعِیَّۃٍ فِی الْاِسْلَامِ دَانَتْ بِوَلَایَۃِ کُلِّ اِمَامٍ عَادِلٍ مِنَ اللّٰہِ وَاِنْ کَانَتِ الرَّعِیَّۃُ فِی اَنْفُسِہَا ظَالِمَۃً مُسِیْئَۃً[2]۔

اس حدیث میں امام باقرؑ خدا کی جانب سے یوں بیان فرماتے ہیں کہ جو گروہ ظالم رہبر کو قبول کر لیتا ہے وہ میرے عذاب اور قہر کا سزاوار بن جاتا ہے چاہے ان لوگوں کے اعمال اچھے ہوں اور وہ متقی ہوں۔ اس کے برعکس جب لوگ ایسے امام عادل کو جو خدا کی طرف سے آتا ہے رہبر مان لیتے ہیں تو وہ میری درگزر اور مہربانی کے مستحق ہو جاتے ہیں چاہے وہ برے چلن والے ہوں اور انھوں نے اپنے آپ پر ظلم ہی کیا ہو۔ اس عظیم حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز عمل سے بھی اہم ہے وہ طریقہ اور راستہ ہے۔ اس حدیث کا مطلب

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۷۸، صفحہ ۴۶ [2] کافی جلد ۱۔ صفحہ ۳۷۶، حدیث ۴۔

سمجھنے کے واسطے ایک مثال پر توجہ فرمائیے۔ جب ایک بس کا ڈرائیور عقلمند، تجربہ کار اور صحتمند ہو گا تو وہ بس منزل پہ پہنچ جائے گی چاہے اس کے بعض مسافروں نے اس بس میں نارنگی کے چھلکے اور سگریٹ کے ٹکڑے ہی بکھیر رکھے ہوں یا وہ میلے کپڑے اور پھٹے جوتے پہنے اس میں بیٹھے ہوں لیکن جب تندرست ڈرائیور موجود ہے تو راستا اچھی طرح طے ہو جائے گا۔

البتہ جب بس کا چلانے والا اور اسے سنبھالنے والا ڈرائیور خود پاگل یا متوالا یا اندھا ہو گا تو موت ان مسافروں کا مقدر بن جائے گی چاہے تمام مسافر بہترین لباس اور نئے جوتے پہنے ہوئے ہوں، لہٰذا سفر میں لباس، رفتار اور دوسرے چھوٹے چھوٹے کاموں کی بجائے اصل اہمیت راہ اور رہبر کو حاصل ہے۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ۔

(سورۂ قصص۔آیت ۵۰)۔ اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اپنی ہی ہوس کے پیچھے دوڑتا ہو اور خدا کی طرف سے اسے کوئی ہدایت نہ ملتی ہو۔

اصول کافی میں اسی آیت کی مناسبت سے ہم ایک حدیث پڑھتے ہیں کہ جو کوئی اپنے مکتب اور دین کو ذاتی سلیقے اور اپنی ہی رائے سے اختیار کرتا ہے اور اپنے سچے امام کی پیروی نہیں کرتا وہ اس آیت کا موضوع اور سب سے زیادہ گمراہ فرد ہے۔[1]

ہم ایک اور حدیث میں پڑھتے ہیں کہ جو شخص بہت زیادہ عبادت کرتا ہے لیکن سچا رہبر نہیں رکھتا وہ درحقیقت گمراہ ہے اور خدا اس کی عبادتوں اور اعمال کا دشمن ہے۔[2]

---

[1] المیزان۔جلد ۱۶ صفحہ ۵۶ [2] کافی۔جلد ۱ صفحہ ۳۷۵

امامت اور رہبری کا مقصد

اسلام کی نظر میں دنیا، مال، عہدہ، اختیار اور حکومت ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اولیاء اللہ کے ہاتھ میں اختیار بھی آجائے تو وہ اپنی سادہ زندگی کو ترک نہیں کرتے اور اتراہٹ، شیخی، غرور اور بداخلاقی کی طرف نہیں جاتے۔ ہم اس سرائے آخرت کو اس کی تمام بے شمار نعمتوں کے ساتھ صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص کرتے ہیں جو زمین پر سرکشی اور فساد کا ارادہ نہیں کریں گے (سورہ قصص۔ آیت ۸۳)۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ میں امام علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا تو دیکھا کہ امام اپنا جوتا گانٹھ رہے تھے۔ امامؑ نے پوچھا اس پھٹے جوتے کی کیا قیمت ہوگی؟

میں نے کہا اس کی کچھ بھی قیمت نہیں ہے۔

امامؑ نے فرمایا: وَ اللّٰهِ لَهِيَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اِمْرَتِكُمْ اِلَّا اَنْ اُقِيْمَ حَقًّا، اَوْ اَدْفَعَ بَاطِلًا۔

خدا کی قسم! میرے نزدیک یہ پھٹا جوتا تم پر حکومت کرنے سے زیادہ قیمتی ہے بجز اس صورت کے کہ میں حق کو قائم کروں اور باطل کو دفع کروں۔

بے شک امامت اور رہبری عیش و آرام کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کو شرک، ظلم، جہالت اور تفرقے سے نجات دلانے کے لیے ہوتی ہے نہ کہ رہنماؤں

۱؎ نہج البلاغہ خطبہ ۳۳

کی عیش کوشی اور مفاد پرستی کے لیے ــ اختیار حاصل کرنے کے لیے معصوم اماموں کی کوشش خدائی احکام کو نافذ کرنے کی خاطر تھی اس لیے اسلام میں امامت فرمایہ نہیں ہے بلکہ ذمہ داری ہے۔ آرام نہیں ہے بلکہ بوجھ ہے اس لیے امام اپنی زندگی میں بالکل معمولی طور سے رہتے تھے اور عام اور سادہ لباس اور غذا کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ ضرورت کے وقت دوسروں کی طرح کچہری میں حاضری دیتے تھے۔ کام کرتے تھے اور کسی قسم کی غیر معمولی مراعات نہیں رکھتے تھے۔

امام علی علیہ السلام نے ایک خط میں ابن عباس کو یوں لکھا تھا: اَمّا بَعدُ فَلا یَکُنْ حَظّكَ فِی وَلَایَتِكَ مَالاً .... وَاِحْیَاءَ حَقٍّ[1]

تمھیں جو حکومت حاصل ہے اس میں دولت جمع نہ کرو۔ تمھیں یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنے اختیار سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں پر غصہ کرو بلکہ تمھارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ باطل کو مٹاؤ اور حق کو زندہ کرو۔

امام علی علیہ السلام نے حاکم کی حیثیت سے ایک شہر میں داخل ہونے کے بعد فرمایا تھا: دَخَلْتُ بِلَادَکُمْ بِاَشْمَالِی هٰذِهٖ وَ رَحْلَتِی وَرَاحِلَتِی فَاِنْ اَنَا خَرَجْتُ بِغَیْرِ مَا دَخَلْتُ فَاِنِّی مِنَ الْخَائِنِیْنَ[2]۔

میں تمھارے شہر میں اپنے اس پرانے لباس، اس اثاثے اور اس گھوڑے سمیت داخل ہوا ہوں۔ اب اگر تم کچھ دنوں بعد یہ دیکھو کہ میں موجودہ وضع سے مختلف وضع میں شہر سے باہر گیا ہوں تو سمجھ لینا کہ میں نے مال میں خیانت کی ہے۔ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: لَوْلَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ وَقِیَامُ

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۳۴ صفحہ ۳۲۸۔ [2] بحار الانوار۔ جلد ۹ چھاپ قدیم۔ صفحہ ۵۰۰

الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ وَمَا أَخَذَ اللّٰهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَلَّا يُقَارُّوا عَلَى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَلَا سَغَبِ مَظْلُومٍ لَأَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِبِهَا..... وَلَأَلْفَيْتُمْ دُنْيَاكُمْ هٰذِهِ أَزْهَدَ عِنْدِي مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ۔[1]

اگر لوگ میرے گرد جمع نہ ہوتے اور انھیں میری رہبری کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور اگر قوت جمع ہونے سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوتی اور لوگوں کے اس ہجوم اور حمایت نے میری ذمہ داری نہ بڑھادی ہوتی اور اگر خدا نے علمار سے یہ عہد نہ لیا ہوتا کہ وہ ظالم کی شکم سیری اور مظلوم کی بھوک پر چین سے نہیں بیٹھیں گے، بیشک اگر یہ اسباب فراہم نہ ہوتے تو میں حکومت کی رسّی اور نکیل اسکے کوہان پر ڈال دیتا۔ جان لو کہ تمھاری یہ دنیا اپنی دولت، منصب اور حکومت کے باوجود میرے نزدیک بھیڑ کی اس رینٹ سے بھی حقیر ہے جو اس کی چھینک کے وقت نکل پڑتی ہے۔

امام علی علیہ السلام خطبہ نمبر ۲۱۴ میں فرماتے ہیں کہ خدا نے میری

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ سوم

اور تمہاری دونوں میں سے ہر ایک کی گردن پر حق باہمی رکھا ہے ایسا نہیں ہے کہ صرف حاکم ہی امر اور نہی کا حق رکھے اور اپنے منصب اور حیثیت سے حکمرانی کا مزہ اڑائے۔

اب ہم نے سمجھ لیا ہے کہ حکومت کا مطمح نظر عیش اور آرام طلبی نہیں ہے ورنہ امام علی علیہ السلام اپنے اختیار کے زمانے میں یومیہ زندگی کے لیے اتنے مجبور نہ ہوتے کہ اپنی تلوار بیچ ڈالیں اور کہیں وَاللهِ لَوْ كَانَ عِنْدِىْ ثَمَنُ اِزَارٍ مَابِعْتُهٗ[1] خدا کی قسم اگر میرے پاس چھوٹے لباس کے لیے بھی رقم ہوتی تو میں اپنی تلوار کبھی نہ بیچتا یا مثلاً حضرت امام رضا علیہ السلام اس زمانے میں جب انھیں ولی عہدی ملی تھی ٹاٹ پر سوتے تھے اور غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام اتنی عظمت کے باوجود غریبوں کے ساتھ رہتے اور ان سے محبت کرتے تھے۔[2]

امام کی علامات اور صفات

چونکہ امت کی امامت، رہبری اور ہدایت کا معاملہ زندگی کے اہم ترین معاملوں میں سے ہے اور یہ بات ہر وقت ممکن ہے کہ امت جھوٹے پرچاروں کی وجہ سے کسی نہ کسی کے دھوکے میں آجائے، اس لیے قرآن نے اور رسول اکرمؐ نے بھی ایسی علامات اور شناختیں بتائی ہیں جو انسان کے سامنے راستے اور گڑھے کو واضح کرسکتی ہیں۔ ہم یہاں ان علامتوں اور شناختوں کا خلاصہ بیان کیے جاتے

---

[1] بحارالانوار جلد ۴۰۔ صفحہ ۳۲۴ [2] الحیٰوۃ

طریقے سے پیش کیے دیتے ہیں۔

۱۔ ایک فقیر مسجد نبویؐ میں داخل ہوا اور اس نے لوگوں سے سوال کیا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ فقیر نے کہا: اے خدا! تو گواہ رہنا ان لوگوں نے مجھے محروم رکھا (مایوس کیا)۔ امام علی علیہ السلام اس وقت رکوع کی حالت میں تھے، آپ نے فقیر کو اشارہ کیا۔ جیسے ہی وہ سامنے آیا آپ نے اسے اپنی انگوٹھی بخش دی۔ اسی موقع پر سورۂ مائدہ کی آیت ۵۵ نازل ہوئی کہ تمہارا ولی صرف خدا، اسکا رسولؐ اور وہ شخص ہے جس نے رکوع کی حالت میں زکات دی۔ یہ ایک ایسی علامت ہے کہ جس سے لوگوں نے یقینی طور پر سمجھ لیا کہ وہ امام علیؑ ہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے پہلے بھی امام علی علیہ السلام کا مرتبہ سب پر واضح تھا لیکن انگوٹھی کا عطا کرنا صرف ولایت و امامت کے اس مرتبے کی نشانی، علامت اور شناخت کے لیے تھا کہ آپ خدا اور رسولؐ کے برابر امت کی سرپرستی اور امامت کا حق رکھتے ہیں ورنہ محض رکوع میں انگوٹھی دیدینا اپنی جگہ امامت کے مرتبے کو ثابت نہیں کرسکتا البتہ لوگوں کے سامنے فضیلت کی علامت اور شناخت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

مثال

کبھی آپ ایک شخص کو اپنے گھر بھیجتے ہیں کہ میری بیگم سے فلاں گودام کی چابی لے آؤ اور بیگم کے اطمینان کی خاطر اسے ایک نشانی بھی بتا دیتے ہیں

کہ تم ان سے کہنا کہ رات کو ہم لوگوں نے فلاں شخص کو امداد کے طور پر کچھ روپے دینا طے کیا ہے۔

غور کیجیے کہ اس امدادی رقم کا گودام کے مال سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ پیغام بیگم کے لیے اعتماد کی علامت بن سکتا ہے تاکہ وہ اس شخص کو گودام کی چابی دیدے۔

انگوٹھی دینے کا واقعہ بھی اسی قسم کی بات ہے اور یہ عمل امام کی پہچان کے لیے صرف ایک علامت ہے ورنہ کسی سائل کو انگوٹھی عطا کرنا کسی شخص کو اس خدائی منصب تک نہیں پہنچا سکتا۔

امامت کا منصب پہلے ہی سے خدائی فیصلوں کے مطابق امام علیؑ کے لیے ثابت ہے لیکن تمام لوگوں کو ان کی پہچان کرانے کے لیے اس عمل کو بطور علامت بیان کیا گیا۔

۴۔ پیغمبرؐ تیئیس ۲۳ سال تک کار رسالت میں مشغول رہے۔ ہر سال کے ۳۶۵ دن کے حساب سے آپ کی تبلیغ کے دنوں کی مجموعی تعداد ۸۳۹۵ دن ہوتی ہے۔

ایک آیت میں یہ بات نازل ہوئی کہ:

۱۔ آج تم مسلمانوں کے دین سے تمام کافر مایوس ہو گئے۔ اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ۔

۲۔ آج تمھارا دین کامل ہو گیا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔

۳۔ آج میں نے اپنی تمام نعمتیں تم پر پوری کر دیں۔ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔

۴۔ آج کے دن میں نے تمہارے لیے مکتب اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے قبول کیا۔ وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا[1]۔

آپ ان کئی ہزار دنوں پر نظر ڈالیں جن میں آنحضرتؐ پیغمبری کا فریضہ ادا کرتے رہے اور ان میں ایسا ایک دن ڈھونڈ نکالیں جس پر مندرجہ بالا خصوصیات کا اطلاق ہوتا ہو۔

یہ بات مانی ہوئی ہے کہ وہ تمام دن ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ایک دن خاص اور اہم ہوگا چنانچہ ہم دور رسالت کے اہم دنوں کا ذکر کرتے ہیں تاکہ یہ دیکھیں کہ مندرجہ بالا آیت کس دن پر منطبق ہوتی ہے۔

۱۔ کیا یہ بعثت کا پہلا دن ہے؟ نہیں اس لیے کہ پہلے دن نہ دین کامل ہوا تھا نہ کافر مایوس ہوتے تھے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

۲۔ کیا یہ اسلام کی علانیہ دعوت کا دن ہے جب پیغمبر کو تین سال کی خفیہ تبلیغ کے بعد خدا کا یہ حکم آیا کہ اپنی دعوت کو ظاہر کر دو؟ نہیں۔ یہ وہ دن نہیں ہے اس لیے کہ وہ دن بھی کام کے آغاز کا دن تھا اور ابھی کام کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

۳۔ کیا یہ ہجرت کا دن تھا یا حضرت فاطمہ زہراؑ کی ولادت کا دن تھا یا بدر کی لڑائی میں کامیابی کا دن تھا؟ نہیں کیونکہ ہجرت بدر کی فتح اور فاطمہ زہراؑ کی ولادت کے بعد پیغمبرؐ کی زندگی میں برسوں تک آیتیں نازل ہوتی رہیں اس لیے ان دنوں کو دین کی تکمیل کا دن نہیں سمجھا جا سکتا۔

---

[1] سورۂ مائدہ۔ آیت ۳۔

۴۔ کیا وہ دن جس کی خدا نے چار خصوصیات بیان فرمائی ہیں ۸ھ میں فتح مکہ کا دن سمجھا جائے یا ۹ھ میں مکے کے مشرک زائروں کے متعلق فیصلے کا دن مانا جائے۔ نہیں کیونکہ فتح مکہ میں صرف مکے کے کفار مایوس ہوئے تھے۔ تمام کافر مایوس نہیں ہوتے تھے اور پھر یہ کہ ۸ھ سے ۱۰ھ میں پیغمبرؐ کی رحلت تک اس دو سال میں دسیوں آیتیں اور احکامات نازل ہوئے اس لیے ۸ھ کے کسی دن کو دین کی تکمیل اور نعمتوں کے پورا ہونے کا دن نہیں سمجھا جا سکتا۔

۵۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ دن روز عرفہ ہو جبکہ پیغمبرؐ لوگوں کے ساتھ حج کے مناسک انجام دینے میں مشغول تھے؟ نہیں اس لیے کہ آنحضرتؐ کا مراسم حج بجالانا دین کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے، پورا دین نہیں ہے اور قرآن فرماتا ہے کہ آج تمہارا دین مکمل ہو گیا۔

مختصر یہ کہ اگر ہم تلاش کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ کون سا دن ہے تو تمام دنوں کی چھان بین کے بعد غدیر خم کے دن تک پہنچیں گے جو بقر عید کے آٹھ دن بعد پڑتا ہے۔ وہ پیغمبرؐ کی عمر کا آخری سال تھا جب آپ نے لوگوں کے ساتھ حج کے مراسم ادا کیے اور واپس مدینے آ رہے تھے کہ ایسے مقام پر پہنچے جہاں لوگ ایک دوسرے سے الگ ہوتے تھے اور ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے وطن (یمن، مدینہ، عراق اور حبش) کی طرف چلے جاتے تھے۔ اس مقام پر امام علی علیہ السلام کے بطور امام اور جانشین پیغمبرؐ تقرر کا حکم آیا۔ جب آنحضرتؐ نے خصوصی اہتمام کے ساتھ امام علیؑ کو خدا کی طرف سے امت کی رہبری کے لیے امام مقرر فرما دیا تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

۱۔ آج کفار مایوس ہو گئے کیونکہ آپ پر لگائے گئے ان کے الزامات (شاعر، جادوگر، دیوانہ) باطل ہو کر رہ گئے، بدر، خیبر اور خندق وغیرہ کی لڑائیاں اسلام کے حق میں ختم ہو گئیں اور تمام سازشیں بھی بے اثر ہو گئیں۔ کفار کی واحد امید پیغمبرؐ خدا کی موت سے وابستہ تھی کیونکہ انھوں نے اپنی جگہ پر یہ حساب لگا لیا تھا کہ اب پیغمبرؐ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کے کوئی بیٹا بھی نہیں ہے اور انھوں نے اپنا کوئی جانشین بھی مقرر نہیں کیا ہے۔ ان کی موت کے ساتھ ہی اسلام کا زور ختم ہو جائے گا لیکن جب انھوں نے غدیر کے دن یہ دیکھا کہ علیؑ نامی ایک شخص جو ہر بیٹے سے زیادہ لائق ہے پیغمبرؐ کا جانشین متعین ہو گیا ہے تو کفار کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔ بیشک کفار اس دن مایوس ہو گئے۔

۲۔ اسی دن دین بھی کامل ہو گیا جب قانون کے ساتھ حاکم کا تعین ہو گیا۔ قانون کے ساتھ اس کا جاری کرنے والا آ گیا۔ نقشے کے ساتھ نمونے کا تعارف بھی کرا دیا گیا اور اسلام کی اس تحریک کو آگے بڑھانے والا مقرر ہو گیا (اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ) رہبر کے بغیر دین بے طبیب کی دوا کی طرح کامل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ آج کے دن تم مسلمانوں پر اللہ کی نعمتیں پوری ہو گئیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ چاہے تمام نعمتیں موجود ہوں لیکن اگر رہبری کی ایک نعمت نہ ہو تو وہ سب ادھوری ہیں کیونکہ وہ رہبر ہی ہوتا ہے جو اپنی ہدایت سے لوگوں کو ترغیب دیتا ہے تاکہ خدا کی نعمتیں اپنی اصلی راہ پر باقی رہیں۔

لہ اب ایک ہی صورت تھی جو ان کی امید بندھ جائے اور وہ یہ کہ مسلمان پیروی رسولؐ میں کوتاہی کر جائیں۔

آج جب تمھیں ایک قانون نافذ کرنے والا ایک لائق حاکم بھی مل گیا ہے اور اسلام ہر پہلو سے کامل ہو گیا ہے اور میں نے اس مکتب اسلام کو تمھارے لیے چن لیا ہے اور میں تمھارے لیے اس آئینِ حیات پر راضی ہوں۔ اگرچہ بات کو طول ہو گیا اور یہ طول مفید بھی رہا اس لیے کہ ہماری گفتگو امام کے تعارف اور اس کی علامتوں کے متعلق ہے۔ ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن نے کس طرح اپنے لطیف انداز میں اس دن کی خصوصیات کے ساتھ جو زمانہ رسالت کے صرف ایک دن پر منطبق ہوتی ہیں۔ اس بات کو جسے لوگ رات دن پڑھتے رہتے ہیں بیان کیا ہے[1] چونکہ ہم اختصار سے لکھ رہے ہیں اس لیے اس بات کو یہاں تمام کرتے ہیں اور رسول اکرمؐ کی کوششوں کا پتا لگاتے ہیں کہ آپ کس طرح رہبری اور امامت کے منصب کے تعارف کی کوشش فرما رہے تھے۔

---

[1] سوال: اگر یہ آیت روزِ غدیر کی بڑائی اور امام کے تعارف سے متعلق ہے تو اس سے پہلے اور بعد کے جملے غذا کے مسئلے سے کیوں متعلق ہیں؟

جواب: قرآن محفوظ ہونا چاہیے اور خدا نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ اسکی حفاظت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک غیبی اور الٰہی قدرت کے طریقے سے اور دوسری گم کر دینے کے طریقے سے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سونے کو حفاظت کے لیے سوتی تھیلیوں کی تہوں میں چھپا دیتے ہیں تاکہ بدخواہوں کے لیے اس کا راستہ گم کر دیا جائے۔ غدیر کا مسئلہ بھی مردہ گوشت اور سور کی حرمت کے مسئلے کے بیچ و خم میں بیان ہوا ہے تاکہ اس طرح محفوظ ہے (یہ ایک باریک بات ہے)۔

پیغمبرؐ کی کوشش

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بعثت کے آغاز سے ہی اپنے جانشین کا تعارف کرا دیا تھا۔ آپ نے اپنی تبلیغ کے پہلے دن جبکہ آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ[1] نازل ہوئی اور خدا نے حکم دیا کہ آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں تو آپ نے ضیافت کا اہتمام کیا، رشتہ داروں کو بلایا اور ان سے فرمایا مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں ہے جو اپنی قوم کے لیے اس سے بہتر چیز لایا ہو جو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں اس کی طرف بلاؤں۔ تم میں سے ایسا کون ہے جو اس معاملے میں میری مدد کرے اور تمہارے درمیان میرا بھائی وصی اور خلیفہ ہو۔[2]

پیغمبرؐ بار بار علیؑ کی بات کرتے تھے۔ جنگ تبوک کے موقع پر ان کو مدینے میں اپنا جانشین بنایا اور فرمایا کرتے تھے کہ (اے علیؑ) تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ علیہما السلام سے تھی۔[3]

اپنے بعد کے لیے لوگوں کو حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ فاطمہؑ کی طرفداری اس شخص کی حق پرستی کی علامت ہے جس کی فاطمہؑ حمایت کرتی ہیں۔

کبھی ابوذرؓ کو معیار بناتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان کی زبان سچی اور ان کا

---

[1] سورۂ شعراء۔ آیت ۲۱۴ [2] تاریخ ابی الفداء جلد ا صفحہ ۱۱۶ [3] صحیح بخاری اور تفسیر نمونہ کی جلد ۶ کے صفحہ ۳۴۳ پر اس موضوع پر تفصیل اور خوبی سے گفتگو کی گئی ہے۔

قول حق ہے یعنی اے لوگو! رہبری اور امامت کے مسئلے میں یہ دیکھو کہ ابوذرؓ کس کی طرفداری کرتے ہیں۔ کبھی عمار یاسرؓ سے فرماتے تھے: اے عمارؓ! تمھارے مارنے اور قتل کرنے والے باغی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس بیان سے آپؐ نے معاویہ کی فوج پر سخت چوٹ لگائی کیونکہ جب جنگ صفین میں عمار بن یاسرؓ معاویہ کی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے تو یکایک لوگوں کو پیغمبرؐ کی بات یاد آ گئی جو انھوں نے عمارؓ کے بارے میں کہی تھی کہ ان کے قاتل باغی اور ظالم ہیں اور دل میں سوچنے لگے کہ معاویہ کا دعویٰ باطل ہے، اسی لیے وہ فوج سے الگ ہو گئے چنانچہ معاویہ، عمرو بن عاص کے مشورے پر نہایت چالاکی سے عمارؓ کے متعلق پیغمبرؐ کی اس بات کی تاویل کرنے اور لشکر کی پراگندگی کا سدباب کرنے لگا۔

کبھی پیغمبرؐ دلچسپ تشبیہوں سے لوگوں کو معصوم کی رہبری کی طرف متوجہ فرماتے تھے جیسے اہل بیتؑ کی کشتی نوحؑ سے تشبیہ۔ آپ نے فرمایا: (مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِي كَمَثَلِ سَفِينَةِ نُوحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجَىٰ)[2] میرے اہلبیت حضرت نوحؑ کی کشتی کے مانند ہیں کہ جو مومن اس پر سوار ہوئے انھوں نے نجات پائی اور جو کفار ایمان نہیں لائے اور سوار نہیں ہوئے وہ ڈوب گئے۔ کبھی آپ فضیلتیں بیان کر کے امام معصوم کی علمی شخصیت اور مرجعیت کی طرف لوگوں کی توجہ دلاتے تھے جیسے (اَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا)[3] میں علم کا شہر ہوں اور علی ابن ابی طالبؑ اس شہر کا دروازہ ہیں۔

یہاں تک کہ وقت آخر بھی اپنی کوشش میں آپ نے کوئی کمی نہیں کی اور

---

[1] الغدیر جلد ۲ صفحہ ۳۰۱ [2] تفسیر برہان جلد ۱ صفحہ ۱۹۱

فرمایا کہ قلم اور کاغذ لے آؤ تا کہ میں تمہارے لیے کچھ لکھ دوں لیکن افسوس کہ آپ کو ایسا جواب دیا گیا جو نہ ادب کے تقاضے پورے کرتا ہے نہ شریعت کے اور نہ قرآن کے کیونکہ وہی لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو منصب خلافت کا امیدوار بنا لیا تھا۔ پیغمبرؐ کو تحریر سے باز رکھنے کے لیے شور مچانے لگے کہ (اِنَّ الرَّجُلَ لَیَھجُر) پیغمبرؐ شدت مرض میں نادرست اور بے ربط باتیں کر رہے ہیں۔ کاش کہنے والا یہ جانتا کہ خدا اپنے پیغمبرؐ کے بارے میں فرماتا ہے (وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی) وہ پیغمبرؐ اپنی خواہش کے زیر اثر کوئی بات نہیں کہتا اور اس کی گفتگو وحی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ خیر۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ پیغمبرؐ نے امت کی رہبری اور امامت کا انتظام کرنے کے لیے بہت کوششیں کیں۔ پہلے دن بھی آپ نے دعوت دی کہ جو کوئی کار رسالت میں میری مدد کرے گا وہ میرا خلیفہ اور امام ہوگا اور عمر کے آخری دن بھی فرمایا کہ قلم اور کاغذ لے آؤ اور غدیر خم کے دن بھی حضرت فاطمہ زہراؑ، ابوذرؓ اور عمار یاسرؓ جیسی شخصیتوں کے متعلق نشانیوں اور علامتوں اور طرفداریوں کے طریقے سے بھی کہ جس کسی کو ان لوگوں نے مان لیا وہی امام ہوگا۔ غرض کسی طرح کوئی کمی نہیں رکھی اور اپنی طرف سے بے حد کوشش کی لیکن رسولؐ خدا کا حکم مانا نہیں گیا۔ خدا ان لوگوں کو جنھوں نے پہلے دن سے امت کی رہبری کے بارے میں ظلم کیا اس کی سزا دے۔

سوال

اس تمام سفارش، تعیین، حمایت، لیاقتوں اور فضیلتوں کے باوجود

جو امام علی علیہ السلام میں تھیں کیونکر لوگ انھیں مدتوں تک چھوڑے رہے؟

جواب

خدا کے حکم کو ٹھکرانے کی بات کوئی نئی نہیں ہے۔ قرآن کی اتنی آیتوں نے ہمیں پرہیزگاری اور امامت کی دعوت دی ہے پھر پرہیزگاری کم کیوں ہے اور کیوں نہیں شیطان نے آدم کو سجدہ کرلیا؟ کیا حضرت موسیٰؑ کی امت ان کے ہی زمانے میں جب اس نے حضرت موسیٰؑ کو کچھ دنوں کے لیے نہیں دیکھا منحرف نہیں ہوگئی؟ پس بھول، سہو اور بے توجہی انسان کا خاصہ ہے۔ ہاں صرف وہ لوگ جو اپنی تنظیم و تعمیر کرکے خود کو خدا کی خاص مہربانی کا مستحق قرار دیتے ہیں اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ دوسری جانب وہ پرانی دشمنیاں جو بعض لوگ امام علی علیہ السلام کے ساتھ رکھتے تھے اس بات کا سبب بنیں کہ وہ آپ کو اپنا امام نہ مانیں۔ وہ لوگ جو بدر، احد، خیبر اور حنین کی لڑائیوں میں قتل ہوئے کسی نہ کسی خاندان اور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے اعزا اپنے باپ بیٹے اور چچا کے قاتل کو امام ماننے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ لوگوں کو ان کی امامت قبول نہ کرنے کا یا ایک بار قبول کرکے برگشتہ ہوجانے کا دوسرا سبب امام کے انصاف اور صحت عمل کا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ بیعت توڑنے والوں اور ان لوگوں کے بارے میں واضح طور پر نظر آتا ہے جو قتل عثمان کے بعد امامؑ کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے لیکن جنھوں نے بعد میں بیعت توڑ کر جنگ جمل کھڑی کردی۔ یہ لوگ امام سے غیر معمولی مالی اور معاشرتی حقوق اور اضافی فوائد کی امید رکھتے تھے لیکن انھوں نے یہ دیکھا کہ امام کسی سے کوئی رعایت نہیں

برتتے اس کے علاوہ کچھ مشہور اور خودغرض لوگ امام کے سامنے یہ پیشکش رکھتے تھے کہ ملکی کاموں میں ہم سے صلاح مشورہ کیا جائے۔ ان کے جواب میں حضرت فرمادیتے تھے کہ جس کام کے بارے میں مجھے خدا اور رسولؐ کے حکم اور ان کی رضامندی کا علم نہیں ہوگا اس کے بارے میں سب سے مشورہ کرلیا کرونگا اور تم بھی لازماً ان سب لوگوں میں شامل ہوگے۔ وہ لوگ غیر معمولی فائدے کی امید رکھتے تھے لیکن امام جو غریبوں کے مال کی حفاظت میں بہت سخت تھے اور محاورے کے مطابق دودھ میں سے مکھی نکال لیتے تھے انکے لیے آمادہ نہیں تھے کہ ان کے غیر منصفانہ مطالبے پر کان دھرا جائے۔

ہاں لوگوں کے امام علیؑ کو چھوڑنے کی ایک وجہ آپ کا انصاف اور باریک بینی تھی۔ بے شک امام جو پچھلے لوٹے ہوئے مال بھی واپس لے لیتا ہے وہ فطری طور پر اپنے لیے لوگوں کی ناخوشی بھی مول لے لیتا ہے اور لوگ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بہرحال لوگوں نے پیغمبرؐ کی تجویز پر عمل نہیں کیا۔ خدائی تقرر کو نظر انداز کردیا اور رہبری کا سلسلہ تبدیل کردیا۔ یہ لوگ خدا کے دربار انصاف میں جواب دہی کریں گے اس لیے کہ یہی ان قرآنی آیات کے مفہوم میں شامل ہوں گے جیسا کہ خدا فرماتا ہے: ان لوگوں کے لیے جو رسولؐ کو دکھ دیتے ہیں' دردناک عذاب ہے (سورۂ توبہ۔ آیت ۶۱)۔ اور آنحضرتؐ کی وصیت کو نظر انداز کردینے سے بڑھ کر اور کونسا دکھ ہوسکتا ہے۔

اظہار حق اور اس کی کوشش

قرآن اور رسول اکرمؐ کے تعارف کے علاوہ خود امام علیؑ نے بھی کتنے

ہی موقعوں پر اپنی سچائی، لیاقت اور فضائل کا اعلان فرمایا ہے مثلاً نہج البلاغہ میں امام علیؑ اس شخص کے جواب میں جو آپ سے پوچھتا ہے کہ آپ حکومت کے کتنے حریص ہیں، آپ فرماتے ہیں (اِنَّمَا طَلَبْتُ حَقًّا لِّیْ) میں صرف اس حق کا مطالبہ کرتا ہوں جو میرے لیے ثابت ہے۔

دوسرے مقام پر امامؑ فرماتے ہیں (اَرٰی تُرَاثِیْ نَهْبًا) میں اپنے حق وراثت کو لٹتا ہوا دیکھتا ہوں۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں (لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّیْ اَحَقُّ النَّاسِ بِهَا مِنْ غَیْرِیْ) تم لوگ جانتے ہو کہ میں خلافت میں دوسروں سے زیادہ لائق انسان ہوں۔

ایک اور جگہ امامؑ فرماتے ہیں (اِنَّ مَحَلِّیْ مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَا) حکومت اور خلافت میں میری جگہ وہی ہے جو چکی کے پاٹ میں کیلی کی ہوتی ہے اور یوں امیرالمومنین علی علیہ السلام خدائی رہبر اور امام کے مسئلے کا لوگوں میں اعلان فرماتے تھے۔

امام کی کچھ صفات

میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں کیا لکھوں اور کہاں سے شروع کروں۔ میں اوصاف امام کے موضوع پر روایات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ ایک طرف تو یہ بات ہے اور دوسری جانب میرے بہت سے محترم قارئین بھی ان اوصاف کو پڑھنے اور سمجھنے کی کچھ زیادہ تاب نہیں رکھتے کہ میں قدرے تفصیل سے بیان کروں۔ تاہم یہ تو سب چاہتے ہیں کہ امام کی کچھ صفات سے واقف ہو جائیں

اور ہم بھی اسی مقدار پر بس کرتے ہیں۔

امام کو معصوم ہونا چاہیے

عصمت کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ گناہ نہ کرے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ گناہ کا خیال بھی دل میں نہ لاتے۔ ہم بہت سے گناہوں سے بچے ہوتے ہیں۔ اور ایک طرح سے حالت عصمت میں ہیں یعنی اب تک ہم نے وہ گناہ نہیں کیے ہیں بلکہ ان کا خیال بھی دل میں نہیں لاتے مثلاً گلی کوچوں میں ننگے پھرنے کا گناہ، خودکشی کا گناہ، کسی کو قتل کرنے کا گناہ وغیرہ۔ اسی طرح ہم دل میں بہت سے گناہوں کا علم تو رکھتے ہیں لیکن ہم انہیں کرنے کے متعلق سوچتے بھی نہیں۔ امام بھی اپنے بے انتہا علم اور یقین کے باعث جو وہ رکھتے ہیں تمام گناہوں سے واقف ہیں لیکن چند ایک نہیں بلکہ تمام تر گناہوں کے متعلق ان کا رویہ یہی ہے کہ وہ ان میں سے کسی کے قریب تک نہیں جاتے۔

کشادہ دلی

امام کو کشادہ دل ہونا چاہیے اٰلَةُ الرِّيَاسَةِ سَعَةُ الصَّدْرِ فوی روح اور کشادہ دل ریاست کا وسیلہ ہے۔ چڑچڑا پن، جلد بازی اور تنگ ظرفی معاشرے کے انتظام، ترقی اور رہنمائی کے لیے مناسب نہیں ہے۔

جس وقت خدا نے حضرت موسیٰ کو لوگوں کی ہدایت کے لیے منتخب کیا تو انھوں نے خدا سے کچھ چیزیں مانگی تھیں جن میں سے پہلی چیز بلند حوصلگی، ضبط نفس اور عالی ظرفی تھی اور کہا تھا: اے خدا! مجھے کشادہ سینہ

اور قوی روح عطا فرما تا کہ میں تمام حوادث کو برداشت کر سکوں (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۲۵)۔

یہ ہمارے پیغمبرؐ کی بات ہے کہ فتح مکہ کے دن جب مسلمانوں نے مشرکوں کی دی ہوئی ایذاؤں کا بدلہ لینا چاہا تو آپؐ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا: آج رحمت کا دن ہے انتقام کا نہیں اور یہ امام حسنؑ کی بات ہے کہ آپ نے ایک شامی شخص کی نازیبا اور گستاخانہ باتیں سننے کے بعد اس سے فرمایا: تو کیوں ناخوش ہے؟ اگر تو رقم چاہتا ہے تو میں اس سے تجھے بے فکر کیے دیتا ہوں اور اگر تیرے پاس گھر نہیں ہے تو میں تجھے گھر دیے دیتا ہوں۔ آپ نے اس پر اس قدر مہربانی کی کہ آخر میں وہ شرمندہ ہو گیا اور بولا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس شخص کو رہبر اور امام بنائے۔

عدل و انصاف

جہاں سب لوگ انصاف کے طالب ہوں وہاں امام کو انصاف کا کھلا ہوا نمونہ ہونا چاہیے۔ ہم پھر امام علیؑ کے حالات زندگی کی طرف چلتے ہیں اور ان کا انصاف دیکھتے ہیں۔ ہم نے عدل اجتماعی کے باب میں امام علیؑ کے انصاف سے متعلق دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ بنا بریں اس مقام پر ہم آپ کے قول و فعل کی دو ایک مثالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔

۱۔ امام علیؑ نے اپنے ایک عامل کے نام خط میں اسے خبردار کیا: اگر میں نے سنا کہ تم نے بیت المال میں بے ایمانی کی ہے تو خدا کی قسم میں تمہارے

ساتھ سختی سے پیش آؤں گا (نہج البلاغہ۔مکتوب ۲۰)۔

۲۔ تدبیرِ مملکت کے متعلق اپنے مشہور عہد نامے میں مالک اشتر کو یوں لکھا: ملک کے دور دراز مقامات کے لیے بھی اتنا ہی حصہ ہونا چاہیے جتنا قریب ترین مقامات کے لیے ہو۔

۳۔ اپنے قاتل ابن ملجم کے بارے میں فرمایا: میرے قاتل کے سوا اور کسی کو قتل نہ کرنا بلکہ یہاں تک فرمایا کہ جس طرح اس نے مجھ پر ایک وار کیا ہے تم بھی اس پر ایک ہی وار کرنا اور دھیان رہے کہ تمہارا قدم انصاف سے باہر نہ نکلے (نہج البلاغہ مکتوب ۴۷)۔

ایک مجرم کو سزا دینے کے اس واقعہ میں جو قنبر کے ہاتھوں دلوائی گئی تھی جب اس نے تین کوڑے زیادہ مار دیے تو امام علیؑ نے تین کوڑے زیادہ مارنے پر قنبر کو بھی تین کوڑے لگائے اور تمام تعلقات مثلاً اس کی عقیدت، محبت، خدمت اور تمام لحاظ داریوں کا جن میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ آپ نے کوئی لحاظ نہیں کیا (فقصار الجمل۔جلد ۲۔صفحہ ۱۲)۔

امام علیؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر ہفت اقلیم مجھے اس لیے دے دی جائیں کہ میں چیونٹی پر ظلم کر کے اس کے منہ سے جو کا چھلکا نکال لوں تو میں یہ گناہ ہرگز نہیں کروں گا۔

ایک اور واقعہ کے مطابق امام نے جب سنا، ایک غیر مسلم عورت کا زیور چھین لیا گیا اور اس طرح اس پر ظلم کیا گیا ہے اور اسے عام تحفظ بھی نہیں دیا گیا تو آپ اس قدر ناخوش ہوئے کہ فرمانے لگے کہ اگر اس افسوسناک واقعے سے مسلمان کی جان بھی نکل جائے تو بجا ہے (نہج البلاغہ۔فیض الاسلام صفحہ ۹۵)۔

داستان

لوگوں نے ایک واعظ سے کہا کہ امام علیؑ کے بارے میں کچھ بیان کیجیے۔ وہ منبر پہ گیا اور کہنے لگا: علیؑ صاحبِ علم تھے۔ اس کے بعد اس نے آہ بھری پھر بولا: علیؑ پرہیزگار تھے۔ پھر آہ کھینچی۔ اس نے پھر کہا: وہ بہادر تھے۔ وہ عبادت کرتے تھے۔ پھر آہ کھینچی اور اس کے بعد منبر سے نیچے اتر آیا۔ لوگوں نے کہا یہ کیا تقریر تھی؟ کہنے لگا حضرت علیؑ کا درجہ اونچا ہے اور میرے پاس علم اور وقت بھی کم ہے۔ میں نے یہ خیال کیا کہ اس سے بہتر اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ایک آہ بھروں، اشارہ کروں اور گزر جاؤں چنانچہ ہم بھی اسی طرح اشاروں میں گفتگو کر رہے ہیں۔

امام کو اپنی خواہشات قابو میں رکھنا چاہئیں

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں، هَيْهَاتَ اَنْ يَّغْلِبَنِيْ هَوٰى کتنے افسوس کی بات ہوگی جو میری خواہشات مجھ پر غالب آجائیں اور مجھے سچائی اور انصاف کے راستے سے دور کر دیں۔ امام صادقؑ، امام علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ امامت کی بہت سی شرائط ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ لَا يَلْهُوْهُ شَيْءٌ مِّنْ اَمْرِ الدُّنْيَا۔[1] مادی اور دنیاوی معاملے اس کو مشغول اور منہمک نہیں کرتے۔

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۶۴

امام کو بہادر ہونا چاہیے

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں (وَمَا اُهَدَّدُ بِالْحَرْبِ) اب تک کسی لڑائی نے مجھے خوفزدہ نہیں کیا اور نہ میری روح پر کوئی اثر چھوڑا ہے۔[1]

امام صادق علیہ السلام، امام علی علیہ السلام سے نقل فرماتے ہیں کہ امام کو سب سے زیادہ بہادر ہونا چاہیے۔[2]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امام کو ڈرپوک نہیں ہونا چاہیے۔[3]

موت اور شہادت کی بات امام کے سامنے بالکل واضح ہونا چاہیے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: خدا کی قسم! موت سے مجھے اتنی رغبت ہے، جتنی بچے کو اپنی ماں کی چھاتی سے بھی نہ ہوگی۔[4]

امام کو برتر اور صاحب کمال ہونا چاہیے

امام علی علیہ السلام اپنے دسویں خط میں جو نہج البلاغہ میں درج ہے معاویہ کو یوں لکھتے ہیں:

اے معاویہ! تجھے سیاست اور خلائق کی حاکمیت سے کیا تعلق ہے؟ نہ تیرا پچھلا کردار اچھا ہے اور نہ تو کوئی بزرگی، بڑائی اور کمال رکھتا ہے۔ ہاں! امام کے سابقہ کردار میں بھی کوئی نقص نہیں ہونا چاہیے۔

۱؎ نہج البلاغہ فیض الاسلام صفحہ ۸۱ ۲؎ بحار الانوار جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۶۵

۳؎ بحار الانوار جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۷۲ ۴؎ نہج البلاغہ فیض الاسلام، خطبہ ۵ صفحہ ۵۷

امام کے کچھ اور صفات

امام کو خدا کی کتاب کے مطابق حکم دینا چاہیے: فَلَعَمْرِیْ مَا الْاِمَامُ اِلَّا الْحَاکِمُ بِالْکِتَابِ۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: مجھے اپنی جان کی قسم ہے کہ لوگوں کا امام وہی ہو سکتا ہے جو خدا کی کتاب کے مطابق حکم دیتا ہے[1]
امام کو سچے دین پر اعتقاد رکھنا چاہیے اور اسے اپنی خواہشات کے مقابلے میں اپنے اوپر قابو رکھنا چاہیے۔ اَلدَّائِنُ بِدِیْنِ الْحَقِّ اَلْحَابِسُ نَفْسَہٗ عَلٰی ذَاتِ اللّٰہِ۔[2]

امام کی مہربانی

امام رضا علیہ السلام امام کی صفات کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:
اَشْفَقُ عَلَیْہِمْ مِنْ اٰبَائِہِمْ وَاُمَّہَاتِہِمْ۔ امام لوگوں پر ان کے والدین سے زیادہ مہربان ہوتا ہے[3] اور پھر فرماتے ہیں کہ امام کو (عَالِمٌ بِالسِّیَاسَۃِ)[4] سیاست سے واقف ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے اچھے اور بلند منصوبوں سے معاشرے کو منظم کر سکے اور ترقی دے سکے۔
امام کو (قَائِمٌ بِالرِّیَاسَۃِ)[5] ہونا چاہیے یعنی وہ اس بڑی خدائی ذمہ داری

---

[1] و [2] الارشاد۔ شیخ مفید [3] بحار الانوار۔ جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۱۷

[4] بحار الانوار جلد ۲۵ صفحہ ۱۲۶ - ۱۷۲

[5] بحار الانوار جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۷۳

سے عہدہ برآ ہوسکے۔

امام کو اتنا قابل ہونا چاہیے کہ وہ خلائق کی ضرورت کے مطابق تمام زبانوں اور لغات میں بات کرسکے یُکَلِّمُ النَّاسَ بِکُلِّ لِسَانٍ وَّلُغَۃٍ۔ ہر زبان اور لغت میں لوگوں سے گفتگو کرسکے[1]

زہد

امام کی ایک صفت دنیا سے بے رغبتی اور اس کا زہد ہے۔

امام علی علیہ السلام اپنے پیوند لگے لباس کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

خدا کی قسم! میں نے اس لباس میں اتنے پیوند لگوائے ہیں کہ اب مجھے اس میں پیوند لگانے والے سے مزید پیوند لگوانے میں شرم آنے لگی ہے[2]

ایک اور مقام پہ فرماتے ہیں (وَاللّٰہِ مَا کَانَتْ لِی فِی الْخِلَافَۃِ رَغْبَۃٌ)[3]

خدا کی قسم مجھے خلافت کی خواہش اور رغبت نہیں ہے۔

زہد، سادگی اور غریبوں کی طرح رہنے کے متعلق ہم امام علیؑ کی زبان سے سنتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی فَرَضَ عَلٰی اَئِمَّۃِ الْعَدْلِ اَنْ یُّقَدِّرُوْا اَنْفُسَھُمْ بِضَعْفَۃِ النَّاسِ[4]

یقیناً خدا نے واجب کر دیا ہے کہ سچے اور عادل امام اپنی زندگی کو سادہ بنائیں اور اپنے نفسوں کو قابو میں رکھیں تاکہ معاشرے کے غریبوں کے ساتھ چل سکیں اور اس طریقے سے ناداروں کی تسکین اور حوصلے کا موجب بن سکیں۔

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۲۵ صفحہ ۱۴۱ [2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۹ [3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۶

[4] نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۰۔

امام کو شک نہیں ہوتا

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں مَاشَکَکْتُ فِی الْحَقِّ مُذْ اُرِیْتُہٗ [1] جس وقت سے مجھ پر حق واضح ہوا ہے پھر اس میں اب تک مجھے شک پیدا نہیں ہوا۔

دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں: (وَ لَاضَلَلْتُ وَلَاضُلَّ بِی) [2] آج تک میں بھٹکا ہوں اور نہ میرے ذریعے سے کوئی بھٹکا ہے۔

امام پر رنج و راحت کا اثر نہیں پڑتا

امام ملامت کو خاطر میں نہیں لاتا (وَاِنِّیْ لَمِنْ قَوْمٍ لَاتَاْخُذُھُمْ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃُ لَائِمٍ) [3] امام علیؑ فرماتے ہیں کہ میں اس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جس پر بُرا بھلا کہنے والوں کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

امام کو آگے چلنا چاہیے

(مَنْ نَصَّبَ نفسہ للناس اماما فعلیہ اَنْ یَبْدَأَ بتعلیم نفسہ قبل تعلیم غیرہ ولکن تادیبہ بسیرتہ قبل تأدیبہ بلسانہ) [4] جو کوئی اپنے آپ کو لوگوں کا امام ٹھہرائے اسے چاہیے کہ دوسرے کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے اپنے نفس کی تعلیم شروع کرے اور زبان سے تربیت دینے سے پہلے اپنے عمل سے تربیت کا طریقہ اپنائے۔

---

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۱۷۵ [2] نہج البلاغہ حکمت ۱۷۶ [3] نہج البلاغہ۔ فیض الاسلام صفحہ ۸۰۸ [4] نہج البلاغہ فیض الاسلام صفحہ ۱۱۰۷۔

امام کو بے تکلف ہونا چاہیے

خداوند عالم حضرت محمد مصطفیٰؐ سے فرماتا ہے:

لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا، نہ میں تکلف کرنے والا ہوں، نہ تمھارے لیے کوئی دشواری پیدا کرنیوالا ہوں اور نہ تم سے نامعقول مطالبے کرنے والا ہوں۔ میں اپنے آپ کو کسی ایسی شے سے آراستہ نہیں کرتا جو حقیقت یا اصلیت میں موجود نہ ہو۔ میرے کام میں کوئی بناوٹ نہیں (وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ) (سورہ صٓ - آیت ۸۶)۔

تکلف کی علامت یہ ہے کہ انسان آمادہ نہیں ہوتا کہ غیر معروف لوگوں کی دعوت قبول کرے یا اپنے غلط کام پر معذرت کرے یا جو بات نہیں جانتا وہ کسی سے پوچھ لے یا جب موقع آئے تو مشورہ کرے۔ جو شخص تکلف کرتا ہے وہ اپنے سے چھوٹے پر ظلم کرتا ہے اور اپنے سے بڑے کا رعب مانتا ہے۔ یہ سب باتیں تکلف، بناوٹ اور غلط طریقوں کی علامتیں ہیں۔ امام سب لوگوں سے زیادہ تواضع کرنے والا اور سب سے زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگ علیؑ کے احترام میں انکی سواری کیساتھ ساتھ دوڑتے تھے تو آپ انہیں منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے اور اس طرح جب لوگ پیغمبرؐ کی سواری کے ساتھ پیدل چل کر جانا چاہتے تھے تو وہ اس کی اجازت نہیں دیتے تھے پیغمبرؐ اور معصوم اماموں کی زندگی کے واقعات میں انکی تواضع اور بے تکلفی کے دلچسپ واقعات نظر پڑتے ہیں لیکن ہماری مختصر نگاری انکے بیان کرنیکی اجازت نہیں دیتی۔

امام رواداری کرتا ہے لیکن

خوشامد نہیں کرتا

ایک خدائی رہبر کو لوگوں کی تربیت کی خاطر ان سے رواداری تو کرنا چاہیے لیکن جرائم سے چشم پوشی اور ان کی چاپلوسی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ رواداری دین یا لوگوں کے دنیادی معاملات کی اصلاح کے لیے حب دنیا اور خود اپنے منصب کی شان کی پروا نہ کرنا ہے لیکن چاپلوسی دین اور مکتب کے قوانین کے ایک حصے کو نظر انداز کر دینا ہے اور یہ اپنی حیثیت کے تحفظ یا کسی دنیاوی مرتبے تک رسائی کے لیے ہے۔

مدارا کے معنی یہ ہیں کہ ہم کم ظرف، ٹیڑھے چلن والے اور جھگڑے لوگوں کو معاف کر دیں اور ان کی غلط حرکات سے درگزر کریں تاکہ وہ مکتب کی جانب کھنچ آئیں لیکن چاپلوسی کا مطلب ہے کوئی مستقل طریقہ نہ رکھنا، اچھے برے تمام گروہوں سے تعلق رکھنا خفیہ منصوبے تیار کرنا اور اپنے مفاد کی حفاظت کرنا۔ رواداری یا مدارا کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے لیکن چاپلوسی اپنی ذاتی کمزوری اور نفع کمانے کے خیال سے ہے اور چاپلوسی حرص سے کی جاتی ہے۔

رواداری اور خوشامد کے فرق پر توجہ دیتے ہوئے ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ امام کو رواداری یعنی کشادہ دلی، معافی، چشم پوشی اور درگزر سے کام لینا چاہیے تاکہ جو لوگ بعض وجوہ سے اپنی عمر رواں میں کمزوری کے نقطے پر پہنچے ہوئے ہیں وہ اسکی پیروی سے مایوس نہ ہو جائیں اور وہ حضرت

یوسف ع کی طرح جنھوں نے اپنے بھائیوں سے کہہ دیا تھا کہ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ[1] آج تمھیں سخت سست نہیں کہا جائے گا۔ لوگوں کو اپنی محبت کے دامن کے نیچے اور اسلام کی ٹھنڈی چھاؤں میں جمع کرلے۔

ہاں امام کو اور رہبر کو رواداری کرنا چاہیے۔ پیغمبر ص نے فرمایا ہے: میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ لوگوں کے ساتھ رواداری کروں بُعِثْتُ بِمُدَارَاۃِ النَّاسِ[2]

ایک اور جملے میں پیغمبر اکرم ص نے فرمایا ہے: خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں لوگوں کیساتھ رواداری کروں جیسے اس نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں واجب کام کرتا رہوں اور روزانہ پانچ نمازیں ادا کروں اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیْ بِمُدَارَاۃِ النَّاسِ کَمَا اَمَرَنِیْ بِاِقَامَۃِ الْفَرَائِضِ[3]۔

ایک مشہور حدیث میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ص لوگوں کی عقل اور سمجھ کے مطابق ان سے گفتگو کرتے ہیں اور بہت سی روایتوں میں علماء سے کہا گیا ہے کہ تم جو کچھ جانتے ہو وہ سب کا سب مت بیان کرو اور سننے والے کی حالت، مزاج اور عقل اور سمجھ کی مقدار کا بھی لحاظ رکھو۔ مختصر یہ ہے کہ رواداری کرنا سب لوگوں کے لیے ضروری اور امام کے لیے لازمی شرط ہے۔

امام تاریخ کے فلسفے سے واقف ہوتا ہے

امام علی ع اپنے بیٹے امام حسن ع سے یوں فرماتے ہیں۔ اے میرے بیٹے!

---

[1] سورۂ یوسف۔ آیت ۹۲ [2] نہج الفصاحت حدیث ۱۰۹۳

[3] نہج الفصاحت حدیث ۶۷۷

اگرچہ میں نے قدما کے ساتھ عمر تو بسر نہیں کی ہے لیکن ان کی تاریخ اور انکی یادگاروں، کوششوں، طریقوں اور کاموں کو دیکھ کر اور ان پر غور کر کے ان کے متعلق اتنی معلومات اور واقفیت حاصل کر لی ہے کہ جیسے میں بھی ان میں سے ایک بن گیا ہوں[1]

منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانا

قرآن اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ کے متعلق یوں فرماتا ہے: کسی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ خدا تو اس کو کتاب، حکمت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بے شک بندگی خدا کے لیے مخصوص ہے اور بس (سورۂ آل عمران - آیت ۷۹)۔

شکایت کی جانچ

امام علیؑ درخواستوں اور شکایتوں کو تحریری طور پر ترتیب دیتے تھے جس کی شکایت کی جاتی اسے عدالت میں بلاتے تھے اور اس سے بازپرس فرماتے اور اس کے مالی حساب کی پڑتال کرواتے تھے۔ آپ اکثر اپنے گورنروں سے فرماتے تھے فَارْفَعْ إِلَيَّ حِسَابَكَ[2] اپنا حساب اور کارکردگی کی یادداشت میرے پاس لاؤ اور اپنے کام کی تفصیل مجھے دکھاؤ۔

صبر اور یقین

امام کی ایک اور صفت اور شرط مشاہدہ، یقین اور ایمان ہے - قرآن

[1] نہج البلاغہ، وصیت ۳۱ [2] نہج البلاغہ، مکتوب ۴۰ - صفحہ ۴۱۲

اس بارے میں کہتا ہے:

ہم نے بنی اسرائیل کے کچھ افراد کو اس وقت لوگوں کی ہدایت کے لیے منتخب کیا جب وہ صابر اور ثابت قدم تھے اور خدا کی نشانیوں پر بھی ایمان اور یقین رکھتے تھے۔ یقین، آسائش اور عصمت کا سرچشمہ اور تمام باطنی کمالات کا ضامن ہے (سورۂ سجدہ۔ آیت ۲۴)۔

آزاد طریقہ

امام کو چاہیے کہ وہ ہر قسم کی غیر الٰہی قید اور تعلق سے آزاد رہے مثلاً قبیلے، نسل اور جماعت کی وابستگی سے دور رہے اور دوسرے تمام عناصر سے جو انسان پر اثر ڈالتے ہیں مبرّا رہے۔

اخلاص اور کسی سے مادی امید نہ رکھنا

امام علیؑ پانچویں خط میں جو نہج البلاغہ میں موجود ہے، آذربائیجان کے عامل کو لکھتے ہیں اِنَّ عَمَلَکَ لَیْسَ لَکَ بِطُعْمَۃٍ وَلٰکِنَّہٗ فِیْ عُنُقِکَ اَمَانَۃٌ[1] حقیقت میں تمہارا منصب اور کارکردگی تمہارے لیے ایک امانت اور ذمہ داری ہے۔ روزی کمانے، زندگی بسر کرنے اور آرام پانے کا وسیلہ نہیں ہے۔ قرآن نبیوں کا ایک خاصہ یوں دہراتا ہے کہ یہ بزرگ ہستیاں کسی سے مادی امید نہیں رکھتی تھیں[2]۔

---

[1] نہج البلاغہ، نامہ ۵ صفحہ ۸۳۹ فیض الاسلام [2] سورۂ شعراء آیات ۱۰۹ تا ۱۸۰۔ حضرت نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ اور داؤدؑ کا قول نقل کرتا ہے جو فرماتے ہیں: ہم بجز خدا کے کسی سے اجر یعنی معاوضہ نہیں چاہتے۔

امام کی کچھ اور صفات

امام خدا کی حجت ہے، وہ بتاتا ہے کہ ہمیں کیسا ہونا چاہیے۔

امام روشنی ہے جو حقیقتوں اور توانائیوں کو اجاگر کرتا اور ظلم، شرک اور جہالت کے کالے پردوں کو ایک طرف ہٹا دیتا ہے۔

امام امانت دار ہے۔ وہ انسانوں اور ان کی صلاحیتوں کو اپنے اندر جذب نہیں کرتا بلکہ خدا کے بندوں کو خدا کی طرف بلاتا ہے۔

امام تمام علوم، کمالات اور پیشتیتی خصوصیات کا مالک ہوتا ہے۔

امام اللہ کا نمائندہ ہے اور وہ مردہ اور بے جان معاشرے کے جسم میں پاک خون ہے یعنی اسے نئی زندگی عطا کرنے والا ہے۔

امام علیؑ فرماتے ہیں: اِنَّ اَحَقَّ النَّاسِ بِھٰذَا الْاَمْرِ اَقْوَاھُمْ عَلَیْہِ وَاَعْلَمُھُمْ بِاَمْرِ اللّٰہِ فِیْہِ[1]۔ درحقیقت امت کی امامت اور رہبری کے اس منصب کے لیے سب سے زیادہ لائق وہ شخص ہے جو سب لوگوں سے زیادہ طاقتور، زیادہ قابل اور خدا کے حکم کو زیادہ جانتا ہو۔ غرض امام کے لیے لیاقت و قدرت اور علم و آگاہی لازمی شرطیں ہیں۔

اسی خطبے میں آپ دوسری جگہ فرماتے ہیں: لَا یَحْمِلُ ھٰذَا الْعَلَمَ اِلَّا اَھْلُ الْبَصَرِ وَالصَّبْرِ وَالْعِلْمِ بِمَوَاضِعِ الْحَقِّ[2] صرف وہی شخص امامت کا یہ جھنڈا اٹھا سکتا ہے جو سچائی کے معاملات سے آگاہ اور دانائی، علم اور صبر والا ہو۔

---

[1] و [2] نہج البلاغہ، فیض الاسلام صفحہ ۵۴۹، خطبہ ۱۷۲

امام اور حقوق کی برابری

امام علیؑ فرماتے ہیں اِنَّمَا اَنَا رَجُلٌ مِّنکُم لِی مَالَکُم وَعَلَیَّ مَاعَلَیکُم۔[1] میں تمھیں میں سے ہوں اور تمھاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں۔ جو کچھ تمھارے لیے ہے وہی میرے لیے بھی ہے اور خدا کا جو حکم اور دنیا کا جو دکھ تمھارے واسطے ہے وہی میرے واسطے بھی ہے اور ہم سب کے سب برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔

اسلام کے مفاد کی حفاظت

امام علیؑ اپنے جائز حقوق سے ہٹا دیے گئے، لیکن انھوں نے صبر کیا۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر مسلمانوں کا کام خوبی کے ساتھ انجام پاتا ہے تو میں کچھ نہیں کہوں گا اور اپنے اوپر ظلم گوارا کر لوں گا۔[2] خدا کی قسم اگر تفرقے کا خدشہ نہ ہوتا تو میں اس راہ سے الگ دوسری راہ اختیار کر لیتا اور لڑ کر اپنا حق لے لیتا۔[3]

ابن عباس نے امام علیؑ سے کہا کہ آپ عمر کی مجلس مشاورت میں شریک نہ ہوں کیونکہ منصوبہ کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ آپ کو عملی طور پر کاٹ دیا جائے۔ امام نے فرمایا چونکہ مجھے بلایا گیا ہے اس لیے میں ضرور جاؤں گا کیونکہ میں محض مخالفت کو ناپسند کرتا ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجلس میری وجہ سے ناقص ہو کر رہ جائے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۷ صفحہ ۳۶ [2] سیری در نہج البلاغہ صفحہ ۱۸۲
[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۹

انتخاب کا طریقہ

رہبر اور امام کے تقرر کا طریقہ

آج کے معاشروں میں بطور رہبر اور ذمہ دار منصب پر کسی فرد کے تقرر کا بہترین طریقہ انتخابات ہیں لیکن یہ بات بھی ظاہر ہے کہ انتخاب اس مسئلے کے حل کا ایک طریقہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ طریقہ ہر جگہ درست قرار نہیں پا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انتخابات حقیقتوں کو نہیں بدل سکتے نہ درست کو نادرست اور نہ نادرست کو درست کر سکتے ہیں۔ حق اگر حق ہے تو اپنے کم طرفداروں کے باوجود بھی باطل نہیں ہو سکتا اور باطل اگر باطل ہے تو اکثریت کی رائے کے باوجود حق نہیں بن سکتا۔ کوئی علمی اور عقلی دلیل یہ نہیں کہتی کہ اکیاون اشخاص کی منتخب کی ہوئی چیز انچاس آدمیوں کی چنی ہوئی شے سے بہتر ہوتی ہے۔ ہاں عمل کے معاملے میں اکثریت کی رائے ضرور مدنظر رکھی جاتی ہے لیکن کیا یہ سچائی اور حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے؟ نہیں۔ اصولی طور پر اسلامی حکومت اللہ کی بنائی ہوئی بنیادوں پر قائم ہے اور لوگوں کے لیے اس بارے میں (اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پر) کسی قسم کا کوئی حق نہیں رکھا گیا کیونکہ یہ خدا کی حکومت ہے اور بس۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خدا جو سب سے زیادہ جانتا ہے اور سب سے زیادہ مہربان بھی ہے۔ وہ خود انسانوں کے لیے امام مقرر کرے۔

دوسری جانب دیکھیے تو قرآن شریف میں اکثریت کی تقریباً اسّی مرتبہ برائی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ سورۂ انعام کی آیت ۱۱۵ میں ہم پڑھتے ہیں:

(اے رسولؐ!) اگر آپ ان کثیر لوگوں کی اطاعت کریں گے جو زمین پر بستے ہیں تو وہ آپ کو خدا کی راہ سے بھٹکا دینگے کیونکہ وہ صرف اپنے وہم وگمان کی پیروی کرتے ہیں۔

بے شک نا پختہ اور غیر تربیت یافتہ لوگوں کی اکثریت کو قبول نہیں کرنا چاہیے اور اسلام میں مشاورت کا تعلق نہ قانون سازی سے ہے اور نہ امام کے تقرر سے بلکہ اس کا تعلق سماجی احکام کے نفاذ سے ہے جیسے کیا نماز کی تعداد رکعات میں مشورے کی گنجائش ہے؟ کیا لوگ ٹھیکری کے گرد جمع ہو جائیں تو وہ موتی ہو جائے گی؟ اگر وہ سونے کو چھوڑ بیٹھیں تو کیا وہ ٹھیکری بن جائے گا؟

اس کے علاوہ شوریٰ سے متعلق آیتیں اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ اکثریت کی رائے معتبر ہوتی ہے جبکہ ہم مشورے سے خیالات کی زیادہ سے زیادہ تعداد نہیں بلکہ بہترین خیال اخذ کرنے کے معنی لیتے ہیں، مشورہ دوسروں کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے اور سب سے اعلیٰ خیال معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ قرآن مشورے کے معاملے میں ایک تکون پیش کرتا ہے جس کا ایک ضلع خیالوں اور مشوروں سے واقفیت ہے۔ دوسرا ضلع خود انسان کا ارادہ ہے اور تیسرا خدائے بزرگ پر توکل ہے۔ جیسے اگر لوگوں کی اکثریت طاقت حاصل کرلے تو کیا وہ اپنے حق پر قناعت کرے گی یا ظلم اور زیادتی کرا ٹھے گی؟ کیا اکثر لوگ ایماندار ہیں؟ کیا لوگوں کی اکثریت اپنے اور دوسروں کے فائدے کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے؟

یقیناً بات یہ ہے کہ عقلمند لوگوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے کہ

معاشرے کے اکثر افراد کا خیال اکثر اوقات غلط ہوتا ہے۔ وہ اسے قبول کرنے پر اس لیے مجبور ہوگئے ہیں کہ دوسرے طریقوں میں برائی زیادہ اور انتخابات میں نسبتاً کم ہوتی ہے لیکن خدا پر ایمان رکھنے والے صاف صاف احکامات، آیات اور واضح روایات کی موجودگی میں ان کے نفاذ کے موقعوں کے علاوہ اکثریت کی پیروی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ انھوں نے خدا کے حکم اور قانون کو اپنا لیا ہے اور کسی خوف و اضطراب کے بغیر اطمینان اور قطعیت کے ساتھ ان پر عمل کرتے ہیں۔

میں پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ اکثریت کی رائے کسی مسئلے کے حل کا ایک طریقہ ہے لیکن یہ طریقہ ہر جگہ درست نہیں ہے۔ ہم آگے چل کر انتخابات کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

ناخوشگوار تجربے

تاریخ نے بار بار بتایا ہے کہ انتخابات میں لوگ اکثریت کی رائے سے کامیاب ہوگئے ہیں لیکن جلد یا بدیر اس قسم کے انتخابات کی غلطی سب پر آشکار ہوگئی۔ ہم نے ان لوگوں کو بہترین انسان سمجھا تھا اس لیے رائے دینے کے علاوہ ہم ان کی خاطر جان دینے کو بھی آمادہ ہوگئے تھے اور ان کا قدم اس قدر دھوکے، ظاہرداری اور سیاست سے اٹھتا تھا کہ ہم کو اس غلطی کا گمان بھی نہیں ہوتا تھا لیکن ان واقعات کے پیش آنے سے جن سے حقیقتیں واضح ہوجاتی ہیں وہ کچھ اور ہی نکلے یعنی منصب اور دولت نے انھیں تبدیل کر دیا۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم جو غیب کا علم نہیں رکھتے اور آنے والے زمانے اور

لوگوں کے باطن سے بے خبر ہیں کس طرح کسی شخص کے بارے میں سو فیصدی درست رائے رکھ سکتے ہیں؟

کیا انسان کے حالات نہیں بدلتے رہتے؟ کیا شک یقین سے اور یقین شک سے تبدیل نہیں ہو جاتا؟ کیا خوف ایمان سے نہیں بدل جاتا اور ایمان کبھی الحاد نہیں بن جاتا؟ ہمارے سامنے ایسے لوگوں کی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں جن سے بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں لیکن انھوں نے مایوس کر دیا اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن پر نیکی کا گمان بھی نہیں ہوتا تھا لیکن وہ یکایک تبدیل ہو کر سیکڑوں نیکیوں اور برکتوں کا سرچشمہ بن گئے۔ کیا فرعون کے نمک خوار جادوگر حضرت موسیٰؑ کی توہین کے لیے میدان میں نہیں اترے تھے جو یکایک حضرت موسیٰؑ کے بہترین حمایتی بن گئے؟ کیا بلعم باعور عقلمند انسان نہیں تھا جو دنیا کی محبت میں اپنے کمالات سے ہاتھ دھو بیٹھا؟ ان مثالوں کے تذکرے سے ہمارا مقصد انتخابات اور لوگوں کی رایوں پر ضرب کاری لگانا نہیں ہے بلکہ ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ انتخاب گتھیوں کے سلجھانے کی تدبیر تو ہے لیکن خدائی علمی اور یقینی طور پر درست تدبیر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بہتر راستا وہی اسلام کا راستا ہے اور بس۔ غالباً ہم انتخابات کو قرعہ اندازی سے تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن قرعہ اندازی بھی بعض موقعوں پر کسی مشکل کو حل کرنے کی صرف ایک راہ ہے لیکن یہ کوئی عملی اور عقلی راہ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کو واضح کرنے کے لیے ہم امام زین العابدینؑ کی ایک دلچسپ حدیث بحار الانوار کی جلد ۲، کے صفحہ ۱۸۴ سے نقل کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

اِذَا رَاَیْتُمُ الرَّجُلَ قَدْ حَسُنَ سَمْتُهٗ وَهَدْیُهٗ وَتَمَاوَتَ فِیْ مَنْطِقِهٖ وَتَخَاضَعَ فِیْ حَرَکَاتِهٖ فَرُوَیْدًا لَا یَغُرَّنَّکُمْ جب تم ایسے آدمی کو دیکھو جو ملنسار ہے اور اس کا حلیہ

اور چلن اچھا ہے اپنے اندر زہد اور عبادت کے آثار رکھتا ہے اور اپنے اعمال میں بہت انکسار سے کام لیتا ہے تو اسے کچھ ڈھیل دو، جلدی نہ کرو تا کہ تمھیں دھوکا نہ دے۔ امامؑ اس صبر اور انتظار کی وجہ یوں بیان فرماتے ہیں۔ فَمَا اَكْثَرَ مَنْ يُعْجِزُهٗ تَنَاوُلُ الدُّنْيَا وَرُكُوبُ الْحَرَامِ مِنْهَا لِضَعْفِ بُنْيَتِهٖ وَمَهَانَتِهٖ وَجُبْنِ قَلْبِهٖ فَنَصَبَ الدِّيْنَ فَخًّا لَهَا فَهُوَ لَا يَزَالُ يَخْتِلُ النَّاسَ بِظَاهِرِهٖ فَاِنْ تَمَكَّنَ مِنْ حَرَامٍ اقْتَحَمَهٗ۔

ایسے بہت سے لوگ ہیں جو دنیا کمانے سے عاجز ہیں اور دنیا تک انکی نارسائی ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے نہیں جسمانی کمزوری یا بے لیاقتی اور شخصیت کے فقدان یا خوف کے باعث ہے۔ پس وہ شخص جو کمزور، بے شخصیت یا ڈرپوک ہے تو وہ دین کو دنیا تک پہنچنے کے لیے ایک آڑ بنا کر لوگوں کو ہمیشہ اپنی ظاہرداری سے دھوکا دیتا ہے اور اگر اس کا بس چلے تو وہ حرام تک پہنچ جائے گا اور اپنے آپ کو بے اختیار اس میں جھونک دیگا۔

امامؑ حدیث کے آخری حصے میں فرماتے ہیں: وَاِذَا وَجَدْتُمُوْهُ يَعُفُّ عَنِ الْمَالِ الْحَرَامِ فَرُوَيْدًا لَا يَغُرَّكُمْ فَاِنَّ شَهَوَاتِ الْخَلْقِ مُخْتَلِفَةٌ فَمَا اَكْثَرَ مَنْ يَنْبُوْ عَنِ الْمَالِ الْحَرَامِ وَاِنْ كَثُرَ وَيَحْمِلُ نَفْسَهٗ عَلٰى شَوْهَاءَ قَبِيْحَةٍ فَيَاْتِيْ مِنْهَا مُحَرَّمًا۔

اور جو تم یہ دیکھو کہ وہ مال حرام سے بھی دور رہتا ہے تو بھی صبر کرو اور اس کی اچھائی کے بارے میں جلدی فیصلہ نہ کرو کیونکہ انسان کی خواہشات مختلف ہوتی ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مال حرام سے بچتے ہیں اور اگرچہ مال حرام کو زیادہ بھی دیکھتے ہیں تب بھی اسکا اثر نہیں لیتے لیکن اپنے آپ کو ناپسندیدہ کاموں پر مجبور کرتے اور حرام کا ارتکاب کرتے ہیں۔

کاش ہم امام کی بات کی تہہ تک پہنچیں اور لوگوں کو بہتر طور پہ پہچانیں۔

امام اس کے بعد یوں فرماتے ہیں : فَاِذَا وَجَدْتُمُوْهُ يَعِفُّ عَنْ ذٰلِكَ فَرُوَيْدًا لَا يَغُرَّكُمْ حَتّٰى تَنْظُرُوْا مَا عُقْدَةُ عَقْلِهٖ فَمَا اَكْثَرَ مَنْ تَرَكَ ذٰلِكَ اَجْمَعَ ثُمَّ لَا يَرْجِعُ اِلٰى عَقْلٍ مَتِيْنٍ فَيَكُوْنُ مَا يُفْسِدُهٗ بِجَهْلِهٖ اَكْثَرَ مِمَّا يُصْلِحُهٗ بِعَقْلِهٖ.

جب تم دیکھو کہ وہ تمام برے کاموں سے بچتا ہے اور تمھیں دھوکا نہیں دیتا تو جب تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ اس کی فہم و فراست کیسی ہے کیونکہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو تمام برے کاموں سے بچتے ہیں لیکن ان میں ذرا سی بھی سوجھ بوجھ نہیں ہوتی، چونکہ ان میں سوچ بچار کی اہلیت کم ہوتی ہے اس لیے عام طور پر وہ درستی کی بجائے خرابی کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔

امام کی گفتگو کا آخری حصہ

فَاِذَا وَجَدْتُّمْ عَقْلَهٗ مَتِيْنًا فَرُوَيْدًا لَا يَغُرَّكُمْ حَتّٰى تَنْظُرُوْا مَعَ هَوَاهُ يَكُوْنُ عَلٰى عَقْلِهٖ اَوْ يَكُوْنُ مَعَ عَقْلِهٖ عَلٰى هَوَاهُ فَكَيْفَ مَحَبَّتُهٗ لِلرِّاسَاتِ الْبَاطِلَةِ وَ زُهْدُهٗ فِيْهَا فَاِنَّ فِي النَّاسِ مَنْ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ يَتْرُكُ الدُّنْيَا لِلدُّنْيَا ۔

اور اگر تم یہ دیکھ لو کہ وہ شخص عقل سلیم بھی رکھتا ہے پھر بھی وہ تمھیں دھوکا نہیں دیتا تو صبر کرو اور یہ دیکھو کہ وہ اپنی خواہشات کو اپنی عقل پر سوار کر لیتا ہے یا عقل کی مدد سے اپنی خواہشات پر سوار ہو کر چلتا ہے اور باطل سرداریوں کا کتنا خواہشمند ہے اس لیے کہ لوگوں میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔ وہ دنیا کو خدا کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی باطل سرداری کی خاطر ترک کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک سرداری کا مزہ دنیا اور مال دنیا کے مزے سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ امام آخر میں فرماتے ہیں کہ واقعی اچھا انسان وہ ہے

جو حق کے ساتھ ذلت کو باطل کی بدولت عزت سے بہتر سمجھتا ہے۔[1]

اس طبی حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں کے دھوکا کھانے اور دھوکا دینے کے ان تمام طریقوں کے ہوتے ہوئے یک طرفہ اور اوپری شناختوں کے ساتھ امت کی رہبری کا فیصلہ انتخابات کے ذریعے سے کیسے کیا جا سکتا ہے۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ اگرچہ انتخابات ایک حد تک مسائل کو حل کرنے کا ایک طریقہ تو ہیں لیکن ہر مقام پر مفید نہیں ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا:

اِذَا کَانَ لَکَ صَدِیْقٌ فَوَلِیَ وِلَایَۃً فَاَصَبْتَہٗ عَلَی الْعُشْرِ مِمَّا کَانَ لَکَ عَلَیْہِ قَبْلَ وِلَایَتِہٖ فَلَیْسَ بِصَدِیْقِ سُوْءٍ[2] اگر تمہارا کوئی دوست کسی اعلیٰ مرتبے پر پہنچ گیا ہے اور اس وفاداری اور محبت کا جو وہ تمہارے لیے اپنی عہدیداری سے پہلے رکھتا تھا اب اگر اس کا دسواں حصہ بھی رکھتا ہے تو تمہارا وہ دوست برا نہیں ہے۔

غور کیجیے کہ اعلیٰ منصب انسان کو کس طرح تبدیل کر دیتا ہے چنانچہ بہت سے جاں نثار اور محبت کرنے والے لوگوں کی روح اور روش اعلیٰ منصب حاصل کر لینے کے بعد بدل جاتی ہے۔ انھیں باتوں کے سبب سے ہم کہتے ہیں کہ رہبر کا تقرر خدا کی طرف سے ہونا چاہیے کیونکہ وہ علم غیب رکھتا ہے اور لوگوں کے آنے والے حالات کو جانتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کسے رسالت کا منصب عطا کرے۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ[3] ۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۴، صفحہ ۱۸۴۔ [2] بحار الانوار جلد ۷۴، صفحہ ۱۵۷

[3] سورۂ انعام - آیت ۱۲۴

لوگوں کا فیصلہ ہر جگہ صحیح نہیں ہوتا

امام محمد باقر علیہ السلام نے جابر بن عبداللہ انصاری سے فرمایا:

وَاعْلَمْ بِاَنَّكَ لَاتَكُوْنُ لَنَا وَلِيًّا حَتّٰى لَوِ اجْتَمَعَ عَلَيْكَ اَهْلُ مِصْرِكَ وَقَالُوْا اِنَّكَ رَجُلُ سُوْءٍ لَمْ يَحْزُنْكَ وَلَوْ قَالُوْا اِنَّكَ رَجُلٌ صَالِحٌ لَمْ يَسُرُّكَ ذٰلِكَ وَلٰكِنْ اَعْرِضْ نَفْسَكَ عَلٰى مَافِيْ كِتَابِ اللّٰهِ۔[1]

اے جابرؓ! تم اس وقت تک ہمارے دوست نہیں ہو سکتے جب تک ایسے نہ بن جاؤ کہ اگر شہر کے تمام لوگ تمہارے متعلق کہیں کہ فلاں شخص برا ہے تو تم ناخوش نہ ہو یا اگر یہ کہیں کہ فلاں شخص نیک انسان ہے اور تم خوش نہ ہو بلکہ تم اپنے آپ کو پہچاننے کے لیے خود کو کتاب خدا کے سامنے پیش کر دو۔

اس حدیث سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر مقام پر لوگوں کی رائے، فیصلہ اور انتخاب درستی یا نادرستی کی دلیل نہیں ہے۔

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ مسئلہ امامت ایک اہم اعتقادی مسئلہ ہے جو معاشرے کی ہدایت کا ذریعہ اور نشوونما دینے والا ہے نیز ان کثیر روایات کے مطابق سچے امام کی پیروی کے بغیر عبادت قبول نہیں ہوتی، چاہے انسان عمر بھر اور رات دن سخت قسم کی عبادت کرتا رہے۔ وَاللّٰهِ لَوْ اَنَّ رَجُلًا صَامَ النَّهَارَ وَقَامَ اللَّيْلَ ثُمَّ لَقِىَ اللّٰهَ بِغَيْرِ وَلَايَتِنَا لَلَقِيَهُ وَهُوَ غَيْرُ رَاضٍ اَوْ سَاخِطٌ عَلَيْهِ۔[2] خدا کی قسم اگر چاہے کوئی

---

[1] بزرگ سالان جلد ۱ - صفحہ ۳۴۱ [2] بحار الانوار - جلد ۲۶ صفحہ ۱۹۰

شخص دن کو روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھا کرے لیکن جب تک وہ ہماری رہبری کو قبول نہیں کریگا قیامت میں اس پر یا تو خدا کا غضب نازل ہوگا یا کم از کم خدا اس سے راضی نہیں ہوگا اور اس کے بعد کہ تاریخ میں رہبری کے مسئلے نے قوموں کی قسمت پر خاص اثر ڈالا ہے اور اس کے بعد کہ غفلت، شک، دھمکی اور لالچ کے راستے کھلے ہوئے ہیں اور لوگوں نے اپنے آپ کو جھوٹ موٹ کے اور جعلی رہبر اور امام بنا لیا ہے اور جماعتوں کو تباہی کے سپرد کر کے بدقسمت بنا دیا ہے۔

بہرحال ان سب باتوں کے بعد یہ مناسب ہے کہ ہم قرآن اور حدیث سے امام کے تقرر کا طریقہ اور سچے اور جھوٹے امام کی پہچان کا ڈھنگ معلوم کریں اس کے لیے یہ اچھا ہے کہ پہلے ہم دنیا میں رائج عام طریقوں پر غور کریں اور بعد میں اسلام کی روش کے ساتھ ان کے موازنے سے اسلام کی قدر و قیمت کا سراغ لگائیں۔

دنیا میں رہبر کے تقرر کے طریقے

دنیا میں لوگ یا تو بغاوت، طاقت، زور اور ظلم کے طریقے سے رہبری کا منصب حاصل کرتے ہیں یا کسی کمیٹی اور پارلیمنٹ کے ذریعے سے کسی شخص کا تقرر ہوتا ہے یا انتخاب اور رائے عامہ کے ذریعے سے یا جانشینی اور وراثت کے طریقے سے۔

ظاہر ہے کہ مسلح بغاوت ایک زبردستی ہے اور عملی طور پر یہ ایک اقلیت کا اکثریت کی رائے کو نظرانداز کرنا ہے۔ یہ طریقہ کسی شخص کو لوگوں پر مسلط کرتا ہے اور انتخاب میں بھی بہت سی برائیاں ہیں اس لیے انھیں بھی قوت اور طاقت میں ہی شمار کرنا چاہیے۔ بے عیب اور درست طریقہ وہی خدائی طریقہ ہے جس میں پیغمبر ان

جیسے معصوم رہبر خدا کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔

امام کا تقرر صرف خدا کی طرف سے ہوتا ہے

جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی جان، مال اور بیوی وغیرہ کی جدائی جیسے حوادث سے آزمائش کر لی اور وہ ان تمام خدائی امتحانات میں کامیاب ہو گئے تو انھیں امامت اور رہبری کے منصب پر مقرر فرمایا۔ حکم الٰہی کی عبارت یہ تھی (اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا)[1] میں نے تجھے لوگوں اور ان کے فائدے کے لیے امامت کے منصب پر مقرر کر دیا۔

اس اعلان میں جملہ (اِنِّیْ جَاعِلُکَ) "میں نے تجھے بنا دیا" سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کا تقرر خدا کے ہاتھ میں ہونا چاہیے اور بس۔ امام کو چاہیے کہ وہ انسان اور دنیا پر جاری تمام قوانین کو جانتا ہو۔

امام کو اس راستے کے لازمی نتیجے سے واقف ہونا چاہیے جسے وہ اختیار کرتا ہے۔ امام کو چاہیے کہ وہ رہبری میں اپنا فائدہ نہ دیکھے اور داخلی اور خارجی اسباب سے متاثر نہ ہو۔ امام کو بہترین اور نمایاں انسانی صفات کا بدرجہ اتم مالک ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ معمولی افراد میں ان شرائط کا وجود نہیں ملتا اور عوام لوگوں میں ان صفات کے وجود سے بے خبر ہیں۔

کمزور، جاہل اور گمراہ لوگوں کو ضروری قابلیت رکھنے والے معصوم امام کی رہبری سے ہدایت پانا چاہیے لیکن افسوس ہے اس دن پر جب خود رہبر اور امام ہی گمراہ، کمزور، جاہل اور بے یقین ہو یا مغرور، ڈرپوک اور بخیل ہو۔

---

[1] سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴

ناخوشگوار تجربے

اسی وجہ سے لوگوں کو غیر معصوم امام کے سپرد کرنا بھی ظلم ہے اور انسانیت کے درجے کی توہین ہے اور امام اور رہبر کی پہچان خود ایسے لوگوں کے سپرد کرنا بھی ان پر جفا ہے جو غیب کا حال نہیں جانتے، جنھوں نے کوئی معمولی ترقی بھی نہیں کی ہے اور جن کی عقل ان کی آنکھوں میں ہے (یعنی جو دیکھ کر کام کرتے ہیں عقل سے کام نہیں لیتے)۔ دور کیوں جائیے آج کے انھیں ترقی یافتہ معاشروں میں اگر یہ کہا جائے کہ فلاں گمنام نوجوان سیاستدانوں اور تجربہ کاروں کے فلاں گروہ سے بڑھ کر راستے کے انتخاب، ثابت قدمی اور معاشرے کو ترقی دینے کی قوت اور صلاحیت رکھتا ہے تو کیا مشرق اور مغرب کی دنیا اسے قبول کرے گی؟ ہرگز نہیں کیونکہ انسان اپنے ہی فطری تقاضوں کا غلام ہے اور بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو مکمل طور پر انصاف پسند ہوں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ حاکم، ماحول کے تعصب اور اقربا نوازی وغیرہ کے اثر سے دور ہوں۔

ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ لوگ پوچھتے تھے: قرآن مکہ اور طائف کے دو مشہور آدمیوں پر کیوں نازل نہیں ہوا؟ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۔ (سورۂ زخرف۔ آیت ۳۱)۔

وہ لوگ سوچتے تھے کہ چونکہ فلاں شخص مشہور و معروف یا مالدار اور صاحب جائیداد ہے اس لیے وحی بھی اسی پر نازل ہونا چاہیے تو دیکھیے اکثریت کی سمجھ کا نمونہ یہ ہے۔ جب جناب طالوت خدا کی طرف سے فوج کے کمانڈر مقرر ہوئے تو بہت سے لوگوں نے محض انکی ناداری اور غریبی کی وجہ سے انکی کمانداری قبول نہیں کی تھی (سورہ بقرہ۔ آیت ۲۴۷)

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ پیغمبرؐ نماز جمعہ کا خطبہ پڑھنے میں مشغول تھے کہ تجارتی مال کے آجانے پر ڈھول کی آواز بلند ہوئی مسجد میں موجود لوگ رسول اکرمؐ کا خطبہ چھوڑ چھاڑ کر ایک دم مال تجارت کی طرف بھاگ لیے اور خریداری میں لگ گئے اور مسجد میں سوائے چند آدمیوں کے کوئی باقی نہیں رہا۔ یہ بھی لوگوں کی اکثریت کی سوچ اور سمجھ کا ایک خاص نمونہ ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ ہم اتنے تلخ تجربوں کے بعد امام کے تعین کے سے اہم مسئلے کو لوگوں کے سپرد کس طرح کر سکتے ہیں؟ یہ ہے دلیل منصب امامت کے متعلق ہمارے اس عقیدے کی کہ امام بھی پیغمبر کی طرح صرف خدا کی طرف سے مقرر ہو۔

یہاں ہم آیت اللہ سید محمد باقر صدر شہید کا ایک بیان نقل کرتے ہیں۔ چند ابتدائی امور بیان کرنے کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ امام کے تقرر کا طریقہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے نامزدگی ہونا چاہیے اور یہ ہیں اسکے ابتدائی مدارج۔

۱۔ ایک طرف تو پیغمبرؐ ہمہ جہتی تبدیلی اور ہمیشہ کے واسطے ایک عظیم اعتقادی، فکری، علمی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے اور جاہلیت کے نظام کو اسلامی انسانی نظام سے بدل دینے کے ذمہ دار تھے۔

۲۔ دوسری جانب آپ کی رسالت کے تیئیس سال کی مدت اس طرح گزری کہ مسلمان مکے میں تنگی، مجبوری اور خوف میں رہے اور مدینے میں مصیبتیں جھیلتے، لڑائیاں لڑتے اور دشمنوں کے الزامات اٹھاتے رہے۔ تاہم یہ ۲۳ سال ان سب پریشانیوں کے ساتھ اس انقلاب کے لیے کم ہیں۔

۳۔ ایک اور مسئلہ بھی جو نظر سے اوجھل نہیں رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ

دنیا سے یکایک نہیں چلے گئے جو ہم یہ کہہ سکیں کہ امت کی رہبری اور اپنے کام کی بقا کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔

مختصر یہ کہ اسلام کے مطابق معاشرے کی اس تبدیلی کے لیے تیئیس سال کی مدت بہت کم ہے اس لیے ضروری تھا کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد بھی یہ کام جاری رہے کام کے اس تسلسل کے لیے ہم یہاں چند صورتیں جانچ پڑتال کے لیے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ یا تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ پیغمبر اکرمؐ نعوذ باللہ بے پروا تھے اس لیے انھوں نے لوگوں کی رہنمائی اور انقلابی دین کے دوام کی فکر کیے بغیر انھیں اسی طرح چھوڑ دیا اور دنیا سے سفر کر گئے۔

یہ خیال قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ ایک معمولی سا انسان بھی اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اس نے جو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کیا ہے اسے یونہی چھوڑ جائے اور کسی دوسرے کے سپرد نہ کرے تو پھر اسلام کے لیے آنحضرتؐ کی محنت خلوص اور لگن کے پیش نظر جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۲۸) پیغمبر اکرمؐ تمہاری فکر میں گھلتے ہیں اور تمہاری ہدایت کے بے حد خواہشمند ہیں۔ دوسری جگہ قرآن پیغمبر اکرمؐ کے متعلق کہتا ہے فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (سورۂ کہف، آیت ۶)۔ (اے رسولؐ!) آپ اس فکر میں کہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے اپنے آپ کو کیوں ہلاک کیے ڈالتے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ جو لوگوں کی ہدایت اور نظام اسلام کی ترویج کے لیے اس قدر لگن اور محبت رکھتے ہیں کیا وہ اس بات کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں کہ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ جائیں؟ کیا پیغمبر اکرمؐ نے جنگ تبوک کے سفر میں جو اسّی دن تک جاری

رہا تھا مدینے میں اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا تھا؟

کیا حضرت ابوبکر اس بات کے لیے تیار تھے کہ لوگوں کو یونہی چھوڑ دیں اور انھیں حضرت عمر کے سپرد نہ کریں؟ کیا یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ حضرت ابوبکر کو تو اپنے بعد کے لیے مسلمانوں کی فکر تھی اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نہیں تھی؟ اس لیے یہ نظریہ بھی نہیں مانا جاسکتا۔

۲- اس سلسلے میں ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ ہم یہ کہیں: پیغمبر اکرم ﷺ دنیا سے جاتے وقت امت کی رہبری کے معاملے کو خود لوگوں کے صلاح مشورے اور انتخاب پر چھوڑ گئے۔ اس خیال پر یہ بھی اعتراض ہوتا ہے کہ ابوبکر نے امت کی رہبری کے معاملے کو پیغمبر اکرم ﷺ کی طرح کیوں نہ شوریٰ (مجلس مشاورت) کے سپرد کیا بلکہ انھوں نے خود اس میں دخل دیا اور حضرت عمر کو مقرر کر دیا۔ پھر حضرت عمر نے امت کی رہبری کے لیے سب سے ووٹ کیوں نہیں لیے اور چھ آدمیوں کا شوریٰ قائم کیا اور وہ بھی ایسا شوریٰ جو عملاً ایک آمریت تھا کیونکہ عمر نے یہ کہہ دیا تھا کہ اس شوریٰ کے چھ ممبروں میں سے وہی شخص رہبر مقرر ہوگا جسکی عبدالرحمٰن بن عوف حمایت کریگے؟

یہ کیسا شوریٰ ہے جس کے ممبروں میں سے صرف ایک ممبر کو ویٹو (استرداد) کا حق ہو اور اس فریق کا فیصلہ ہی قابل قبول ہو جس فریق میں یہ رکن شامل ہو۔ یہ شوریٰ ہے یا آمریت؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس خیال کے مطابق غدیر خم کے واقعے کی کیا تاویل ہوسکتی ہے؟

اب چونکہ پہلا اور دوسرا دونوں خیال قابل قبول نہیں ہیں اس لیے صرف ایک ہی راستا باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ جو لوگوں کے

اتنے ہمدرد ہیں وہ ایک لائق شخص کو امت کی رہبری کے لیے منتخب اور مقرر کریں اور لوگوں میں اس کا تعارف بھی کرا دیں جو مکتب کی پہچان اور اس کے مطابق عمل، رہبری اور تنظیم کی قوت اور معاشرے کی ترقی کے کام میں سب لوگوں سے بہتر ہے جو ہر قسم کی علمی اور فکری صلاحیت کا مالک اور درخشندار خدمات بھی رکھتا ہے۔

ایک دلچسپ بات

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن نے امامت کے مسئلے کا ذکر ایک لفظ (عہد) سے کیا ہے اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے امامت مانگی تو خدا نے جواب دیا کہ میرا عہد (جو امامت کا منصب ہے) ظالم لوگوں کو نہیں ملے گا لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)۔ چونکہ امامت خدا کا عہد و پیمان ہے اس لیے ہمیں اسے شوریٰ (صلاح مشورے) سے طے نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ شوریٰ کا تعلق خدا کے عہد سے نہیں ہے بلکہ لوگوں کے کاموں سے ہے۔ اسی لیے ان دو آیتوں میں جن میں مشاورت کا ذکر آیا ہے کلمہ (اَمْرٌ) آیا ہے (وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی)۔ مومنوں کا کام مشورے سے انجام پاتا ہے یا پیمبر اکرمؐ کو حکم ہوتا ہے کہ (وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ) لوگوں کے معاملوں میں خود ان سے مشورہ کرو۔ غور کیجیے کہ دونوں آیتوں میں مشورے کا موضوع لوگوں کے کام ہیں جن کا تعلق سماجی مسائل سے ہے امامت کے مسئلے میں اس کا دخل نہیں ہو سکتا جو خدا کا عہد و پیمان ہے۔

مزید ناخوشگوار تجربے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں سے ستر آدمی چنے اور انھیں اپنے ساتھ کوہ طور پر لے گئے لیکن ان کے ایک احمقانہ سوال کی وجہ سے سب کے سب خدا کے غضب کا نشانہ بن گئے اور موسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر نے جو انتخاب کیا وہ بھی غلط ہوگیا (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۵۵)۔ ہم اسی قسم کے تلخ تجربوں کے باعث انتخاب پر قرار واقعی اطمینان نہیں رکھتے اس لیے بہتر یہ ہے کہ انتخاب کو ایسی ہستی کے ذمے لگا دیں جو حقیقتوں، رازوں اور آنے والے زمانے اور اس کے واقعات کو سب سے زیادہ جانتا ہے یعنی خدائے بزرگ و برتر۔

انتخابات کی فطری خرابیاں

انتخاب اور سب کی رائے لینا اگرچہ بہت سے موقعوں پر مشکلات کا بہت اچھا حل ہوتا ہے لیکن یہ بنیادی طور پر ایسی خرابیاں بھی رکھتا ہے جن سے بالکل چشم پوشی بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہ خرابیاں کچھ اس قسم کی ہوتی ہیں:

۱۔ ہر انسان ایک شخص کو منتخب کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس انتخاب کرنے والوں اور منتخب ہونے والوں کے درمیان ایسی رقابتیں وجود میں آجاتی ہیں جو ایک قسم کی ضد، کدورت اور فساد پیدا کردیتی ہیں۔

۲۔ ہر منتخب ہونے والا فطری طور پر اپنے منتخب کرنے والوں ہی کی حمایت کرتا ہے اور صرف وہی لوگ اس کے نزدیک قدر و قیمت رکھتے ہیں اس لیے اس کی حمایت، مدافعت اور جانبداری ہیں کسی بات کی سچائی سے بڑھ کر

اپنے منتخب کرنے والوں کی خواہش اور مرضی کا بھی گہرا اثر ہوگا' یہ روش خود ایک طرح کا شرک ہے کہ انسان خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو راضی کرنے لگ جائے۔

۳۔ وہی شک اور غلطی اور بھول چوک اور خواہشیں جو ہمیں رات دن غلط سمتوں میں لے جاتی ہیں ممکن ہے کہ رہبر کے انتخاب میں بھی وہی شکوک' شبہات جذبات اور خواہشیں انسانی راستے کو صداقت سے پھیر دیں۔

۴۔ خود منتخب ہونے والوں کی بابت کوئی ضمانت نہیں ہوتی چنانچہ اگر کل کوئی اچھا یا برا واقعہ پیش آ گیا تو وہ کیسے اپنی راہ نہیں بدلیں گے۔

لوگوں کے کیے ہوئے انتخابات کی اپنی قدر و قیمت تو یہ ہے لیکن ان پائی جانیوالی خرابیوں پر بھی نظر رکھنا چاہیے۔

ٹھیک راستا

امام مقرر کرنے کے معاملے میں صحیح راستا وہی ہے جو قرآن بیان کرتا ہے کیونکہ ہم امامت کو نبوت کی طرح' امام کو پیمبر کی طرح اور امام کی ضرورت کی دلیل کو پیمبر کی ضرورت کی دلیل کی طرح سمجھتے اور مانتے ہیں۔ امام کا کام بھی پیغمبر کی طرح انسانی معاشرے کی رہنمائی کرنا اور اسے ترقی اور نیکی کی راہ دکھانا ہے اس لیے اس آیت کو جو نبوت کے بیان میں ہم نے پیش کی تھی یہاں بھی پیش کرتے ہیں اور وہ آیت یہ ہے إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ (سورۂ لیل۔ آیت ۱۲)۔ درحقیقت انسانوں کی ہدایت ہمارے ذمے ہے۔

چنانچہ جس طرح پیغمبر کا انتخاب خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور قرآنی آیات

اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں[1] اسی طرح امام کا تقرر بھی جو لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی و عدل سے متعلق ہے، خدا ہی کی طرف سے ہونا چاہیے۔

بوعلی سینا کی بات

اس سلسلے میں بوعلی سینا ایک بات کہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ امام کو معصوم اور نہایت اعلیٰ صفات سے متصف ہونا چاہیے چونکہ کسی آدمی کا ایسی صفات اور روحانی و ذہنی خصوصیات رکھنا ایک ایسی بات نہیں ہے جسے معمولی آدمی سمجھ سکتا ہو اور اگر کچھ سمجھتا بھی ہے تو نہایت ناقص طور پر اور وہ بھی صرف علامتوں کی مدد سے سمجھ سکتا ہے لہٰذا خدا کو ہی امام کا تقرر کرنا چاہیے کیونکہ وہی لوگوں کے بھیدوں سے واقف ہے، غیب کا حال جانتا ہے اور وہی ہماری حقیقی بھلائی کی راہ سے بھی واقف ہے۔

جہاں انتخاب کی ممانعت ہے

قرآن کہتا ہے کہ جن موقعوں پر خدا اور اس کے رسولؐ نے مومنوں اور مومنات کے لیے کوئی حکم اور قانون وضع کر دیا یا کام کے لیے کسی مقام اور شخص کو منتخب کر لیا تو پھر اس میں لوگوں کے لیے کسی طرح کے انتخاب کا حق باقی نہیں رہا (سورۂ احزاب۔ آیت ۳۶)۔

ہم سورۂ قصص میں بھی ایسا ہی پڑھتے ہیں اور خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا

---

[1] اگر اصطفاء، بعثت اور جعل کی آیات لیکر انکی جانچ کی جائے تو ہمارا بیان اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب یا اختیار کرتا ہے اور لوگ خدا کے اختیار کے سامنے کوئی اختیار نہیں رکھتے (سورہ قصص - آیت ۶۸)۔

تفسیر صافی میں بھی ایسی ہی روایتیں بیان کی گئی ہیں کہ جب خدا نے کسی کو امامت کے لیے چن لیا تو پھر لوگوں کو دوسرے کا اتباع نہیں کرنا چاہیے اور دوسری حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ انتخابات میں غلطی کے امکان سے انتخاب کی قدر و قیمت جاتی رہتی ہے اور حقیقی قدر و قیمت اسی انتخاب کی ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف سے ہو کیونکہ وہی انسانوں کے باطن اور ان کے مستقبل سے واقف ہے۔

نامزدگی ہی صحیح راستا ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ صحیح راستا وہی خدا کی طرف سے تقرر کا راستا ہے جیسا کہ قرآن اور حدیث میں آیا ہے اور اس کا نمونہ غدیر خم کے واقعے میں ملتا ہے۔ سنہ ۱۰ھ جو رسول اکرمؐ کی عمر کا آخری سال تھا، جب اس میں یہ طے ہوا کہ آنحضرتؐ حج کے لیے مدینے سے مکے جائیں تو مسلمانوں کو جیسے ہی اس بات کی خبر ہوئی وہ کوشش کرنے لگے کہ اس سفر میں رسول اکرمؐ کے ساتھ حج کے مراسم بجا لائیں چنانچہ آنحضرتؐ کے ہمراہ ایک بہت بڑا قافلہ مکے پہنچا۔ وہ لوگ حج سے فارغ ہو کر مدینے کو پلٹ رہے تھے کہ ایک ایسے چوراہے پر پہنچے جہاں سے لوگوں کے قافلے ایک دوسرے سے الگ ہو جایا کرتے تھے، یہاں سے ایک راستا شمال میں مدینے کی طرف ایک مشرق میں عراق کی طرف، ایک مغرب میں مصر کی جانب اور ایک راستا جنوب میں یمن کی طرف پھٹتا تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ سب لوگ یہیں ٹھہر جائیں۔

اس جگہ کا نام غدیر خم تھا۔ جمعرات کا دن تھا اور ذیقعد کو آٹھ دن ہو چکے

تھے۔ آپ کے حکم کے مطابق سب لوگ رک گئے۔ آگے نکل جانے والوں کو ہدایت دی گئی کہ واپس آجائیں اور انتظار کریں تاکہ پیچھے رہ جانے والے بھی یہاں پہنچ جائیں۔ دھوپ سخت تھی۔ تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ریت سے پاؤں جھلسے جا رہے تھے۔ سب نے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی اور پھر باہم جدائی کے اس مقام پر، چوراہے کے ایک طرف سب سے اہم پیغام شروع ہوتا ہے۔

اونٹوں کے پالان ایک پر ایک چن کر پیغمبر اکرمؐ کے لیے منبر بنایا گیا۔ آپؐ منبر پر تشریف لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا کیا آپ میری آواز سن سکتے ہیں؟

سب نے جواب دیا: جی ہاں!

اس کے بعد آپؐ نے خدا کی تعریف کی۔ توحید، رسالت اور قیامت کا اقرار کیا اور لوگوں سے اپنے کام کے بارے میں پوچھا۔ سب نے آپ کے کام کی تعریف کی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

موت اپنے کام میں مصروف ہے اور قریب ہے کہ میں بلا لیا جاؤں، میں بھی خدا کے بلاوے پر لبیک کہتا ہوں۔ میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں سے توحید، رسالت اور قیامت کا اقرار لیا اور پھر فرمایا:

"میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن اور دوسرے میرے اہل بیتؑ۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔ تم اس بات کی کوشش کرتے رہنا کہ نہ ان سے آگے نکلو، نہ پیچھے رہو۔" اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے

چاروں طرف نگاہ کی۔ علیؑ کو دیکھ کر انھیں منبر پر بلایا اور اُن کے ہاتھ کو اتنا بلند کیا کہ سب نے انھیں پہچان لیا اور آپ نے پکار کر کہا: مسلمانوں میں سب سے لائق آدمی کون ہے؟ سب نے جواب دیا: خدا اور پیغمبر اکرمؐ بہتر جانتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ جس کا میں مولا اور رہبر ہوں علیؑ بھی اس کے مولا اور رہبر ہیں۔ حضورؐ نے اس بات کو دہرایا اور علیؑ کو دوست رکھنے والوں کے حق میں دعا کی اور علیؑ کو دشمن رکھنے والوں پر نفرین کی۔"

اگرچہ میں نے طے کیا تھا کہ غدیر کا واقعہ بہت واضح ہے اس کو نہ لکھوں لیکن پھر میں نے سوچا کہ کم سے کم اشارہ ہی کر دوں۔ غدیر کے واقعے کی تشریح کرنا سورج اور اس کی روشنی کی وضاحت کے برابر ہے کیونکہ غدیر ایک ایسا واقعہ ہے کہ شیعہ اور سنی میں سے سیکڑوں بزرگوں نے اسے نقل کیا ہے اور اس بارے میں دسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اس لیے ہم اس واقعے کے واضح اور صاف ہونے کے باعث اس سے جلدی گزرے جاتے ہیں۔

بہترین شخص کی نامزدگی

امام علیؑ کی نامزدگی بے سبب اور غیر دانشمندانہ فعل نہ تھا بلکہ ان کا زہد، بہادری، ادب، اخلاق، عبادت، تقویٰ، عرفانِ الٰہی اور خلوص سب لوگوں پر روشن تھا۔ یہاں تک کہ دشمن بھی امام علیؑ کی ذات میں کوئی چھوٹی سی خامی بھی نہیں نکال سکا۔ اکیلے وہی ایسے تھے جنھوں نے کسی وقت بھی بُت کو سجدہ نہیں

کیا تھا بلکہ بچپن ہی سے خدا کو ماننے والے تھے۔

آپ وہ تھے کہ پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کی رات کو جبکہ آنحضرتؐ کے دشمنوں نے ان کو مار ڈالنے کا ارادہ کر لیا تھا ان کے بستر پر سوئے اور پیغمبر اکرمؐ گھر سے نکل کر سلامتی کے ساتھ ہجرت کر گئے۔ وہ آپ ہی تھے جو مراسم حج میں بت پرستوں کو شرکت سے منع کرنے والا اعلان یعنی سورہ برائت کی ابتدائی آیات لیکر گئے اور بت پرستوں کے سامنے نہایت بہادری کے ساتھ بلند آواز سے پڑھ کر سنائیں اور اعلان کیا کہ آئندہ سے وہ کعبے میں داخل ہونے کا حق نہیں رکھتے۔ امام علیؑ کے متعلق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیکڑوں فضیلتیں اور تاکیدیں بیان کی گئی ہیں۔ سنیوں اور شیعوں کی کتابوں میں امام علیؑ کے بہت سے فضائل نظر سے گزرتے ہیں جن میں سے کچھ ہم آگے بیان کریں گے، اب ہم اپنی بات اسی پر ختم کرتے ہیں۔

امام علیؑ اور اہلبیتؑ کے کچھ فضائل

امام علیؑ اور اہلبیتؑ کے فضائل اگرچہ بہت ہیں لیکن ہم امام کی پہچان کی ابتدائی باتوں کے طور پر ان میں سے کچھ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ (ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں): امام علیؑ نے رسول اللہؐ کی ہدایت کے مطابق حضرت فاطمہ زہراؑ اور بی بی فضہ کے ساتھ اپنے دونوں پیارے بیٹوں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی صحت اور شفایابی کے لیے منت مانی کہ تین دن کے روزے رکھیں گے۔ جب دونوں صاحبزادے صحت مند اور شفایاب ہوئے تو نذر پوری کرنے کے وقت گھر میں کچھ نہ تھا۔ امام علیؑ

نے شمعون نامی ایک یہودی سے تین صاع جو قرض لیے۔ سیدہ طاہرہؑ نے ایک صاع جو پیس کر پانچ روٹیاں پکائیں تا کہ منت کا پہلا روزہ افطار کریں لیکن جونہی انھوں نے روزہ افطار کرنا چاہا ایک نادار سائل نے سوال کیا: السلام علیکم یا اہلبیتؑ محمدؐ! میں ایک مسلمان مسکین ہوں مجھے کھانا دو، خدا تمھیں جنت کے خوان عطا کرے گا۔ یہ آواز سنتے ہی سب گھر والوں نے اپنے اپنے آگے کی روٹیاں اسے دیدیں اور خود پانی سے افطار کیا۔ دوسرے دن پھر روزہ رکھا اور جب نماز مغرب کے بعد افطار کرنا چاہا تو ایک یتیم نے آواز دی سب نے اپنی اپنی روٹیاں اس کو دیدیں اور فقط پانی سے افطار کیا۔ اسی طرح تیسرے روز جب افطار کرنے بیٹھے تو ایک قیدی نے آواز دی اور ان بزرگوں نے اپنی روٹیاں اسے دیدیں۔ چوتھے روز صبح کو جناب امیرؑ دونوں صاحبزادوں کو ساتھ لیکر بارگاہِ رسولؐ میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے دیکھا کہ ان کے چہرے زرد پڑے ہیں۔ آپ نے سبب دریافت فرمایا اور اٹھ کر ان کے ساتھ سیدہؑ کے مکان پر تشریف لائے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ فاطمہ زہراؑ محراب عبادت میں اس حال میں ہیں کہ پیٹ کمر سے ملا ہوا ہے اور آنکھیں دھنس گئی ہیں رسول اللہؐ ان سب کی یہ حالت دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئے کہ یکایک جبرئیلؑ اللہ کی طرف سے خوشخبری لیکر نازل ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! آپ کو مبارک ہو کہ ان بزرگوں کی شان میں ایک سورت نازل ہوئی ہے جس میں خداوند کریم نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں نے اپنا کھانا اپنے ہاتھوں سے اور شدید بھوک کے باوجود خدا کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو دے ڈالا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے دل میں خدا کے شکر کے علاوہ اور کوئی خیال نہیں آیا۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ

اپنے اس عمل سے اپنے آئندہ فائدے کے لیے کوئی سند حاصل کریں۔ ان کا مقصد خدا کی خوشنودی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۔ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا

اس واقعے کو تمام شیعہ عالموں نے نقل کیا ہے اور علامہ امینی مرحوم نے "الغدیر" کی تیسری جلد میں اسے چونتیس سنی عالموں سے بھی نقل کیا ہے۔[1]

دوسرا واقعہ

امام علیؑ شیبہ اور عباس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ آپ نے شیبہ کو یہ کہتے سنا: "میں مسجد الحرام کا تعمیر کرنے والا اور کلید بردار ہوں" اور عباس کہہ رہے تھے: "حاجیوں کو پانی پہنچانے کا کام میرا ہے" اور یوں وہ ایک دوسرے پر اپنی اپنی فضیلت جتا رہے تھے۔ امام علیؑ نے فرمایا: اگرچہ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن کہنا پڑتا ہے کہ اتنی کم عمری کے باوجود جو فضیلت میں رکھتا ہوں وہ تم میں نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ جب میں نے تلوار سے جہاد کیا تب تم لوگ خدا اور پیغمبرؐ اکرم پر ایمان لائے۔ یہ جملہ ان لوگوں کو ناگوار گزرا۔

عباس ناخوش ہو کر پیغمبرؐ اکرم کے پاس پہنچے اور شکایت کی۔ آنحضرتؐ نے امام علیؑ کو مخاطب کر کے فرمایا: "تم نے اپنے چچا (عباس) سے ایسی بات کیوں کہی؟

---

[1] الغدیر جلد ۳ صفحہ ۱۱۱۔ نیز تفسیر بیضاوی وغیرہ کے علاوہ تفسیر کشاف جلد سوم صفحہ ۲۳۹ مطبوعہ مصر میں بھی اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے۔

علیؑ نے عرض کی: "یا رسول اللہؐ! میری بات غلط نہیں تھی؟" اسی وقت جبرئیلؑ یہ آیت لیکر آئے:

کیا خانہ خدا کے زائروں کو پانی پہنچانے اور مسجد الحرام کی کلید برداری کا عہدہ خدا اور قیامت پر ایمان لانے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے برابر ہے؟ نہیں بلکہ فضیلت کا پیمانہ صرف ایمان اور جہاد ہے[1] (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۹)۔

جو کام ملائکہ بھی نہ کر سکے

جب رسولؐ خدا نے ہجرت کا ارادہ کر لیا تو امام علیؑ کو قرضے چکانے اور امانتیں لوٹانے کے لیے مکے ہی میں چھوڑ دیا اور ان سے فرمایا کہ آج رات دشمن میرے گھر کا محاصرہ کر کے میرے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تم میری جگہ سو جاؤ۔ امام علیؑ اس خطرناک رات کو رسولؐ خدا کی جگہ سو رہے۔ خدا نے جبرئیلؑ اور میکائیلؑ سے فرمایا: میں نے تم میں سے ایک کی عمر طویل کر دی۔ کون اس بات پر آمادہ ہے کہ دوسرے کی زندگی کو اپنی زندگی پر ترجیح دے؟ کوئی تیار نہیں ہوا۔ تب ان سے کہا گیا کہ دیکھو علیؑ کس طرح اپنی جان رسولؐ خدا پر فدا کرنے کو آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس تاریخی رات کا نام لَیْلَۃُ الْمَبِیْت[2] ہے اور جو آیت اس بارے میں نازل ہوئی وہ یہ ہے: لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اپنی جان خدا کی خوشنودی کے عوض بیچ ڈالتے ہیں اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۰۷)۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۷ صفحہ ۳۲۱ [2] الغدیر جلد ۲ صفحہ ۵۳۔ بحار الانوار جلد ۳۶ صفحہ ۴۔ تفسیر نمونہ، جلد ۷ صفحہ ۳۲۲۔

امام کا گھر فرشتوں کے اترنے کی جگہ ہے

اس وقت جب میں یہ جملے لکھ رہا ہوں، ۲۱ رمضان ۱۴۰۴ھ کی رات ہے۔
بیجا نہ ہوگا اگر میں اس سلسلے میں امامت کے متعلق دو باتیں لکھوں جو میں نے حدیث سے سمجھی ہیں اور وہ یہ ہیں:

- شب قدر صرف کسی ایک سال میں نہیں بلکہ ہر سال میں آتی ہے۔
- اس رات میں قرآنی آیات کے مطابق فرشتے زمین پر اترتے ہیں۔
- رسول اکرمؐ کے زمانے میں یہ فرشتے آنحضرتؐ پر نازل ہوتے تھے۔
- پیغمبر اکرمؐ کے بعد جب شب قدر میں فرشتے نازل ہوتے تھے تو کس پر نازل ہوتے تھے؟
- کیا ہر معمولی انسان پر یا اس شخص پر جو خدا اور رسولؐ سے سب سے زیادہ قریب ہے؟

امام جعفر صادقؑ کے اس بیان سے جو اصول کافی میں درج ہے[1] مقام امامت اور ہر زمانے میں ایک معصوم امام کا زندہ اور موجود ہونا جو آسمانی فرشتوں کا مرجع ہو، ثابت ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔

امام علیؑ کے کچھ اور فضائل

پیغمبر اکرمؐ نے امام علیؑ کو بارہا اپنا بھائی کہا ہے[2]

---

[1] اصول کافی جلد ۱۔ صفحہ ۲۴۹ باب

[2] الغدیر جلد ۳۔ صفحہ ۱۱۵ - ۱۲۴

جنگ خندق میں امام علیؑ کے ایک وار کو تمام لوگوں کی عبادت سے بڑھ کر بتایا گیا ہے[1] امام علیؑ ہی وہ پہلے شخص تھے جو رسول کرمؐ پر ایمان لاتے[2]

اسلام میں پہلا سجدۂ شکر وہ تھا جو امام علیؑ بجالائے۔ وہ بھی اس موقع پر جب انھیں یہ توفیق نصیب ہوئی تھی کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کی جگہ سوئیں اور آنحضرتؐ سلامتی کے ساتھ اپنے گھر سے جو دشمنوں کے گھیراؤ میں تھا نکل کر مدینے کی جانب ہجرت کر جائیں۔[3]

بہت سی روایات میں امام علی علیہ السلام کا تعارف ایک مثالی انسان کے طور پر کرایا گیا ہے۔ وہ نہ کبھی حق سے جدا ہوئے اور نہ قرآن سے۔ وہ دنیا اور آخرت کے سردار ہیں۔ ان کے چہرے پر نظر کرنا عبادت ہے اور ان کے ماننے والے دنیا کے بہترین انسان ہیں۔

امام اور امت کے باہمی حقوق

بحار الانوار[4] میں اس سلسلے میں جو روایتیں بیان کی گئی ہیں ہم ان میں سے کچھ روایتیں "امام کا حق عوام پر اور عوام کا حق امام پر" کے عنوان سے اس جگہ نقل کرتے ہیں۔

امام علیؑ نے لوگوں سے فرمایا: میں اور تم آپس میں ایک دوسرے پر حق رکھتے ہیں تم پر میرا حق یہ ہے کہ تم:

۱۔ اپنے عہد و پیمان اور بیعت کے پابند رہو۔ اَلْوَفَاءُ بِالْبَیْعَةِ۔

---

[1] فخر رازی کی تفسیر جلد ۳۲ صفحہ ۳۱ شب قدر کی آیت کے ذیل میں۔ [2] الغدیر کی تیسری جلد میں اس مضمون کی ایک سو حدیثیں آئی ہیں۔ [3] کتاب فضائل الخمسہ من الصحاح الستہ میں یہ تمام فضائل اہلسنت کی روایات میں بیان ہوئے ہیں۔ [4] بحار الانوار جلد ۲۷ صفحہ ۲۵۱

۲۔ سامنے اور پیٹھ پیچھے میری خیر خواہی کرو وَالنَّصِيحَةُ فِي الْمَشْهَدِ وَالْمَغِيبِ

۳۔ جس وقت میں تمہیں بلاؤں جواب دو وَالْإِجَابَةُ حِينَ أَدْعُوكُمْ [1]

اور تمہارا حق مجھ پر یہ ہے:

۱۔ خیر خواہی اور ہمدردی

۲۔ بیت المال کا تحفظ

۳۔ تعلیم و تربیت۔

ایک اور حدیث میں ہم یوں پڑھتے ہیں:

امام علیؑ نے فرمایا وَلَكُمْ عَلَيَّ مِنَ الْحَقِّ مِثْلُ الَّذِي لِي عَلَيْكُمْ جس قدر تم مجھ پر حق رکھتے ہو اسی قدر میں بھی تم پر رکھتا ہوں [2]

اس جملے کے بعد امام بات کو یوں جاری رکھتے ہیں، سب سے بڑا حق جو خدا نے انسانوں پر واجب کیا ہے وہی باہمی حقوق ہیں جو والی کے لوگوں پر اور لوگوں کے والی پر واجب ہیں۔

امام سجادؑ اپنے رسالہ حقوق کی ابتدا میں امام کے حق کو سب سے زیادہ ضروری حق بتاتے ہیں وَأَوْجَبُهَا عَلَيْكَ حَقُّ أَئِمَّتِكَ۔

امام علیؑ نے فرمایا: تم جس طرح جابروں اور ظالموں سے بات کرتے ہو اس طرح مجھ سے بات نہ کیا کرو۔ رسم پرستی، بے توجہی اور خوشامد بھی نہ کرو اور یہ نہ سوچو کہ تمہاری یاد دہانیاں مجھے ناگوار گزرتی ہیں۔ جہاں تم سچی بات یا درست صلاح دیکھو مجھے آگاہ کردو۔ اگر خدا مجھے محفوظ نہ رکھے تو میں غلطی سے مبرا نہیں ہوں [3]۔ اسلام نے

---

[1] و [2] بحار الانوار جلد ۲۷ صفحہ ۲۵۱ [3] بحار الانوار جلد ۲۷۔ صفحہ ۲۵۳

امام کی شرائط اور صفات میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن امام کی پہچان اور تقرر کے بعد امام کی اطاعت کو مانتے ہوئے واجبات میں شمار کیا ہے[1]

امام صادق ؑ فیصلے (قضاوت) کی بحث میں لوگوں سے فقیہوں کی طرف رجوع کرنے کی سفارش کرتے ہیں اور حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں: جو کوئی ان فقیہوں کا فتویٰ اور فیصلہ نہیں مانتا اس نے گویا ہم کو نہیں مانا۔ جس نے ہم کو نہیں مانا اس نے گویا خدا سے شرک کیا۔[2]

ایک اور حدیث میں ہے کہ اگر کوئی راتوں کو نماز پڑھے، دن بھر روزہ رکھے، ہر سال مکے جا کر حج کرے اور اپنا تمام مال خدا کی راہ میں لٹا دے لیکن خدا کے ولی کو نہ پہچانے اور اپنے کام اس کی رہبری میں انجام نہ دے تو وہ خدا پر کوئی حق نہیں رکھتا۔[3]

امت کی ذمہ داری

حدیث میں ہے کہ لوگ اپنے امام معصوم کے بارے میں تین ذمہ داریاں رکھتے ہیں:

۱۔ اپنے امام کی پہچان اور وہ بھی ایسی صاف دلیلوں اور نمایاں صفات سے جو ایک معصوم رہبر میں موجود ہونا چاہئیں۔

۲۔ ان بزرگواروں کا حکم اس طرح ماننا کہ ان کی باتیں دل سے قبول ہوں۔

---

[1] اصول کافی میں امام کی اطاعت کے لازم ہونے پر بہت سی روایتیں بیان کی گئی ہیں۔

[2] اصول کافی۔ باب اختلاف الحدیث [3] سفینۃ البحار (ولی)

۴۔ اختلافی مسائل میں ان بزرگواروں کی طرف رجوع کرنا اور انھیں حکم اور منصف مقرر کرنا چاہیے۔[1]

حج کا آخری مقصد

امام محمد باقرؑ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ نے ان لوگوں کو دیکھا جو کعبے کا طواف کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: کعبے کے گرد چکر تو جاہلیت کے زمانے میں بھی لگایا جاتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے طواف اور حج کے مراسم مقرر کیے تاکہ اس طرح لوگ حج کے ساتھ ساتھ ہمارے گرد جمع ہوں اور ولایت محبت اور حمایت کا اعلان کریں۔ اس کے بعد امام باقرؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ۔

حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ لوگوں کے دل[2] کعبے کی طرف مائل کر دے بلکہ خدا سے یہ درخواست کی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں میری اولاد کی محبت پیدا کر دے جو معصوم ہے۔[3]

بہرحال حج کی ایک غایت امام کی جانب رجوع کرنا بھی ہے۔

دونوں جانب (امام اور امت) کی ذمہ داریوں کا پورا کرنا کچھ علامات رکھتا ہے۔ امام علیؑ ان علامات کی یوں تعریف فرماتے ہیں۔

۱۔ محبتوں اور قوتوں کا نظام۔ نِظَامًا لِاُلْفَتِهِمْ۔

---

[1] اصول کافی، جلد ۲ باب التسلیم [2] سورۂ ابراہیم، آیت ۳۷

[3] کافی باب رجوع بہ امام بعد انجام مناسک حج، صفحہ ۳۱۱

۲۔ تحریف، بدعت اور غفلت کے ہر قسم کے خطرے سے دین و مکتب کا بچاؤ
وَعِزًّا لِّدِيْنِهِمْ۔

۳۔ باطل ایک ایک کر کے میدان سے باہر نکل جاتا ہے اور امت کی امی محبت
کی بدولت امام کے ساتھ حق کی بنیاد مضبوط ہو جاتی ہے۔ وَعِزًّا لِّلْحَقِّ۔

۴۔ دین کی راہیں روشن اور صاف ہو جاتی ہیں وَقَامَتْ مَنَاهِجُ الدِّيْنِ۔

۵۔ انصاف کے پائے مضبوطی سے گڑ جاتے ہیں اِعْتَدَلَتْ مَعَالِمُ الْعَدْلِ

۶۔ تمام کام اپنے صحیح راستوں پر چل نکلتے ہیں جَرَتْ عَلٰى اَذْلَالِهَا۔

۷۔ امام اور امت کی طرف سے باہمی حقوق کی پاسداری حکومت کی بقا اور
دشمن کی مایوسی کا سبب بنتی ہے اس لیے امام اور امت میں سے ہر ایک
قانون کے مطابق عمل کرتا ہے۔ دشمن کی اثر اندازی کی راہ بند ہو جاتی
ہے اور برا چاہنے والوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔
طَمِعَ فِي بَقَاءِ الدَّوْلَةِ وَيَئِسَتْ مَطَامِعُ الْاَعْدَاءِ۔

غرض یہ اس وفاداری کے کچھ نتیجے ہیں جو امام اور امت باہم رکھتے ہیں۔[1]

تنوری شیعہ

خراسان کے ایک شخص نے امام صادقؑ کے سامنے مسلح جدوجہد کی تجویز
پیش کی اور کہا کہ آپ کے پاس ایک لاکھ افراد ہیں۔ امام نے ان کی جاں نثاری
کا اندازہ کرنے اور جانچنے کے لیے اس سے کہا: تم اس جلتے تنور میں اتر جاؤ۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۷ صفحہ ۲۵۱

اس نے کچھ پس و پیش کی۔ اسی بیچ میں امام کا ایک اور پیرو آیا اور اس نے امام کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ آپ نے اس سے فرمایا: اس جلتے تنور میں اتر جاؤ۔ وہ نہایت خوشی سے اتر گیا۔ امام نے خراسانی کی طرف منہ کر کے کہا ہمارے پاس ایسے تنوری شیعہ چند ایک ہی ہیں کہ ہم ان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ مان لیتے ہیں اور اعتراض نہیں کرتے، باقی تنوری شیعہ نہیں ہیں۔ ہاں دعوے اور عمل کے درمیان بہت فرق ہوتا ہے[1] ادھر حضرت کا وہ جاں نثار شیعہ تنور میں نہیں جلا بالکل اسی طرح جس طرح حضرت ابراہیمؑ آگ میں نہیں جلے تھے۔

جھوٹا شیعہ

ہم حدیث میں پڑھتے ہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں شیعہ علیؑ ہوں لیکن اپنے عمل میں وہ دوسروں کی رسیاں پکڑتا ہے، وہ جھوٹ بولتا ہے۔
كَذِبَ مَنْ زَعَمَ اَنَّهُ شِيْعَتُنَا وَهُوَ مُسْتَمْسِكٌ بِعُرْوَةِ غَيْرِنَا۔

معصوموں کی امامت کیسے کمزور پڑ گئی

امام صادقؑ کی حدیث میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ اگر بنی امیہ ایسے آدمی پیدا نہ کرتے جو اُن کی باتیں لکھتے، مال غنیمت جمع کرتے اور ان کی خاطر لڑائیاں لڑتے تو بنی امیہ ہمارا حق ہم سے چھین نہیں سکتے تھے۔ ہاں امامت کی کمزوری قوت ارادی نہ رکھنے والے وابستگان کے ہار مان لینے کی وجہ سے ہوتی ہے[2]۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۱ صفحہ ۱۳۹ [2] بحار الانوار جلد ۴۷ صفحہ ۳۸۲

ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کے دل معصوم اماموں کے ساتھ ہیں لیکن وہ خوف یا لالچ کی وجہ سے دوسروں کے پٹھو بن جاتے ہیں۔

زیادتیاں

امامت کے مسئلے، اماموں کے مکتب اور ان بزرگواروں کے سچے اطاعت گزاروں پر طرح طرح کے ظلم ہوئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان ظلموں کا بیان کہاں سے شروع کروں اور کسقدر بیان کرنا مناسب ہے تاہم ہمارے لکھنے کی بنیاد چونکہ مختصر طور پر اشارہ کرنے پر قائم ہے اس لیے ہم اس موقع پر بھی کچھ ظلموں کی فہرست پیش کرنے پر ہی قناعت کرتے ہیں۔

۱۔ معاشی ظلم

امام علیؑ سے فدک لے کر جس سے اس وقت کافی آمدنی ہوتی تھی ان کی مالی طاقت ختم کر دیگئی۔

۲۔ کردار کُشی

ہمارے مظلوم امام پر قسم قسم کی تہمتیں لگائی گئیں اور حد یہ ہو گئی کہ جب شام کے لوگوں نے یہ سنا کہ امام علیؑ کوفہ کی مسجد میں شہید ہو گئے تو کہنے لگے، علیؑ مسجد میں کیا کرنے گئے تھے؟ کیا وہ نماز پڑھنے والوں میں سے تھے!

۳۔ دشمن پیدا کرنا

امام کے دشمنوں کو بڑا بنا کر اور انکے مخالفوں کو قوت پہنچا کر آپ کو کمزور کر دینے

کا انتظام کیا گیا۔

۴۔ عقلی اور فکری ظلم

حَسْبُنَا کِتَابُ اللہِ (ہمارے لیے قرآن ہی کافی ہے) کا نعرہ لگا کر رسول اکرمؐ کی حدیثوں کے بیان کو روک دیا گیا۔ امام معصومؑ کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا دی اور لوگوں کو علم کے اصلی سرچشموں سے محروم کر دیا۔

۵۔ خیر خواہوں کو محروم کر دینا

اسلامی مالیات میں سے رسول اکرمؐ کے قریبی عزیزوں اور اہل بیتؑ کا حصہ خارج کر دیا گیا۔

۶۔ جھوٹ گھڑنا

ابوہریرہ جیسے لوگوں کے ذریعے جعلی حدیثیں گھڑنے کا کام شروع کر دیا گیا چنانچہ بنی امیہ کی تعریف اور بنی ہاشم کی مذمت کے علاوہ دیگر مسائل کے بارے میں اتنی جھوٹی حدیثیں گھڑی گئیں کہ ایک جماعت کے لیے جھوٹ اور سچ کی پہچان کا راستا مشکل بنا دیا۔

۷۔ تحریف اور توجیہہ

امامت اور رہنمائی کے مسئلے کے متعلق صاف اور واضح بیانات کو اتنا توڑا مروڑا اور ان کی ایسی ایسی تشریح اور تاویل کی کہ وہ بالکل بے کار ہو گئے۔

۸۔ طریقے کی تبدیلی

معصوم کی امامت کے مسئلے کو جو خدائی عہد و پیمان تھا اتنا نیچے گرایا کہ اسے یزید کی سی حکومت کی سرحد تک پہنچا دیا۔

۹۔ عالم کی جگہ جاہل

تمام خدائی قدروں اور پیمانوں کو مہمل بنا دیا۔ ہر شخص نے طاقت اور ہر ہنگامہ پر جدھر چاہا معاشرے کا رُخ پھیر دیا۔ ایسے رہبر کی جگہ پر جو کہتا تھا (سَلُوْنِیْ) کہ جو چاہو پوچھ لو میں اس کا جواب دوں گا' وہ لوگ ایسے رہبر کے پیچھے چل دیے جو کہتا تھا (اَقِیْلُوْنِیْ) مجھے چھوڑ دو میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کے علم کے دروازے کے بجائے ایسے شخص کے پیچھے چل دیے جو کتنی ہی بار طرح طرح کے مسائل میں مجبور ہو کر علیؑ سے مدد مانگنے لگتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر علیؑ میری مدد کو نہ پہنچتے اور مجھے مشکلوں سے نہ نکالتے تو میری تباہی یقینی تھی۔

۱۰۔ بہانے اور دشمنیاں

ایک بہانہ یہ بنایا گیا ہے کہ علیؑ نوجوان ہیں' ہنسوڑ ہیں۔ اکثر مسلمان ان سے خیبر' بدر' احد اور حنین کی لڑائیوں کے سلسلے میں بہت پرانا بیر رکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے آج کے بہت سے مسلمانوں کے کافر باپوں کو پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے ان لڑائیوں میں مار ڈالا تھا۔ ہاں ان دشمنیوں' کینوں اور بہانوں نے امام معصومؑ کو گھر میں بٹھا دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ نے فرمایا مجھ پر پہلے دن سے ہی

ظلم کیا گیا۔[1] اگرچہ جتنے فضائل علیؑ کے بیان ہوئے ہیں اتنے رسول اکرمؐ کے کسی اور صحابی کے بیان نہیں ہوئے مگر اس کے باوجود ان کو ایک طرف ہٹا دیا گیا۔
سچ کہیے کیا ہنوز ہونا لائق ہونے سے روکتا ہے؟ کیا پیغمبر اکرمؐ نے اپنی آخری عمر میں اسامہ نامی ایک اٹھارہ سالہ نوجوان کو لشکر کی سالاری نہیں بخشی تھی؟ جس میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بھی شامل تھے؟ کیا رہبری کے لیے بڑھاپے اور سن رسیدگی کی شرط ہوتی ہے؟ کیا قرآن نے علم، تقویٰ، جہاد، ہجرت، خدمات، اخلاص اور ایمان کو انسانی قدر و قیمت کا معیار مقرر نہیں کیا؟ پھر ہم کس لیے خدائی بنیادوں کے خلاف ہو گئے اور ہم نے دوسرے ہی مسائل پیش کر دیے؟

۱۱۔ خود امام ایک طرف ہٹ گئے

سب سے اہم بات یہ ہے جو وہ کہتے ہیں کہ امامؑ نے علمی اور معنوی رہبری پر قناعت کر لی تھی اور سیاسی اور فوجی رہبری دوسروں کے لیے چھوڑ دی تھی۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا پوری کتاب نہج البلاغہ میں امام علیؑ کی پکاریں صرف اس لیے تھیں کہ لوگ آئیں اور امامؑ سے مسئلہ دریافت کریں؟ کیا مسئلہ پوچھنے کے لیے بیعت کی ضرورت پڑتی ہے؟ امام نے دسیوں بار اپنے سیاسی حق کے تلف ہونے کی شکایت کی ہے۔ اس بات کی شکایت نہیں کی کہ لوگ مجھ سے علمی سوال کیوں نہیں کرتے؟ لوگ امام سے علمی سوال کرنے کے لیے تو مجبور تھے اور کرتے رہتے تھے۔

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۲۷ صفحہ ۲۰۹

۱۴۔ امام کو چھوڑ دینے میں ضرور کوئی مصلحت تھی

جی جلتا ہے جب لوگ یہ کہتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ سب لوگ غلطی کر بیٹھیں اور امام کو چھوڑ کر دوسرے کے پاس چلے جائیں۔ اس بات سے کہ لوگوں نے امام کو چھوڑ دیا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی بہتری رہی ہوگی۔ اس بات کا جواب یہی ہے کہ اولاً تو سب لوگوں نے امام علیؑ کو نہیں چھوڑا اور دوسرے یہ کہ کیا اکثریت سچائی کی دلیل ہوتی ہے؟ کیا قرآن کے واضح پیمانوں کو چھوڑ دینا چاہیے اور لوگوں کے عمل پر نظر رکھنا چاہیے؟ ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ سورۂ جمعہ کی آخری آیت سے بے خبر ہو چکے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نماز جمعہ کا خطبہ پڑھنے میں مصروف تھے کہ یکایک سوداگروں کا ایک قافلہ آ پہنچا اور انھوں نے ڈھول پیٹنا شروع کر دیا۔ اکثر لوگ رسول اکرمؐ کو مسجد میں چھوڑ چھوڑ کر بھاگے اور سوداگروں کے قافلے کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان لوگوں میں سے صرف چند افراد پیغمبر اکرمؐ کا خطبہ سننے کو رہ گئے۔ کیا پیغمبرؐ کو یوں چھوڑ دینا مناسب تھا؟

طرح طرح کے ظلم

امام معصومؑ پر ظلم برابر جاری رہا۔ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے وقت سے جب آپ نے قلم اور کاغذ مانگا تھا اور آپؐ سے گستاخی کی گئی اور امامؑ کا حق تلف کیا گیا تھا، یہ مظلومیت بدستور امام علیؑ کی عمر کے آخر تک جاری رہی۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ علیؑ کا مرتبہ ابھی تک پہچانا نہیں جا سکا اور وہ اب بھی

مظلوم ہیں۔ ان کی کتاب نہج البلاغہ کو بھی لوگ ابھی تک پہچان نہیں پائے ہیں اس لیے ان کی مظلومیت ان کی عمر بھر کی نہیں بلکہ پورے عہد تاریخ پر محیط ہے۔ ہمارے اماموں پر جو ظلم ہوتا تھا وہ کبھی باہر سے اور کبھی نالائق ساتھیوں کی طرف سے ہوتا تھا۔ ہمارے امامؑ معصوم پر جو ظلم ہوا وہ شکایت کے قابل بھی نہیں تھا اس لیے کہ علیؑ کی شکایت سے حکومت اسلامی کی بنیاد ڈھے جاتی اس لیے انھوں نے ایسے شخص کی مانند صبر کیا جس کی آنکھ میں کانٹا کھٹکتا ہو یا گلے میں ہڈی اٹک گئی ہو۔ امام معصوم پر جو ظلم ہوا اس کا تعلق صرف دل، زبان، عمل یا قلم سے ہی نہیں تھا بلکہ وہ ہر قسم کا ظلم تھا جس کی تشریح طویل ہے۔ ہمارے امامؑ پر جو ظلم ہوا وہ مذہب کا نام لیکر اور خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ہوا یہاں تک کہ لوگ خطبوں میں، منبروں پر، سب کے سامنے، تنہائی میں اور حالت نماز میں آپ کو برا کہتے تھے۔ ہمارے اماموں پر جو ظلم ہوتا تھا وہ ان وسائل سے ہوتا تھا جو لوگ خود اماموں ہی سے حاصل کرتے تھے۔ انھیں سے علم، مرتبہ اور قوت پاتے تھے اور اسے انھیں کے خلاف استعمال کرتے تھے۔

ہمارے اماموں پر ان کے نادان دوستوں کی جانب سے بھی ظلم ہوا اور عقلمند دشمنوں کی طرف سے بھی۔ ایک طرف ڈرپوک، بے پروا، جاہل اور احمق دوست اور دوسری طرف منافق اور چالاک دشمن۔

قلمی ظلم

معلوم نہیں کس وجہ سے اہل سنت میں سے بعض مشہور اشخاص نے جو امام کاظمؑ کے ہمعصر تھے، آپ سے ایک حدیث بھی نقل نہیں کی۔ کیا امام کاظمؑ

کو ایک معمولی راوی کے برابر بھی نہیں سمجھنا چاہیے؟ میں نہیں جانتا کہ صحیح بخاری جیسی نہایت اہم کتاب جو کچھ خارجیوں سے بھی حدیث نقل کرتی ہے اور ایک سو گمنام لوگوں کی باتوں کو شرعی سند دیتی اور ان کے اقوال کو قابل اعتبار سمجھتی ہے، وہ امام جعفر صادقؑ اور ان کے بعد آنے والے معصوم اماموںؑ سے کوئی حدیث کیوں نہیں نقل کرتی؟

کیا سب لوگ اس بات کو نہیں مانتے کہ پیغمبر اکرمؐ نے لوگوں سے قرآن کے ساتھ ساتھ اپنے اہل بیتؑ کا تعارف کرایا تھا؟

اس سے قطع نظر کہ یہ اختلافات زیادہ ہیں اور ہمارا آج کا کام یہ ہے کہ شکایتوں سے چشم پوشی کریں اور اپنے اصلی اور مشترک دشمن کے مقابلے میں متحد ہو جائیں۔ علمی اختلافات تو خود اہل سنت میں بھی ہیں۔ شیعہ دانشوروں میں بھی اور سنی اور شیعہ کے درمیان بھی لیکن یہ علمی اختلافات، جدائی، چھوٹم چھاٹ اور نفاق کا سبب نہیں بننا چاہئیں کیونکہ نفاق کی آگ سب کو بھسم کر ڈالے گی۔

شیعوں پر ظلم اور بہتان

سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ شیعوں پر طرح طرح کے اتہام لگانے سے باز کیوں نہیں آتے؟ ان کثیر تعداد تہمتوں کی رد میں جو ہم پر لگائی گئی ہیں ہم نے اپنے عقیدے نہ صرف ہزاروں کتابوں کے اوراق میں اور نہ صرف مسجدوں میں بلکہ خود اس ناچیز نے جو ایک معمولی سا طالب علم ہے ایران کے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بار بار بیان کیے ہیں اور اب بھی لکھتا ہوں۔

شیعہ اس بات کو قطعی نہیں مانتے کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے۔

شیعہ اپنے اماموں کو ہرگز خدا نہیں مانتے۔

بہائی اور بابی لوگ شیعوں میں قطعی شامل نہیں ہیں۔

شیعہ چاروں کتابوں (کافی، من لایحضرہ الفقیہہ، تہذیب، استبصار) پر عمل کرنا ہرگز واجب نہیں سمجھتے البتہ انھیں بہترین کتابوں کی فہرست میں شمار کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ ان میں جو کچھ درج ہے وہ قطعی اور ناقابل انکار ہے اور اسی پر عمل کرنا واجب ہے۔

شیعہ آنحضرتؐ کے تمام اصحاب کو مرتد نہیں سمجھتے بلکہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس طرح آنحضرتؐ کی حیات کے دوران میں حقیقی مومن بھی تھے اور منافق بھی تھے، اسی طرح ان کے بعد بھی رہے۔ رسول اکرمؐ کی وفات منافقوں کو مومن نہیں بنا سکی اس لیے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے تمام صحابی سچے مومن اور انصاف پسند تھے وہ بتائیں کہ رسول اکرمؐ کے دورانِ حیات کے منافقین آپ کی وفات کے بعد کہاں چلے گئے۔

کیا اکثر لوگوں کا حق کو چھوڑ دینا ممکن ہے؟

جو لوگ قرآن کے معنی و مفہوم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے بھائی اور بزرگ پیغمبر حضرت ہارونؑ کو چھوڑ کر گائے کے بچھڑے کے گرد جمع ہو گئے اور اس کی پوجا کرنے لگے۔

بے شک جب تک لالچ، خواہش، شیطان اور وسوسے موجود ہیں کام میں ہر قسم کے خطرے اور خلل کا امکان باقی ہے۔

اپنی ایسی اچھی کارکردگی، جہاد اور نماز کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لوگ حق سے پھر جائیں؟

قرآن نے اس کا جواب دیا ہے اس لیے کہ قرآن صرف عبادت نہیں بلکہ عبودیت (بندگی) کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ ابلیس نے ہزاروں سال تک عبادت کی لیکن جب عبودیت کی منزل آئی تو لنگڑا ہو گیا۔ قرآن میں اعمال کے مٹ جانے کا ذکر موجود ہے۔ کیا بلعم باعور خدا کی خاص مہربانی کا مستحق نہیں بن چکا تھا؟ وہ کس طرح اس کے غضب کا نشانہ بن گیا؟ ہاں انسان کے لیے برے انجام کا معاملہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے جو سب کو ڈراتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کنوئیں میں گرے، قید خانے میں گئے، غلامی میں گرفتار ہوئے لیکن انھوں نے کہیں بھی خطرہ محسوس نہیں کیا البتہ جب وہ اعلیٰ مرتبے اور حکومت پر پہنچے تو خدا سے دعا مانگی کہ میں اسلام پر مروں گمراہ نہ ہو جاؤں۔ (تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا) اسی لیے کسی کام کا انجام اور نتیجہ بڑا اہم ہوتا ہے حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ میری نظر میں کام کی بنیاد پہلا آجر نہیں آخری آجر ہے۔

شیعوں اور سنیوں کی مطابقت

اگر آپ نے شیعوں اور سنیوں کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو دیکھا ہوگا کہ امام علیؑ کے تقریباً وہ تمام فضائل جو شیعہ بیان کرتے ہیں علمائے اہلسنت نے بھی نقل کیے ہیں اور اگر شیعوں نے بعض صحابہ پر اعتراض کیے ہیں تو ہم وہی اعتراضات خود اہلسنت کی کتابوں میں بھی دیکھتے ہیں۔

جائز اور ناجائز ولایت اور رہبری

ناجائز ولایت اور رہبری

قرآن میں رہبری کے مسئلے پر زیادہ زور دیا گیا ہے' اس کے اچھے پہلو پر بھی اور بڑے پہلو پر بھی۔ اچھے پہلو میں رسول اکرمؐ اور اولی الامر کی پیروی کو واجب اور خدا کی پیروی کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی سفارش کی گئی ہے کہ خدا' رسولؐ اور اولی الامر کے علاوہ جامع شرائط فقیہوں کی اطاعت بھی کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص ان کے کسی فتوے اور حکم کو ٹالتا ہے تو گویا امامؑ اور رسول اکرمؐ کے فرمان کو رد کرتا ہے اور خدا کے ساتھ شرک کا مرتکب ہوتا ہے[1]

یہ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں ان لوگوں کی ایک فہرست مرتب کردیں جنھیں مختلف جماعتوں کا امام اور رہبر نہیں ہونا چاہیے اور لوگوں کو ان کی اطاعت اور پیروی نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ ایک عقلمند انسان جو پابندی اور دباؤ سے آزاد ہو وہ اپنی خداداد فطرت سے ہی سمجھ جائے گا کہ یہ لوگ رہبری کی لیاقت نہیں رکھتے لیکن اس لحاظ سے کہ قرآن خبردار کرنے والی کتاب ہے' اسے انسانوں کو خطروں سے آگاہ کرنا چاہیے چنانچہ یہ ہیں وہ آیات جنھیں ہم اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

۱۔ ایسے لوگوں کی رہبری ناجائز ہے جو غفلت شعار' عیاش اور انتہا پسند ہیں[2]

---

[1] وسائل۔ جلد ۱۸۔ صفحہ ۹۹ [2] سورۂ کہف۔ آیت ۲۸۔

ہم نے جن لوگوں کے دل کو (ان کے خراب کام کے باعث) اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے، جو حق کی جگہ پر اپنی ہی ہوسوں اور خواہشوں کے پیرو، حق اور میانہ روی کے راستے سے الگ، حد کو توڑنے والے اور انتہا پسند ہیں ان لوگوں سے دور رہنا چاہیے اور ان کی پیروی نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ ایسے لوگوں کی بھی اطاعت مت کرو جو گھمنڈ اور غرور کی وجہ سے حق کی طرف توجہ نہیں دیتے اور حقیقتوں کو جھٹلاتے ہیں (سورۂ قلم۔ آیت ۸)۔

۳۔ ایسے کم ظرفوں کی بھی پیروی مت کرو جو پے در پے قسمیں کھاتے ہیں، ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور معاشرے میں اپنی جھوٹی شان جتاتے ہیں (سورۂ قلم آیت ۱۰)۔

۴۔ گناہگار اور ناشکرے کی پیروی بھی نہیں کرنا چاہیے (سورۂ دہر۔ آیت ۲۴)۔

۵۔ فضول خرچ لوگوں سے بھی دور رہنا چاہیے (سورۂ شعراء۔ آیت ۱۵۱)۔

۶۔ فسادیوں کے طریقے کی پیروی نہ کرو (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۴۲)۔

۷۔ جاہل لوگوں کی خواہشات کی بھی پیروی نہ کرو (سورۂ جاثیہ۔ آیت ۱۸)۔

۸۔ ایسے لوگوں کی بھی پیروی مت کرو جو پہلے گمراہ رہ چکے ہیں اور اب بھی اپنی خواہشوں اور جبلتوں کے غلام ہیں (سورۂ مائدہ۔ آیت ۷۷)۔

آپ مندرجہ بالا آیات پر دوبارہ غور فرمائیے کہ افراد اور گروہ، گناہ، فضول خرچی، جھگڑالو پن، جہالت، غلط کارکردگی، کفر و گناہ اور کمینہ پن کی وجہ سے کس طرح رہبری کے زمرے سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ہم ان آیتوں سے اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں کہ امام اور رہبر کو مندرجہ بالا تمام برائیوں سے دور رہنا چاہیے۔

قرآن کی دوسری آیتوں میں مسلمانوں پر یہودیوں اور عیسائیوں کی حکومت اور اسی طرح دشمنان خدا یا منافقوں کی حکومت، اختیار اور سرپرستی جو دین اور مکتب کو اپنی حکومت قائم رکھنے کا بہانہ بنا لیتے ہیں ناجائز بتائی گئی ہے۔
(سورۂ مائدہ - آیت ۶۲)۔

اولی الامر کون ہے؟

ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ اے ایمان والو! خدا، رسولؐ اور صاحبانِ فرمان کی اطاعت کرو (سورۂ نساء آیت ۵۹)۔

کیا ان صاحبانِ فرمان کا کام جن کا ذکر خدا اور رسولؐ کے ساتھ ساتھ آیا ہے، خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق نہیں ہونا چاہیے؟

کیا یہ درست ہے کہ ایک ہی جملے میں ہم سے یہ کہا جائے کہ خدا اور رسولؐ کے پیرو بنو اور ان کی مخالفت نہ کرو اور فوراً ہی یہ سفارش کر دی جائے کہ صاحبانِ فرمان کی پیروی کرو جو روزانہ خدا اور رسولؐ یا قرآن کی سیکڑوں خلاف ورزیاں کرتے ہیں؟ کیا ایک ہی جملے میں یہ تضاد درست ہے؟

بے شک اولی الامر انھیں معصوم اماموں کو ہونا چاہیے جن کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت ہو گی اور جن میں کسی قسم کا کوئی علمی یا عملی اختلاف نہیں ہو گا اور جو عصمت کی انتہائی بلندی پر متمکن ہوں گے۔ اگر اولی الامر، امام معصومؑ کے علاوہ کوئی اور ہو گا تو حقیقت یہ ہے کہ پھر ایسے صاحبان فرمان کی پیروی کا حکم قطعی اور ہر موقع کے لیے نہیں ہو گا بلکہ والدین کی

پیروی کی طرح کسی نہ کسی شرط سے وابستہ ہوگا[1] اس کی وضاحت یوں ہے کہ لوگوں سے اپنے اپنے والدین کی اطاعت اور ان پر احسان کرنے کی سفارش کی گئی ہے لیکن ہر جگہ نہیں کیونکہ اگر والدین نے چاہا کہ بیٹے کو توحید کے دائرے سے نکال دیں تو ایسی صورت میں ان کا حکم ماننا ناجائز ہوگا۔ وَاِنۡ جَاهَدٰكَ لِتُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۸، سورۂ لقمان۔ آیت ۱۵)۔

غور فرمایئے کہ والدین کی اطاعت ہر موقع کے لیے واجب نہیں ہے بلکہ صرف ان موقعوں کے لیے ہے جہاں وہ اپنی اولاد کو راہ اسلام سے نہ بھٹکائیں لیکن اولی الامر کی اطاعت بے قید و شرط اور ہر موقع کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولی الامر کو قرآن کے نقطۂ نظر سے کسی قید یا شرط کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا بھٹکنا یا کسی کو بھٹکانا عملی طور پر ناممکن ہے۔

اس لیے قرآن میں اولی الامر سے وہی پیشوا مراد ہیں جو تین سو حدیثوں کی رو سے جنھیں شیعوں اور سنیوں نے نقل[2] کیا ہے بارہ ہستیاں ہیں۔

ولایت فقیہہ

ولایت فقیہہ امامت کے سلسلے کا دوام ہے۔ اس سے متعلق سیکڑوں حدیثوں

---

[1] اولی الامر دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جس کی اطاعت مطلق ہے اور دوسرا وہ جسکی اطاعت مشروط ہے ہماری کتاب "اسلام دین حکمت" صفحہ ۴۴۳ پر ان شرائط کا ذکر کیا گیا ہے لیکن خلیفۃ الرسولؐ کی تعداد فقط بارہ ہے۔ اس سلسلے میں تفصیل کے لیے علامہ مرتضیٰ عسکری کی کتاب "احیائے دین میں ائمۂ اہلبیتؑ کا کردار" ملاحظہ فرمایئے۔ [2] حجۃ الاسلام لطف اللہ صافی جلاء البصر نامی کتاب میں فرماتے ہیں کہ شیعوں اور سنیوں نے تین سو حدیثیں نقل کی ہیں جن میں کہا گیا ہے (جاری ہے)

کے مطابق جو پیغمبرؐ کے بزرگ صحابہ نے نقل کی ہیں معصوم اماموں کی تعداد بارہ ہے۔ یہ تمام بزرگ ہستیاں زہر دیکر یا تلوار سے شہید کی گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے زمانے کے طاغوتوں سے بے جگری سے لڑتے تھے۔

ہمارے بارھویں امام حضرت مہدیؑ غائب ہیں اور سیکڑوں معتبر حدیثوں کے مطابق دنیا میں ایک منصفانہ حکومت قائم کرنے کے لیے ظاہر ہوں گے۔

چونکہ لوگ ابھی ان کی رہبری قبول کرنے کے لائق نہیں ہیں اس لیے خدا نے آپ کو مناسب وقت تک کے لیے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ جی ہاں جیسے حکومت نے لوگوں کے لیے گیارہ چراغ روشن کیے اور لوگوں نے انھیں بجھا دیا تو اب حکومت پردے میں ان کی حفاظت کرتی ہے اور بارھواں چراغ اس وقت تک نہیں جلائے گی جب تک کہ ان لوگوں کی پختہ فکری، تمدن اور کلچر اس حد تک ترقی نہیں کر لیتا کہ وہ نور کو سمجھ سکیں اور اس سے فائدہ اٹھا سکیں؛ ایسے ہی خدا نے بھی گیارہ معصوم امام بھیجے۔ لوگوں نے ان سب بزرگواروں کو اذیتیں پہنچائیں، قیدی بنایا اور تلواروں سے شہید کر ڈالا تو خدا نے بارھویں امام کو مناسب وقت تک کے لیے اپنی حفاظت میں رکھ لیا لیکن دوسری جانب حضرت مہدیؑ کی غیبت کے زمانے میں ہمیں بھی ہمارے حال پر نہیں چھوڑا ہے بلکہ ہم کو عادل، متقی اور اسلام شناس فقیہوں کے سپرد کر کے اس کے بارے میں سخت تاکیدیں کر دی ہیں۔

اس لیے تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے اسلامی نظام کی حفاظت کریں اور تمام امور میں خدا کے اس حکم پر توجہ دیں جو عادل فقیہ کی زبان سے جاری ہوتا ہے۔

کہ رسول اکرمؐ کے بعد اماموں کی تعداد بارہ ہو گی۔

اسلام ایسے مالیاتی، اقتصادی، تعزیری، انتظامی اور عدالتی قوانین رکھتا ہے کہ نہ تو انھیں معطل رکھنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ انھیں جاری کرنے کا اختیار جاہل اور خود غرض لوگوں کے سپرد کرتا ہے نہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی بھی طرح کا کوئی طبقہ لوگوں پر حکومت کرنے لگے بلکہ اس نے ان قوانین کے جاری کرنے کا کام صرف فقیہوں اور متقی اسلام شناسوں کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ تمام واقعات و حوادث میں خدائی قانون کے مطابق حکم دیں۔ لوگوں پر ان فقہا کی اطاعت اسی طرح واجب ہے جس طرح امام معصومؑ اور رسول اکرمؐ کی اطاعت واجب قرار دی گئی ہے۔

ولایت فقیہہ کا کردار

کیا مسلمانوں کو کسی نظام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ کیا اسلامی مُلک کی حفاظت ہونا چاہیے یا نہیں؟ زمینوں کی چوکسی ہونا چاہیے یا نہیں؟ اسلامی ملک میں قوانین جاری ہونا چاہیئں یا نہیں؟ مظلوم کا حق ظالم سے لینا چاہیے یا نہیں؟ اسلام کی آواز دنیا بھر میں پہنچنا چاہیے یا نہیں؟ ہمارے نبیوں اور اماموں کی کوششیں صرف انھیں کے زمانوں کے لیے تھیں یا سب زمانوں اور سرزمینوں کیلئے تھیں؟

اگر اس کا جواب ہاں میں ہے اور اسلام اپنا سماج، قانون اور نظام رکھتا ہے اور حقوق کی پاسداری اور زمینوں کی حفاظت ہونا چاہیے تو پھر حکومت بھی اسلامی ہونا چاہیے کیونکہ صحیح اصول کے مطابق مرتب کیے ہوئے اور بالکل درست نظام کے بغیر اور بالخصوص ہمارے زمانے میں جبکہ اسلام کے تمام مخالفوں کے پاس بہت بڑے بڑے اور ٹاٹکوں ٹاٹک ٹھیک نظام موجود ہیں تو ہم

اپنے مکتب، قانون، ملک، جان، مال اور عزت کا بچاؤ نہیں کر سکتے؟ اگر حکومت ضروری ہے تو حاکم بھی لازمی ہے کیونکہ حاکم کے بغیر حکومت کا قیام اور بقا ناممکن ہے۔ اب جو اسلام کو اپنے قوانین نافذ کرنے کے لیے حکومت بھی چاہیے اور حاکم بھی تو پھر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ حاکم میں کون کون سی خصوصیات ہونا چاہئیں۔ وہ خدائی حکم کی گہرائی تک پہنچ پاتا ہو یا نہیں۔ عادل ہو یا نہیں۔ مشکلات اور مسائل سے واقف ہو یا نہیں۔ اگر یہ ضروری ہے کہ حاکم اسلام شناس ہو، متقی اور پرہیزگار ہو اور سیاست دان بھی ہو تو پھر یہ وہ فقیہہ ہوگا جس کی حکومت کو ہم ولایت فقیہہ کہتے ہیں۔

جو لوگ ولایتِ فقیہہ کے نظریے کو نہیں مانتے انھیں چاہیے کہ وہ مندرجہ ذیل خیالات میں سے کسی ایک کو تسلیم کر لیں:

۱۔ یا وہ یہ کہیں کہ اسلام صرف نماز، روزہ یعنی محض انفرادی عبادات اور اخلاقیات کا نام ہے اور اس میں بڑے بڑے سماجی حقوق، عدالتی، سیاسی اور اقتصادی مسائل شامل نہیں ہیں۔

۲۔ یا وہ یہ کہیں کہ اسلام صرف رسول اکرمؐ کے زمانے کے لیے تھا اور اس کے بعد چھوڑ دیا گیا اور اب اس کے اہم سماجی قوانین صرف کتابوں میں مدفون ہیں۔

۳۔ یا وہ یہ کہیں کہ اسلام کے اہم سماجی قوانین جاہل اور فاسق لوگوں کے ہاتھوں جاری ہوں۔

اگر مندرجہ بالا خیالات میں سے کوئی ایک بھی قابل قبول نہیں ہے تو پھر ہمیں ولایتِ فقیہہ کو مان لینا چاہیے جس کا مطلب ہے انسانی مسائل و مشکلات

سے واقف اور متقی اسلام شناسوں کے ہاتھوں خدائی احکام کا نفاذ اور ہم یہ سوچیں کہ متقی اسلام شناسوں کی حکومت اور نظارت یعنی ولایت فقیہ اس معنی میں قابل انکار نظر آئے گی۔

کیا اصول کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول نہیں ہے کہ قرآن میں سماج کی تمام انفرادی اور اجتماعی ضرورتیں بیان کی گئی ہیں تو کیا حکومت، حاکم، نظام اور محکمے سماج کی اہم ترین ضروریات میں شامل نہیں ہیں[1]؟

رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اپنی موت سے پہلے امت کی تمام ضروریات بیان کر دیں۔

کیا حضرت امام مہدیؑ کی غیبت کے زمانے میں اسلامی معاشرے کو حاکم اور حکومت کی ضرورت نہیں ہے[2]؟

امام رضا علیہ السلام رہبری کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے اپنی گفتگو میں یوں فرماتے ہیں:

کوئی قوم اور امت کسی رہبر کے بغیر نہیں ہے اور سماج کا ڈھانچہ ایک رہبر کے وجود سے وابستہ ہوتا ہے تاکہ لوگ اس کے حکم پہ بیت المال کے جمع خرچ کا کام بھی کریں، خدا کے دشمنوں سے لڑنے کو بھی کھڑے ہو جائیں، معاشرے کی تنظیم بھی کریں اور اسے اختلاف اور نفاق سے بھی بچائیں اور اگر امت کا کوئی ایسا رہبر نہیں ہوگا تو قوم پارہ پارہ ہو جائے گی۔ خدائی قوانین رسول اکرمؐ کی ہدایات اور فرمان الٰہی طاغوت کے اشارے پر بدل دیے جائیں گے[3]۔

---

[1] اصول کافی۔ جلد ۱۔ صفحہ ۵۹ [2] کتاب بیع آیت اللہ خمینی۔ صفحہ ۴۶۲

[3] بحار الانوار۔ جلد ۶۔ صفحہ ۶۰

آپ دیکھتے ہیں کہ امام رضا علیہ السلام کے بیان میں رہبری اور حکومت کا مسئلہ زندگی کے اہم ترین مسئلے کے عنوان سے پیش ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ غریبوں کے فائدے کے لیے مالیات پر قبضہ، اس کی منصفانہ تقسیم، دشمنوں سے جنگ اور سماجی اداروں کی تنظیم ایسی باتیں نہیں ہیں جو صرف معصوم اماموں کی موجودگی کے وقت سے ہی تعلق رکھتی ہوں اور امام عصرؑ کی غیبت کے زمانے میں اس امت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے یعنی مندرجہ بالا مسائل سے عہدہ برا ہونے کے لیے حکومت اور حاکم کی ضرورت نہ ہو۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سماج کے وجود اور اس کے لیے حکومت اور حاکم کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن مشکل اس بات میں ہے کہ حاکم کے لیے شرائط کیا ہوں، طرز حکومت کیسا ہو اور یہ سب کچھ کیسے ہونا چاہیے؟

عقلی دلیلوں اور اسلام کی بہت سی روایتوں کے مطابق بارِ حکومت کو فقیہ عادل کے کندھوں پہ ڈال دینا چاہیے چنانچہ ہم بعض روایتوں کے اقتباسات اس جگہ نقل کرتے ہیں:

۱۔ رسول اکرمؐ فقیہوں کو اپنا خلیفہ سمجھتے تھے۔[۱] اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِیْ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَنْ خُلَفَاؤُکَ؟ قَالَ: اَلْفُقَھَاءُ۔

۲۔ امام کاظمؑ نے فرمایا: فقہا اسلام کے قلعے ہیں۔[۲] اَلْفُقَھَاءُ حُصُوْنُ الْاِسْلَامِ

---

[۱] وسائل جلد ۱۸ باب ۱۱ صفات قاضی صفحہ ۱۰۱۔

[۲] کتاب البیع از آیت اللہ خمینی۔

۳۔ امام آخر الزماں حضرت مہدی علیہ السلام نے اپنے دستِ مبارک سے ایک خط کے جواب میں یوں لکھا: تمھیں چاہیے کہ زندگی کی مشکلات اور مصائب کے بارے میں ہمارے راویوں سے رجوع کرو کیونکہ وہ اسی طرح تم پر ہماری حجت ہیں جس طرح ہم اللہ کی حجت ہیں۔[1]

۴۔ امام صادقؑ سے ان معاملات کے بارے میں سوال کیا گیا جن کے فیصلے کے لیے طاغوتی محکمے اور نظام کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا کہ ان محکموں کی طرف رجوع کرنا اس لیے بُرا ہے کہ گویا طاغوت سے رجوع کرنا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص ان طاغوتی محکموں سے اپنا جائز حق بھی حاصل کر لیتا ہے تو وہ بھی حرام ہو جاتا ہے۔[2] بلکہ ایسے موقعوں پر تمھارا فرض یہ ہے کہ صرف ایسے لوگوں سے اپنی مشکل کا حل دریافت کرو جو ہمارے علوم اور روایات کو بخوبی جانتے اور پہچانتے ہوں کیونکہ میں ان کو تمھارے لیے قاضی اور منصف قرار دیتا ہوں۔ تمھیں جان لینا چاہیے کہ اگر اس (قاضی یا منصف) نے حکم دیا اور تم نے اسے بے وقعت جانا تو حقیقت میں تم نے خدا کے حکم کو حقیر سمجھا۔ جو کوئی ان فقہا کو رد کرے گا گویا اس نے ہمیں رد کر دیا اور ہمیں رد کر دینا خدا کو رد کر دینا ہے اور یہ فعل خدائے بزرگ کے ساتھ شرک کے برابر ہے۔[3]

---

[1] وسائل جلد ۱۸ باب ۱۱ صفات قاضی۔ صفحہ ۱۰۱ [2] شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ طاغوتی محکمے سے رجوع کرنا اس نظام کو مان لینے اور اسے مضبوط بنانے کے مترادف ہے۔

[3] وسائل جلد ۱۸۔ باب ۱۱ صفات قاضی۔ صفحہ ۹۹

۵۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ علماء نبیوںؑ کے وارث ہیں۔[۱]

۶۔ خدا نے علماء سے عہد لیا ہے کہ وہ ظالموں کی شکم سیری اور لوٹ کھسوٹ اور غریبوں کی بھوک پر خاموش نہیں بیٹھیں گے[۲] اور ظاہر ہے کہ سماج میں مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی حکومت اور اس کے قائم کیے ہوئے محکمے کی محتاج ہے۔

۷۔ قرآن میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اپنے سماج میں قسط یعنی عدالت پر قائم رہو۔ کیا سماج میں قسط حکومت اور حاکم کے بغیر قابل عمل ہے؟

۸۔ امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کاموں کی انجام دہی اور احکامات کا نفاذ عالموں، خدا کے پہچاننے والوں اور پرہیزگاروں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے حرام اور حلال میں کمی وبیشی نہیں کرتے اور امانت کی حفاظت کرتے ہیں۔[۳]

۹۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: اَلْعُلَمَاءُ حُکَّامٌ عَلَی النَّاسِ علماء لوگوں کے حاکم ہیں۔[۴]

اوپر کی سطور میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں حکومت کا سربراہ عادل اور جامع شرائط فقیہ ہونا چاہیے۔ یہی

---

[۱] وسائل جلد ۱۸۔ صفحہ ۵۳ [۲] نہج البلاغہ خطبۂ شقشقیہ

[۳] تحف العقول۔ صفحہ ۲۴۲

[۴] غرر الحکم ودرر الکلم۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۹۳)۔

فقہا، حضرت امام مہدیؑ کی غیبت کے زمانے میں معصوم اماموں کے حقیقی نمائندے ہیں۔ اگر فقیہہ کا اختیار اور ولایت ختم ہو جائے تو سماج میں طاغوت کا زور بڑھ جائے گا اور خدائی قوانین بدل دیئے جائیں گے۔

- جو لوگ ولایت فقیہہ کی مخالفت کرتے ہیں معلوم نہیں کہ ان کا مقصد کیا ہے ؟
- کیا وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے حکومت اور اس کا نظام ضروری نہیں ہے ؟
- کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ نظام تو ضروری ہے لیکن اس کے لیے ناظم، والی اور حاکم ضروری نہیں ہے ؟
- کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے والی اور حاکم اسلام ناشناس افراد ہوں ؟
- کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ حاکم فقیہہ اور اسلام شناس تو ہوں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ عدالت اور تقویٰ بھی رکھتے ہوں ؟
- کیا وہ یہ سوچتے ہیں کہ ولایت فقیہہ ایک قسم کا گروہی غلبہ ہے ؟ کیا فقیہہ کسی خاص طبقے کا نمائندہ ہوتا ہے ؟
- کیا فقیہہ کی خود غرضی اس کے عدل و انصاف کو ختم نہیں کر دیتی، جس سے سماج میں خود اس کی ولایت ہی ختم ہو جاتی ہے ؟
- کیا ولایت فقیہہ کو تسلیم کر لینا قوت و اختیار کے کئی مراکز قائم کر لینا ہے ؟ جب تمام احکام و فرامین اس غرض سے کہ اختلافی اور غیر اسلامی سمت میں نہ مڑ جائیں، فقیہہ عادل کی نہر کو عبور کر کے آتے ہیں تو اس صورت میں اہل کاروں کو تمام اختیارات فقیہہ کی جانب سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔

لہذا اختیارات کے کئی مراکز قائم نہیں ہوتے بلکہ قوت واختیار کا مرکز صرف ایک ہی رہتا ہے اور وہ بھی آسمانی اور خدائی قانون اور حکم جو عادل فقیہہ کے ذریعے سے نافذ العمل ہوتا ہے۔ ہم ولایت فقیہہ کے مخالفوں سے پوچھتے ہیں کہ آپ قوم کو فقیہہ عادل کے ہاتھوں سے نکال کر کس کے ہاتھوں میں دینا چاہتے ہیں ؟

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا مسلمان کو اپنے کاموں میں کسی کی تقلید نہیں کرنا چاہیے اور کیا تقلید کے مواقع صرف عبادتوں ہی میں آتے ہیں ؟ کیا سیاسی اور سماجی مسائل جیسے ہڑتال، پناہ گزینی، سفر، لڑائی، سمجھوتے، معاہدے، برطرفی اور تقرری وغیرہ میں حرام اور حلال کا امکان نہیں ہوتا ؟ کیا ہر ایسے باب میں جہاں حلال اور حرام کا امکان ہوتا ہے ہمیں تقلید نہیں کرنا چاہیے ؟

کیا مسلمان قوم کی رہبری اسلام ناشناس حاکم کے سپرد کردینا ایسا ہی نہیں ہے جیسے کسی میڈیکل کالج کو کسی ایسے شخص کے سپرد کردینا کہ جو ڈاکٹر نہ ہو۔ کیا امت کو کسی غیر عادل کے سپرد کردینا مقام انسانیت کے ساتھ بے انصافی نہیں ہے ؟

کیا وہ وقت نہیں آگیا ہے کہ ہم جھوٹی رہبریوں، سیاست بازیوں اور پیشہ ور موقع پرستوں سے بچیں، اپنے آپ کو اسلام کے دامن میں ڈال دیں اور صرف ایسی رہنمایاں قبول کریں جو وحی کے پیمانوں پر پوری اتریں ؟

میں اس بات کی معافی چاہتا ہوں کہ بات کچھ لمبی ہوگئی لیکن یہ بھی انصاف سے بعید ہوتا کہ ہم امامت پر گفتگو کرتے لیکن حضرت امام مہدیؑ کی غیبت کے زمانے میں قوم کی امامت اور رہبری کی ضرورت اور اسکے طریقے کا ذکر نہ کرتے۔

معاد

ہر انسان کی عقل اور فطرت کے مطابق اس کے ذہن میں معاد کا ایک قابل توجہ مقام ہے اس لیے کہ کون ایسا شخص ہے جو یہ پوچھنا یا جاننا نہ چاہے گا کہ انسان اور اس دنیا کا مستقبل کیا ہو گا؟ انسانی زندگی اور تگ و دو کا خاتمہ کہاں ہو گا؟ اس زندگی کا مقصد اور نتیجہ کیا ہے؟ ہاں تو یہ سوالات سب کے ذہن میں آتے ہیں۔

ہمارے پاس اس بات کے دو جوابات ہیں

۱۔ تمام آسمانی مذاہب' ان دلائل کی رو سے جو ہم آگے چل کر بیان کریں گے' دنیا اور انسان کے مستقبل اور اس کے اعمال و افعال کے

نتیجے کو بہت روشن، امید افزا اور اطمینان بخش سمجھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: آخر کار سب کو تمہارے پروردگار کے پاس پہنچنا ہے[1]

۲۔ مادی نظریات اس دنیا اور انسان کو مستقبل میں ختم ہونیوالا، فنا ہونے اور مٹنے والا سمجھتے ہیں۔ یہ بیحد خطرناک اور مایوس کن نقطۂ نظر ہے۔ مزید یہ کہ اس قسم کے نظریے رکھنے والوں کے پاس اپنے ان نظریوں کے حق میں کوئی علمی دلیل بھی نہیں ہے۔

اس بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے: جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ان کا کہنا ہے کہ زندگی دنیا کے ان چند دنوں سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ ہم اسی قلیل عرصے میں اپنی زندگی اور موت پا لیتے ہیں، پھر زمانہ ہم کو مٹا دیتا ہے لیکن ان کے پاس اپنے (قیامت سے) اس انکار اور اس قول کی کوئی علمی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ سراسر ان لوگوں کا وہم اور خیال ہے[2]

فطری دلیلیں

اگرچہ کچھ لوگ زبان سے تو معاد کا اقرار نہیں کرتے لیکن لاشعوری طور پر وہ اپنی روح کی گہرائی میں انسان کی ابدیت کو محسوس کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ از خود ایسے آثار ظاہر کرتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ موت اور جسم کے گلنے سڑنے کے باوجود انسان اور اسکی حقیقی شخصیت کو نیست و نابود ہو جانے والی چیز سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ ہم ذیل میں ان آثار کی کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں۔

---

[1] سورۂ نجم۔ آیت ۴۲　　[2] سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۴

۱- معاد کا انکار کرنیوالے سب لوگ اپنے بزرگوں کی قبروں کا احترام کرتے ہیں۔

۲- یہ لوگ سڑکوں، اداروں، مدرسوں اور یونیورسٹیوں کے نام اپنی مُردہ شخصیتوں کے نام پر رکھتے ہیں۔

۳- یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد انکی نیک نامی باقی رہے۔

۴- یہ لوگ اپنی اولاد کے نام اپنے بزرگوں کے ناموں پر رکھتے ہیں۔

۵- یہ لوگ کبھی کبھی اپنے مُردوں کی ممیاں بناتے ہیں تاکہ وہ گلنے سڑنے سے محفوظ رہیں۔

اگر معاد سے انکار کرنیوالے موت کو انسان کی فنا سمجھتے ہیں تو انکے اس قسم کے افعال کی کیا وجہ ہے۔ جب وہ لوگ مرنے کو فنا سمجھتے ہیں تو پھر وہ ایک مٹ جانے والے انسان کا مقبرہ کیوں بناتے ہیں اور اس کی قبر پر پھول کیوں چڑھاتے ہیں۔ بیشک یہ سب باتیں اس امر کا پتا دیتی ہیں کہ معاد کے مخالف بھی اپنے دل میں انسان کی روح اور شخصیت کی بقا پر ایک (کمزور) قسم کا ایمان ضرور رکھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی شخصیت موت کے ساتھ ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ ہم اس بات کی تھوڑی سی وضاحت اور کرتے ہیں۔

اگر لوگ موت کا مطلب فنا ہونا ہی سمجھتے ہیں تو مختلف قومیں اور نسلیں اپنی اولاد کے نام اپنے بزرگوں کے نام پر کیوں رکھتی ہیں اور کیوں ان پر فخر کرتی ہیں؟ اگر کوئی شخص ان لوگوں میں سے کسی کے باپ کی قبر پر ٹھوکر مارتا ہے تو اس سے کیوں لڑتے ہیں؟ بزرگوں کے عالیشان مقبرے کیوں تعمیر کرتے ہیں؟ بعض قبیلے اپنے مُردوں کے ساتھ زیورات، ہتھیار

اور لباس کیوں دفن کرتے ہیں ؟ ہاں ! انسان اپنے دل میں بقا کا احساس رکھتا ہے اور کسی نہ کسی طرح تاریخ میں نیک نامی کو حوصلہ افزائی کا ذریعہ تصور کرتا ہے۔

ادھر اجنبیت بھی انسان کا اندرونی احساس ہے کیونکہ یہ دنیا اس کے لیے تنگ اور محدود ہے۔ وہ وقتی طور پر اپنے آپ کو بیوی بچوں، مال و جائیداد اور سیر و سفر میں مشغول کر لیتا ہے لیکن کچھ مدت کے بعد دل ہی دل میں پھر سے ایک کمی کا احساس کرتا ہے چونکہ آرام و آسائش کی تمام چیزیں بھی اسے مطمئن نہیں کر پاتیں اس لیے کبھی وہ خودکشی کرنے کی سوچنے لگتا ہے اور کبھی یہ پوچھتا ہے کہ میری پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ میں کس لیے ہوں ؟ پس یہ تمام اندرونی بے چینیاں بتاتی ہیں کہ انسان دنیا میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ یہ دنیا اپنی وسعتوں کے باوجود اس کے لیے تنگ ہے، جسم اس کے لیے پنجرہ ہے جس میں وہ بند ہے اور دنیا اس کے لیے قید خانہ ہے۔ یہ احساس بھی اس یقین کی بنیاد ہے کہ انسان ایک دن ضرور مطمئن ہو گا اور اس کی تمام آرزوئیں بر آئیں گی اور مقاصد پورے ہو جائیں گے کیونکہ ہر ضرورت، احساس اور اندرونی بے کلی کا جواب خارج میں موجود ہے مثلاً پیاس کی تسکین پانی سے شہوت کی تسکین شریک حیات سے اور مسافرت کے احساس کی تسکین معاد سے ہو جاتی ہے۔

صحیح دلیلوں کی طرف رہنمائی

انسان کے ہر فطری احساس کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے :

۱۔ وقتی، عارضی اور جھوٹا جواب۔

۲۔ دائمی، پکا اور سچا جواب۔

مثال: ایک پیاسے شخص کی رہنمائی صاف اور خالص پانی کی طرف کی جاسکتی ہے اور اسے سراب بھی دکھایا جاسکتا ہے، اسی طرح ایک بھوکے بچے کو ماں کی دودھ بھری چھاتی سے لگایا جاسکتا ہے اور اس کے منہ میں نپل دیکر بھی بہلایا جاسکتا ہے۔

غرض کہ تمام فطری احساسات کو دو طرح سے سہارا دیا جاسکتا ہے۔ اصلی اور مستقل سہارا یا بناوٹی اور عارضی سہارا۔ امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۴۷ میں فرماتے ہیں: حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس لیے آئے تھے کہ لوگوں کو بتوں کی پوجا سے ہٹا کر خدا کی عبادت کی طرف اور مخلوق کی اطاعت سے ہٹا کر خالق کی اطاعت کی طرف لائیں۔ بے شک انسان کے دل میں عبادت اور محبت کی جڑ بنیاد موجود ہے۔ اگر اس کے اس اندرونی میلان کو حق کی طرف نہیں موڑا جاتا تو وہ توہمات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

وہ جواب جو انبیاءؑ دیتے ہیں

ابھی تک ہم نے یہ کہا ہے کہ انسان اپنے دل میں اپنی بقا کا احساس اور بقا کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس احساس کو ایک سچا اور دائمی سہارا دینا چاہیے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں انبیاء کیا کہتے ہیں۔ یقیناً ہم جلد ہی انکے ارشادات یہاں نقل کریں گے اور انشاء اللہ ان کے

دلائل بھی بیان کریں گے۔

خدا کا جواب پیغمبروں کی معرفت یہ ہے

۱۔ انسان بلا وجہ پیدا نہیں کیا گیا۔[1]

۲۔ انسان کی پیدائش کا مقصد بہت بڑا ہے اور وہ ہے تمام راستوں میں سے خدا کی راہ اور تمام اطاعتوں اور بندگیوں میں سے خدا کی اطاعت اور بندگی کا انتخاب کرنا۔[2]

۳۔ اس غرض سے کہ انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہو اسے تمام فطری اختیارات دیدیے گئے اور تمام مظاہر قدرت اس کے تابع کر دیے گئے۔[3]

۴۔ ہم نے اسے خبردار کر دیا کہ تیرے ہر اچھے اور برے کام کا حساب ہوگا، چاہے وہ جس حال اور جس مقدار میں بھی سرزد ہو۔[4]

۵۔ انسان اپنے اعمال کا قیدی ہے۔[5]

۶۔ انسان کے کان سے سنی جانے والی اور آنکھ سے دیکھی جانے والی باتوں اور دل میں آنے والے خیالوں کی بھی پوچھ گچھ ہوگی۔[6]

۷۔ خدا نیک کام کرنیوالوں کے اجر کو ضائع نہیں ہونے دیگا۔[7]

یہ وہ نظریات ہیں جو انبیاءؑ قیامت کے سلسلے میں بطور وضاحت

---

[1] سورۂ مومنون، آیت ۱۱۵ [2] سورۂ ذاریات، آیت ۵۶ [3] سورۂ حج، آیت ۶۵ [4] سورۂ زلزال، آیات ۷-۸ [5] سورۂ مدثر، آیت ۴۲ [6] سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۳۶ [7] سورۂ توبہ، آیت ۱۲۱

پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر بات کے ساتھ ایک عقلی دلیل بھی موجود ہے جس پر ہم آگے چل کر غور کریں گے لیکن اس وقت یہ دیکھنا بہتر ہے کہ بنیادی طور پر معاد (واپسی) ہو گی بھی یا نہیں یعنی یہ بات عقل کی رو سے ناممکن تو نہیں ہے۔ پس جب ہم یہ سمجھ لیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو پھر یہ دیکھیں گے کہ معاد کی دلیل کیا ہے کیونکہ اسکا صرف ممکن ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ کوئی سا ممکن کام جب تک کہ اس کی دلیل اور سبب موجود نہ ہو واقع نہیں ہو سکتا۔ تیسرے مرحلے پر یہ بحث ہو گی کہ آیا معاد کے لیے کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے۔

مردوں کا زندہ ہونا ناممکن نہیں

آج تک کوئی شخص معاد کے واقع نہ ہونے کی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکا۔ معاد کے مخالفین جو واحد راگ الاپتے رہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک مُردہ انسان جس کے ذرّات گل سڑ چکے ہوں وہ دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتا ہے؟

اس بارے میں عقل اور قرآن کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے اور یہ کام انہونا نہیں ہے۔ یہ بات تصور میں بھی آتی ہے اور ہم رات دن برابر مردوں کے زندہ ہونے کی مثالیں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ امام محمد تقی علیہ السلام فرماتے ہیں:

سونا اور جاگنا ایک بہترین مثال ہے جس سے ہم مرنے اور جی اٹھنے کے مسئلے کو سمجھ سکتے ہیں۔ موت ایک لمبی اور گہری نیند سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس کی ایک اور مثال درختوں کی بہار، خزاں اور نباتات کا

زندہ اور مُردہ ہونا ہے جیسے ہم سورۂ فاطر میں پڑھتے ہیں: وہ خدا ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تاکہ وہ بادل کو اٹھائیں۔ پھر وہ بادلوں کو خشک علاقوں اور شہروں کی طرف روانہ کرتا ہے۔ تب مینہ برسنے کے بعد وہ اس (خشک سالی کے مارے ہوئے) مُردہ شہر کو زندہ کرتا ہے۔ اس کے بعد خدا فرماتا ہے: مُردوں کا زندہ ہونا بھی درختوں اور نباتات کے زندہ ہونے کی طرح ہے[1]

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے: ہم نے بارش سے (بے آب و خشک) مُردہ شہر کو زندہ کر دیا۔ قیامت میں تمہارا خروج (جی اٹھنا) بھی اسیطرح ہوگا[2]

غرض ہر دن رات اور ہر فصل اور ہر سال میں مردہ سے زندہ ہونے کی مثالیں ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں جو مُردہ کے زندہ ہونے کے مسئلے کو اس قدر مشکل ہونے کے باوجود ہمارے لیے آسان اور قابلِ فہم بنا کر پیش کرتی ہیں۔

قرآن کا ایک یادگار واقعہ

ایک شخص نے کسی دیوار میں دبی ہوئی ایک ہڈی کرید کر نکالی اور اس کو پیس کر برادہ بنا دیا۔ پھر ایک ٹھٹے سے رسول اکرمؐ سے کہنے لگا: اس گلی سڑی اور چورا چورا ہڈی کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ اس سے کہہ دیجیے، وہی خدا جس نے اسے پہلی بار پیدا

---

[1] سورۂ فاطر، آیت ۹ [2] سورۂ ق، آیت ۱۱

کیا تھا۔ اس کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد بھی اسے دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔[۱] اگر کسی چیز کا بنانے والا یہ کہے کہ میں اپنے کارخانے کی مصنوعات کو توڑ کر دوبارہ جوڑ سکتا ہوں تو اس کا کہنا غلط نہیں ہوگا کیونکہ اس کا بنانا، توڑنے اور جوڑنے سے زیادہ اہم ہے۔

معاد کے انکاریوں کو دو باتوں میں شبہ تھا۔

اوّل: یہ کہ گلی سڑی ہڈی بھی کہیں زندہ ہو سکتی ہے۔ "وہ کہتے ہیں کہ جب ہم گل سڑ کر بکھری ہوئی ہڈیاں بن گئے تو کیا ہم دوبارہ پیدا ہو سکیں گے؟"[۲]

دوم: یہ کہ اگر ریزہ ریزہ ہڈیوں کے زندہ ہونے کو ممکن مان بھی لیا جائے تو یہ کام کون کریگا؟ وہ پوچھتے ہیں کہ ہمیں دوبارہ کون پلٹا ئیگا؟ ان سے کہہ دیجیے، وہی خدا جس نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔[۳] اگر ایک اینٹ بنانے والا کہے کہ میں اپنی اینٹ کو ریزہ ریزہ کر کے دوبارہ اسی مٹی سے نئی اینٹ بناتا ہوں تو کیا یہ لوگ اس پر بھی اسی قدر تعجب کریں گے؟

یہ لوگ جو مُردوں کے بکھرے ہوئے اجزا کے زندہ ہونے کو اسقدر عجیب سمجھتے ہیں، ان کی پہلی پیدائش پر کیوں شک نہیں کرتے کیونکہ پہلی بار پیدا کرنا تو دوبارہ پیدائش سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ایک ہوائی جہاز کا پہلی بار بنانا زیادہ مشکل ہے یا اسے کھول کر اس کے پرزے الگ الگ کر کے پھر سے انھیں جوڑنا؟ اگر کسی ہوائی جہاز بنانے والے نے

۱۔ سورۂ یٰسٓ، آیت ۷۹۔ ۸۰ ۲۔ و ۳۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۵۳، ۵۴

یہ کہہ کر میں اس ہوائی جہاز کو کھول کر اس کے پرزے الگ الگ کر کے ان کو دوبارہ جوڑ سکتا ہوں تو کیا ہمیں اس کی اس بات پر شک کرنا چاہیے؟ قطعی نہیں کیونکہ اس کو کھول کر پھر سے جوڑنا اس کے پہلی بار بنانے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ پس جس نے مشکل کام کر لیا ہو وہ اس سے آسان کام بھی کر سکتا ہے (اگرچہ خدا اور اس کی بے انتہا قدرت کے آگے کوئی بات مشکل نہیں ہے)۔

ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو وہ اس سلسلے میں فرماتا ہے:

وہ خدا ہی تو ہے جس نے پیدائش کی ابتدا کی۔ پھر بھی وہی پیدا کرے گا اور دوسری پیدائش پہلی پیدائش سے زیادہ آسان ہے[1]

معاد کے ممکن ہونے میں دوسری مثالیں

اس بات کے ثبوت میں کہ مُردوں کا زندہ ہونا غیر ممکن نہیں ہے، قرآن کریم میں بہت سی مثالیں دی گئی ہیں۔ من جملہ ان کے وہ حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو واقعات بیان کرتا ہے۔ ہم یہاں انکا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ:

حضرت عزیر[2] علیہ السلام ایک سفر میں کسی اجڑی ہوئی بستی سے گزر رہے تھے، تب وہ (انکار سے نہیں) حیرت سے بولے: خدا انہیں مرنے

---

[1] سورۂ روم، آیت ۲۷ [2] بعض لوگوں نے ان پیغمبر کا کوئی اور نام بھی لیا ہے لیکن مشہور حضرت عزیر علیہ السلام ہی ہیں۔

کے بعد کیونکر زندہ کرسکے گا؟ خدا نے ان کو اسی جگہ سو سال تک مردہ رکھا اور پھر زندہ کر کے پوچھا: تم یہاں کتنے عرصے تک رہے؟ پیغمبر نے جواب دیا: ایک یا آدھے دن تک۔ خدا نے فرمایا: تم یہاں سو سال تک رہے ہو۔ اب تم اپنی سواری کے گدھے اور اس کھانے کو دیکھو جو تمہارے پاس تھا۔ پھر خدا کی اس قدرت کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہارا گدھا کس طرح مرا اور گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے، لیکن وہ غذا جسے ایک دو دن میں گل سڑ جانا چاہیے تھا، سو سال سے صحیح سلامت موجود ہے۔ اب تم مردوں کے زندہ ہونے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے اس گدھے کی ریزہ ریزہ ہڈیوں پر نظر ڈالو جسے ہم تمہاری آنکھوں کے سامنے زمین پر کھڑا کر کے، اس کا گوشت، کھال اور روح اس کو واپس کرتے ہیں تاکہ آنے والوں کے لیے یہ ایک عبرت اور نشانی ہو۔

حضرت عزیر علیہ السلام نے جیسے ہی گدھے کا زندہ ہونا اور سو سال تک کھانے کا نہ سڑنا دیکھا تو فوراً کہا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر کام کی طاقت رکھتا ہے۔

دوسرا واقعہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دریا کے پاس سے گزر رہے تھے کہ آپ نے وہاں ایک لاش دیکھی جس کا ایک حصہ پانی میں اور دوسرا خشکی پر تھا۔ دریائی اور صحرائی جانور اور پرندے اس پہ ہجوم کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر قسم کا جانور اس کا ایک ایک ذرہ کھا رہا تھا۔ آپ نے جیسے ہی یہ منظر دیکھا، خدا سے پوچھا کہ قیامت کے دن تو مردوں کو کس طرح زندہ

کرے گا کیونکہ لاش کے ذرات سمندر، اور صحرا اور ہوا میں بکھر چکے تھے اور اس کے جسم کا ہر حصہ دوسرے جانور کے جسم کا حصہ بن چکا تھا۔ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا: کیا تم معاد اور میری قدرت پر ایمان نہیں رکھتے؟ انھوں نے جواب دیا: کیوں نہیں، لیکن میں آنکھوں سے دیکھ کر اطمینانِ قلب حاصل کرنا چاہتا ہوں (ہاں بحث اور منطق سے صرف عقل کی تسلی ہوتی ہے اور تجربے اور مشاہدے سے دل کی)۔

خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا: چار قسم کے پرندے لو۔ انھیں ذبح کر کے ان کا گوشت آپس میں ملا دو اور اس کو مختلف پہاڑوں کے اوپر رکھ دو۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے ان پرندوں کو بلاؤ۔ پھر دیکھو کہ ان کے باہم ملے ہوئے ذرات میں سے کچھ ذرات کس طرح جدا ہو کر پرندے کی پہلی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک، ایک مرغا، کبوتر، مور اور کوا پکڑ کر ذبح کیا اور ان کے گوشت کو کاٹ کر ملایا اور دس پہاڑوں کی چوٹیوں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے ان میں سے جس جس پرندے کو بلایا، اس کے گوشت کے ذرات جو ہر پہاڑ کی چوٹی پر تھے باہم مل گئے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے سالم پرندے کی شکل میں ڈھل گئے۔[1]

بے شک خدا حضرت ابراہیمؑ جیسے برگزیدہ بندوں کو جو ابتدائی اور درمیانی جماعت پاس کر چکے ہیں، اونچے درجے پر لے جاتا ہے اور انھیں دنیا کے کارخانے میں اپنی مخصوص آزمائش گاہوں میں بھیج دیتا ہے لیکن

---

[1] سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۶۰

ہم جیسے لوگ جو پہلے ہی درجے سے اوپر نہیں جا پاتے ہیں' وہ شہود' حضور' معراج' ملکوت اور یقین کے مقام سے بھی بے خبر ہیں۔

ہم اس بات کی کچھ اور آسان مثالیں پیش کرتے ہیں کہ بکھرے ہوئے ذرات سے ایک وجود کس طرح بن جاتا ہے۔

۱۔ گائے چارہ کھاتی ہے۔ چارے کے ذرات سے دودھ نکلتا ہے۔

۲۔ انسان روٹی کا ایک ٹکڑا کھاتا ہے جس سے آنسو' خون' ہڈی' بال' ناخن اور گوشت بنتا ہے۔

۳۔ بہت سے کپڑے اس تار سے بنتے ہیں جو انسان نے پٹرول سے نکالا ہے۔

۴۔ جب دھات پگھل جاتی ہے تو اسکے اندر سے بھین باہر نکل آتے ہیں۔

۵۔ دہی کو بلوئیں تو مکھن کے بکھرے ہوئے ذرات یکجا ہو کر اسکی سطح پر آجاتے ہیں۔

آپ یہ بات کیوں تسلیم کرتے ہیں کہ گائے کے ہاضمے کا کارخانہ چارے سے دودھ نکال سکتا ہے' انسان پٹرول سے ریشہ نکال سکتا ہے اور آپ دہی کو بلو کر مکھن کے بکھرے ہوئے ذرات کو یکجا کر سکتے ہیں لیکن جب آپ یہ سنتے ہیں کہ خدا زمین کو حرکت دیگا۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (سورۂ زلزال۔ آیت ۱) تو گلی سڑی ہڈیوں کے ذرات جہاں کہیں بھی ہونگے اکٹھے ہو جائیں گے' آپ اسے نہیں مانتے۔

کچھ اور آسان اور چھوٹی چھوٹی آیتیں ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

خدا فرماتا ہے: ہم نے جس طرح تم کو ابتدا میں بنایا تھا اسی طرح تم پھر زندہ ہو جاؤ گے (سورۂ اعراف۔ آیت ۲۹)۔

اور فرماتا ہے: اے معاد سے انکار کرنیوالو! تم اپنی پہلی پیدائش کو تو جانتے ہو، پھر بھی سبق نہیں لیتے اور ضد کرتے ہو[1] اور ہم پڑھتے ہیں کہ: انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے، وہ اس اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا تھا جو کمر اور پسلیوں کے بیچ سے نکلتا ہے۔ بے شک جس خدا نے تمہیں اس پانی سے پیدا کیا ہے وہ انسان کو دوبارہ زندہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے[2] وہ یہ بھی فرماتا ہے: کیا وہ خدا جس نے تمہیں نطفے سے پیدا کیا ہے مردوں کو دوبارہ زندہ نہیں کرسکتا[3]

وہ مزید فرماتا ہے: کیا ہم پہلی خلقت سے تھک کر مجبور ہو گئے ہیں جو یہ لوگ دوبارہ پیدائش کے بارے میں شک اور شبہے میں پڑ گئے ہیں[4]

کیا واقعی اگر کوئی راج تمہارے لیے خوشنما مکان بنائے اور پھر کہے کہ میں اس گھر کو ڈھا کر دوبارہ بناؤں گا تو تم کو شک کرنا چاہیے؟

پھر فرماتا ہے: کیا تم نہیں دیکھتے کہ جس خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ اسی طرح انسان کو بھی پیدا کرسکتا ہے؟[5]

اور فرماتا ہے: کیا معاد سے انکار کرنے والے کو یہ یاد نہیں کہ ہم نے اسے ابتدا میں پیدا کیا تھا جبکہ وہ کچھ بھی نہیں تھا[6]

اگرچہ ہم قرآن سے دلیلیں دے رہے ہیں تاہم قرآن ہماری عقل اور فکر

---

[1] سورۂ واقعہ، آیت ۶۱ [2] سورۂ طارق، آیت ۴ تا ۸ [3] سورۂ قیامت، آیت ۴۰ [4] سورۂ قٓ، آیت ۱۵ [5] سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۹۹ [6] سورۂ مریم، آیت ۶۷

کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے: کیا تم لوگوں کے لیے جو برابر رات دن، سال کے بارہ مہینے اس خدا کے کام کے نمونے دیکھتے رہتے ہو اب بھی حیرت و استعجاب کی گنجائش ہے؟

چونکہ ہمیں اپنی تحریر میں سادگی اور اختصار مدنظر ہے اس لیے ہم قرآن میں بیان ہونے والی دوسری مثالیں یعنی اصحاب کہف کا قصہ اور ایک خداشناس جواں مرد کے ۳۰۹ سال بعد جا گنے کا واقعہ چھوڑے دیتے ہیں۔

ہم نے کہا تھا کہ ہر ہونے والے کام کی تین منزلیں ضرور ہوتی ہیں۔ اول اس کے واقع ہونے کا امکان جس کے متعلق ان صفحات میں گفتگو کی گئی۔ اب دوسری منزل کی نوبت آتی ہے جس کا نام واقع ہونے کا سبب ہے یعنی معاد کے دلائل کیونکہ صرف زندہ ہونے کا امکان کافی نہیں ہے۔ جیسے انسان بہت سے کام کر سکتا ہے اور ان کے کرنے کا امکان ہے لیکن وہ اس کے لیے سبب اور دلیل بھی چاہتا ہے۔ پانی پینا بلاشک وشبہ ہم سب کے لیے ممکن ہے لیکن جب تک پیاس نہ ہو، ہم پانی نہیں پیتے۔ اس طرح بات کرنا، راستا چلنا اور دوسرے سب کام ہمارے لیے امکان کا درجہ رکھتے ہیں، یعنی وہ ممکن ہیں لیکن جب تک ان کے کرنے کی کوئی وجہ اور دلیل موجود نہیں ہوتی ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔

اسی طرح ہر ممکن کام، امکان کے علاوہ ایک سبب بھی چاہتا ہے۔ ہم اس مقام پر انشاء اللہ مختصر طور پر معاد کے اسباب بیان کریں گے کیونکہ اس سلسلے میں تفصیل سے کتابیں لکھی جا چکی ہیں، خدا ان کے لکھنے اور پڑھنے والوں

کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

معاد کی پہلی دلیل : خدا کا عدل

معاد کے واقع ہونے کی کچھ ایسی پکی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں جو عقل اور قرآن نے بیان کی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب خدا عادل ہے تو پھر معاد بھی ہونا چاہیے۔ اگر معاد نہ ہو تو خدا کی عدالت پر حرف آتا ہے۔اس کی تشریح یہ ہے کہ خدا اور انبیاءؑ کے احکام کے سامنے انسانوں کے دو گروہ ہو جاتے ہیں یعنی موافق اور مخالف۔قرآن سورۂ تغابن میں اس حقیقت کو یوں بیان فرماتا ہے: تم میں سے کچھ تو ایمان لے آتے اور کچھ کافر ہو گئے۔

دوسری طرف یا تو دنیا میں اعمال کا بدلہ ملتا ہی نہیں یا پھر سزاؤں کی کمی کے باعث ان کا احساس ہی نہیں ہوتا۔چنانچہ جلد یا بدیر اچھے برے سبھی لوگ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔اب اگر حساب کتاب اور سزا جزا کسی دوسری جگہ، مثلاً قیامت میں نہ ہو اور مرنے کے ساتھ ہی سب کچھ مٹ جاتے تو پھر خدا کا انصاف کیا ہو گا؟ ہاں تو جب خدا عادل ہے اور اس دنیا میں عمل کی جزا بھی نہیں ہے تو پھر کسی دوسری جگہ پر پاداش ضرور ملنا چاہیے۔اب ہم ایک سوال اور اسکا جواب نقل کرتے ہیں۔

سوال:

خدا دنیا میں پاداش کیوں نہیں دیتا؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ معاملہ نقد یعنی فوراً ہو جاتا اور ہر نیک و بد کا حساب اسی دنیا میں چک جاتا۔یوں پھر ہمارے

بیے قیامت کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی ؟ اس سوال کے بہت سے جوابات ہو سکتے ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم مختصر طور پر اشارہ کرتے چلیں گے۔

پہلا جواب:

چونکہ دنیا میں دی جانے والی سزا دوسروں پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے اس لیے گویا وہ ایک طرح کا ظلم ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے: فرض کیجیے کہ میں نے کسی کے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور خدا نے مجھے اسی دنیا میں سزا دیکر میرا ہاتھ مفلوج کر دیا۔ جب میں گھر جاتا ہوں تو میرے عزیز میرا مفلوج ہاتھ دیکھتے اور کڑھتے ہیں حالانکہ میرے عزیزوں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ ہاں دنیا تعلقات کی جگہ ہے یعنی یہاں میرے رنج وراحت سے دوسرے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر دنیا میں ہی سزا دی جائے تو یہ ناانصافی ہو گی۔

لیکن قیامت میں سب تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ ہر ایک صرف اپنی ہی فکر میں ہو گا حتی کہ قرآن کے مطابق انسان اپنے بیوی بچوں تک سے کترائے گا اور اپنی ہی نجات کی فکر کریگا۔ اگر وہاں کسی مجرم پر سختی آئے گی تو دوسروں پر اس کا کوئی اثر نہ پڑیگا۔

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ پھر یہاں ہمیں کسی مجرم کو سزا نہیں دینا چاہیے کیونکہ اس سے اس کے عزیز و اقارب کو دکھ ہو گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چور کے چند اعزا و احباب کے دکھ کا لحاظ کر کے اس کا ہاتھ نہ کاٹا گیا یا اس کو کوڑے نہ لگائے گئے تو ایسے بدکردار لوگوں کے کھل کھیلنے سے پورے سماج میں خوف وہراس پھیل

جائے گا۔ پھر یہ بھی تو ایک ظلم ہو گا کہ ہم ایک مجرم کے عزیزوں کی تکلیف کے خیال سے پورے معاشرے کو خطرے میں ڈال دیں' اس لیے ایسے موقعوں پر اس کے علاوہ اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ ہم سماج کی بھلائی کو افراد کی بھلائی پر ترجیح دیں۔

دوسرا جواب:

اگر خدا دنیا میں ہی جزا اور سزا دینے لگے تو لوگ خوف یا لالچ سے نیک بن جائیں لیکن یہ نیکی مجبوری کا نتیجہ ہو گی جس کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ اصل نیکی اور اچھائی یہ ہے کہ انسان آزاد رہے اور پھر گناہ نہ کرے ورنہ اگر یوں ہوا کرے کہ جو کاشتکار' کاریگر' تاجر اور طالب علم کوئی نیک کام کرے' خدا اسے دنیا میں ہی کوئی باغ' محل' مال یا سند دیدے تو سبھی لوگ زاہد' عابد اور پکے مسلمان بن جائیں۔ تاہم اس کی نیکی کی کوئی وقعت نہیں ہو گی' کیونکہ انسان کی فضیلت اس کی آزادی' اختیار اور انتخاب میں ہے ورنہ مجبوری کی عبادت کے لیے تو لاکھوں کروڑوں فرشتے موجود تھے۔ خدا نے انسان کو جو پیدا کیا تو وہ اس لیے کہ وہ ہوا و ہوس کے دو مخالف راستوں میں سے اپنے لیے ایک راستے کا انتخاب کرے۔

اسلام میں قدر و قیمت کا معیار

بنیادی طور پر قرآن ان لوگوں کی زیادہ تعریف کرتا ہے جو حق اور باطل کے دو راستوں میں سے ان دلکشیوں کے باوجود جو باطل میں ہوتی ہیں۔ اپنی نفسانی خواہشات کو دبا کر اور ان کی دلکشیوں کو نظر انداز کر کے حق

کا راستا اپناتے ہیں۔ قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جیسے ایک جانب حسین اور نوجوان یوسفؑ اور دوسری جانب آمادہ وتیار زلیخا اور پھر گھر کے دروازے بھی بند لیکن یوسفؑ "مَعَاذَ اللّٰہِ" کہہ کر اپنا دامن بچاتے ہیں۔[1]

حضرت ابراہیمؑ سو سال کی عمر میں بیٹے کے آرزومند تھے انہوں نے بہت دعائیں مانگیں تب خدا نے انھیں اسماعیل سا بیٹا عطا کیا۔ اس حالت میں خدا کا حکم آتا ہے کہ اے ابراہیمؑ! اپنے اس بیٹے کو ہمارے لیے اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالو۔ حضرت ابراہیمؑ ایک طرف تو بیٹے کی فطری محبت کے دباؤ میں ہیں اور دوسری طرف انھیں خدا کی آواز کا جواب بھی دینا ہے۔ وہ ان دونوں باتوں میں سے اپنے فرض کا انتخاب کرتے ہیں اور محبت پدری کے جذبے کو نکیل ڈالتے ہیں۔ یہ ہے انسان کا وہ اعلیٰ ارفع مقام جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ دونوں خدا کے حکم کے سامنے جھک گئے، باپ نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے اس کی پیشانی خاک پر رکھ دی۔[2]

امام علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا روزہ کھولتے وقت سخت بھوک کے باوجود اپنا کھانا محتاجوں کو دیکر روزہ پانی سے کھولتے ہیں۔ اس دریا دلی کے متعلق قرآن کہتا ہے: سخت ضرورت کے باوجود خدا کی محبت میں وہ اپنا کھانا دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔[3]

---

[1] سورۂ یوسف، آیت ۲۳ [2] سورۂ صافات، آیت ۱۰۳ [3] سورۂ دہر، آیت ۸۔

یہ خدا کے وہ بندے ہیں جو آدھی رات کو نیند کی کشش کے باوجود اپنے آپ کو بستر سے الگ کر لیتے ہیں اور مناجات اور استغفار کے لیے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اس بارے میں قرآن کہتا ہے: پچھلے پہر وہ اپنے بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں[1] اور استغفار میں مشغول رہتے ہیں۔[2]

مختصر یہ کہ اللہ کے نزدیک اعمال کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہے کہ انسان کو مکمل آزادی حاصل ہو اور پھر وہ تہہ بہ تہہ مادی دلچسپیوں اور فطری رغبتوں کے باوجود راہ حق کا انتخاب کرے ورنہ اس کے کسی عمل کی کوئی وقعت و اہمیت نہیں ہے۔ ہاں اگر انسان نے زبان رکھتے ہوئے بھی غصے میں کوئی برا لفظ منہ سے نہیں نکالا تو یہ قابل قدر بات ہے۔ انسان گونگا ہو یا عام حالات میں بدزبانی نہ کرے تو یہ کوئی کمال کی بات نہیں۔

ایک یاد دہانی

آپ اس گفتگو کے بارے میں یہ کہیں گے کہ اگر دنیا ہی میں جزا مل جائے تو سبھی لوگ خوف یا لالچ سے نیک بن جائیں لیکن اس نیک بننے کی کوئی وقعت نہیں ہے' البتہ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہشت کا وعدہ اور جنت کا ڈراوا کیا ان لوگوں کو بہشت کے لالچ اور دوزخ کے ڈر سے اچھا نہیں بنا سکے گا؟

اس کا جواب یہ ہے: چونکہ بہشت اور دوزخ فی الحال لوگوں کے سامنے موجود نہیں ہیں اس لیے انسان نیک بننے کے لیے کوئی مجبوری محسوس

---

[1] سورۂ سجدہ۔ آیت ۱۶ [2] سورۂ ذاریات۔ آیت ۱۸

نہیں کرتا۔ بیشک اس آدمی میں جسے کل ہی قرضہ ادا کرنا ہے اور اس آدمی میں جس کے قرضے کی ادائیگی میں ابھی چند ماہ باقی ہیں بہت فرق ہے۔ پہلا شخص گھبراتا ہے' اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور اس پر خوف طاری ہو جاتا ہے لیکن دوسرا شخص جسے چند ماہ کی مہلت حاصل ہوتی ہے وہ ایک قسم کے اطمینان سے بسر کرتا ہے۔

ہاں فوری سزا جزا اور مہلت والی بلکہ طویل مہلت والی سزا جزا میں انسانی احساس کے لحاظ سے بڑا فرق ہوتا ہے' اس لیے خدا نے سزا جزا میں مہلت دیدی ہے تاکہ لوگوں کے ہاتھ پاؤں نہ پھول جائیں اور وہ پوری آزادی سے اپنی تہہ بہ تہہ جبلتوں اور خواہشوں میں سے گزرتے ہوئے خدا کی راہ اپنائیں۔

تیسرا جواب:

اس سوال کا کہ خدا ہمیں دنیا ہی میں سزا جزا کیوں نہیں دیتا؟ ایک اور جواب یہ ہے کہ دنیا کی حد بندیوں کے باعث یہاں نیکوں اور گنہگاروں کو سزا جزا ملنا ممکن نہیں ہے۔

مثلاً رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دینے کے لیے جنھوں نے انسانی نسلوں کو صدیوں کی گمراہی' شرک' جہالت اور تفرقے سے نجات دلائی۔ آپ کے پاس کون سی جزائے خیر موجود ہے۔

کیا ہمارے پاس شہد اور کباب سے بہتر غذا' ریشم سے بہتر بستر اور ہوائی جہاز سے بہتر سواری ہے؟

کیا یہ غذا' یہ بستر اور یہ سواری' وہی چیزیں نہیں ہیں جن سے کبھی کبھی

گنہگار بھی فائدہ اٹھا لیتے ہیں تو پھر پیغمبر اکرمؐ کی جزا کیا ہوئی۔

کیا دنیا میں ایسا کوئی شہید موجود ہے جس نے کسی پاک مقصد کے لیے اس لیے جان دی ہو تا کہ آپ اسے اس کی قربانی کی جزا دے سکیں؟

اس کے علاوہ کبھی کبھی ایسے گنہگار اور مجرم بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو سیکڑوں ہزاروں بیگناہوں کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ آپ کسی ایسے فرد کو اس دنیا میں کس طرح قرار واقعی سزا دے سکتے ہیں۔ بالفرض ہم اسے موت کی سزا دیں تو یہ ان ہزاروں انسانوں میں سے صرف ایک ہی کے قتل کی سزا ہو گی جنہیں اس نے قتل کیا ہے۔ باقی بیگناہوں کے خون کا کیا ہو گا؟

دنیا میں بدلے کی مثالیں

ہماری گفتگو اس بارے میں ہے کہ مکمل سزا دوسری دنیا میں ملنا چاہیے۔ یہ سزا ان بعض وقتی سزاؤں اور گوشمالیوں کو مانع نہیں ہے جو بعض افراد کو اس دنیا میں ہی دیدی جاتی ہیں۔ بہت سی قرآنی آیات بتاتی ہیں کہ خدا مجرموں کو بعض سزائیں اسی دنیا میں چکھا دیتا ہے۔ جیسے قرآن کہتا ہے: لوگوں کے اعمال کے باعث پانی اور خشکی میں اس لیے فساد پیدا ہوا کہ خدا ان کے بعض اعمال کی سزا انھیں چکھا دے ممکن ہے کہ وہ گناہ سے باز رہیں[1]

ایسی بہت سی آیتیں ہیں جو مجرموں کے بارے میں کہتی ہیں: گنہگاروں کے لیے دنیا میں بھی ذلت و خواری اور شرمندگی ہے[2] لیکن اصل میں یہ سزا

---

[1] سورۂ روم۔ آیت ۴۱ [2] سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۱۴

ان کی اس سزا کا ایک ذرا سا حصہ ہے جو انھیں قیامت میں دیکھنا ہوگی۔ اس مقام پر ہمارا قرآن کے کچھ چھوٹے چھوٹے جملے نقل کرنا مناسب رہیگا۔

ان پر دنیاوی زندگی میں بھی عذاب ہے لیکن روز قیامت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔[1] ایک اور مقام پر یہ فرمانے کے بعد کہ جو کوئی ہماری یاد سے غفلت برتے گا ہم اس پر کڑا وقت ڈالیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس کی دنیاوی سزا ہے۔ قیامت کے دن کا عذاب اس سے زیادہ سخت اور ابدی ہوگا۔[2]

قرآن میں ایک اور مقام پر ہم یہ پڑھتے ہیں: ہم انھیں بڑے عذاب سے پہلے جلد ہی چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے تاکہ وہ غلط راہ سے پلٹ آئیں۔[3]

قرآن ان لوگوں کے بارے میں جو کسی دلیل و برہان کے بغیر (صرف حق کے مقابل اکڑنے کے لیے) جو کچھ سنتے ہیں اس سے انکار کر دیتے ہیں فرماتا ہے: ان جاہل لوگوں کے لیے دنیا میں خواری ہے اور قیامت میں بھی ہم انھیں جلانے والا عذاب چکھائیں گے۔[4]

قرآن میں ایک اور مقام پر ہم یہ پڑھتے ہیں: ہم نے قوم عاد کے لیے جس نے اپنے پیغمبر کے سامنے غرور کیا تھا تیز اور ٹھنڈی ہوا اور وہ بھی منحوس اور ناگوار دنوں میں بھیجی لیکن یہ ان کے غرور کی سزا کا ایک حصہ ہے قیامت میں وہ اس سے بھی زیادہ خوار کرنے والا عذاب چکھیں گے۔[5]

---

[1] سورۂ رعد آیت ۳۴ [2] سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲۷ [3] سورۂ سجدہ آیت ۲۱ [4] سورۂ حج آیت ۹ [5] سورۂ حٰم سجدہ آیت ۱۶

ہم نے اب تک ایسی آیتیں نقل کی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ کبھی کبھی خدا مجرموں کو دنیا میں بھی ان کی سزاؤں کا ایک حصہ دکھا دیتا ہے لیکن جزا و سزا کی اصلی جگہ قیامت میں ہے۔ واضح رہے کہ روایتوں میں بھی دنیاوی جزا دیکھنے میں آتی ہے مثلاً ہم حدیث میں پڑھتے ہیں: "جو کوئی دوسرے کے لیے کنواں کھودتا ہے وہ خود اس میں گر پڑتا ہے۔ خدا والدین کی بے عزتی کرنے، لوگوں پر ظلم ڈھانے اور احسان فراموشی کی سزا اسی دنیا میں دیدیتا ہے اور قیامت کے دن کے لیے اٹھا نہیں رکھتا۔[1]

دنیا میں سزا کی مثال

اگر ہم دنیا میں سزا اور جزا پانے کی کچھ مثالیں بھی یہاں نقل کر دیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ ویسے اعمال کا اصلی بدلہ قیامت میں ہی ملے گا کیونکہ یہ دنیا نیکوں کی جزا اور بدوں کی سزا کی نسبت بہت چھوٹی ہے۔

نبیوںؑ کے حامی جنگجوؤں کی بہادری اور ثابت قدمی بیان کرنے کے بعد قرآن فرماتا ہے: خدا نے ان کو دنیا میں بھی ثواب اور کامیابی عطا فرمائی اور قیامت میں بھی نیک صلہ دیگا۔[2]

ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بھی پڑھتے ہیں: ہم نے ابراہیمؑ کو دنیا میں نیکی عطا کی۔[3]

بڑے بڑے پیغمبروں، ان کے طرفداروں بلکہ دنیا میں انکی امداد دن

---

[1] سفینۃ البحار مادہ بغی
[2] سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۸
[3] سورۂ نحل، آیت ۱۲۲

کے بارے میں بھی یہ ملتا ہے: ہم اپنے پیغمبروں کی اسی دنیا میں ایسے لوگوں سے مدد کرتے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں [1]

شاید ہم اپنے موضوع سے ہٹ گئے ہیں پھر بھی زیادہ دُور نہیں گئے۔ ہماری گفتگو یہ تھی کہ دنیا میں سزا جزا کیوں نہیں ہے۔ اب ہم اسکے تیسرے جواب میں اس مقام تک آپہنچے ہیں کہ دنیا میں سزا و جزا کا ایک جزو اور مثال ہے کیونکہ اصلی جزا تو قیامت میں ہی ملیگی۔

چوتھا جواب:

آپ اب تک اس سوال کے کہ خدا دنیا میں جزا کیوں نہیں دیتا، تین جواب پڑھ چکے ہیں۔ آیئے اب ہم اس کا چوتھا جواب پڑھتے ہیں جو سورۂ نحل سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر خدا انسانوں کو انکے ظلم اور گناہ کی سزا دے تو کوئی ذی روح زمین پر باقی نہ رہے اس لیے خدا ان کو جلد سزا نہیں دیتا بلکہ انھیں اس وقت تک کے لیے مہلت دیتا ہے جو صرف اسی کو معلوم ہے اور سزا کو ملتوی کر دیتا ہے [2]

یہی بات ہم سورۂ فاطر کی آخری آیت میں بھی پڑھتے ہیں: اگر خدا دنیا میں سزا دینا چاہے تو کوئی شخص روئے زمین پہ زندہ نہ بچے [3] بنیادی طور پر انسانی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے اور زمین پہ انسان اور اسکی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

اس لیے خدا کی حکمت اور ارادہ یہ ہے کہ انسان تام کی ایک آزاد اور

---

[1] سورۂ غافر، آیت ۵۱ [2] سورۂ نحل، آیت ۶۱

[3] سورۂ فاطر، آیت ۴۵

اور بااختیار ہستی ایک خاص عرصے تک زمین پر زندہ رہے تو لازم ہے کہ وہ نافرمانوں کو بھی مہلت دے ورنہ جیسے ہی کوئی نافرمانی کرے وہ بھی اسے مار ڈالے تو پھر یہاں ایک بھی انسان باقی نہیں رہے گا۔ آخر کس نے خدا کی نافرمانی نہیں کی ہوگی اور کیا اس کی نافرمانی اور بے ادبی کی سزا موت سے کم بھی ہو سکتی ہے۔

پانچواں جواب:

اگرچہ دنیا میں وقتی سزائیں دینا انسان کو ہوشیار کرنے' توجہ دلانے اور چونکا دینے کا وسیلہ ہیں لیکن اگر ہر گنہگار اسی دنیا میں اپنی سزا کو پہنچے تو یہ لطف خداوندی کی کمی ہوگی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ گنہگار بھی توبہ کرنے' خدائی احکام کی خلاف ورزی چھوڑ دے اور جو سچی بات اس نے چھپائی ہے اسے ظاہر کر دے۔ ہم نے ایسے کتنے ہی گنہگاروں کو دیکھا ہے یا انکے متعلق سنا ہے جنہوں نے موت سے پہلے توبہ کر کے اپنا رویہ تک بدل ڈالا۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس انسان کو جو کمزور ہے' خواہشاتِ نفسانی کا شکار اور بدی کی قوتوں کا قیدی ہے اسے آخر وقت تک کی مہلت دی جائے۔ جو ممکن ہے حضرت حُر کی طرح منقلب ہو جائے۔ اگرچہ بعض لوگ خدا کی اس مہلت کا ناجائز فائدہ اٹھائیں گے تاہم مجموعی طور پر اس سے انسانوں کو فائدہ پہنچے گا اس لیے لطفِ خداوندی کا یہ تقاضا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں سزا نہ دی جائے اور اسے مرتے وقت تک کے لیے توبہ کی مہلت دی جائے۔

چھٹا جواب :

سزا و جزا اس وقت عادلانہ ہو گی جب ہم صرف عمل پر ہی دھیان نہ دیں بلکہ اسکے اسباب پر بھی غور کریں۔ بقول قرآن: "ہم ان کے کاموں کے پہلے کا عمل بھی لکھیں گے اور بعد کے اثرات بھی درج کریں گے[1]۔"

فرض کیجیے کہ کسی مجلس میں ایک شخص دندناتا آیا اور چراغ بجھا کر بھاگ گیا۔ چراغ بجھانے کی کوئی بڑی سزا نہیں ہو سکتی۔ اس کے عوض میں شاید ایک طمانچہ بھی زیادہ ہو گا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس چراغ کے بجھنے سے کون کون سے مسئلے پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دری یا قالین پر آگ گر سکتی ہے، جو اس کو جلا دے۔ کوئی شخص کسی ہتھیار یا چاقو سے دوسرے شخص کو زخمی کر سکتا ہے۔ اس اندھیرے میں لوگ سیڑھیوں سے گر سکتے ہیں۔ ان کے سر دیواروں سے ٹکرا سکتے ہیں۔ میزوں کے گرنے سے برتن ٹوٹ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر ہم مجرم کو پکڑ لیں تو ہمارے سامنے صرف چراغ بجھانے کا مسئلہ ہی نہیں ہو گا بلکہ فوری اور وقتی انصاف یہ ہو گا کہ ہم ان تمام نقصانات کا بھی شمار کریں جو اس شخص کی اس حرکت سے پہنچے ہیں۔ آپ کے اس مثال پر توجہ دینے کے بعد اب ہم اصل مطلب کی طرف آتے ہیں۔

جب کوئی شخص جان لیوا ہیروئن یا کوئی صحت بخش دوا ایجاد کرتا ہے تو ایسے شخص کو فوری پاداش دینا انصاف پر مبنی نہیں ہو گا۔ ہمیں دنیا کی عمر کے اختتام تک انتظار کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی ہیروئن نے

---

[1] سورۂ یٰسٓ۔ آیت ۱۲

کتنے لوگوں کی جان لی ہے اور اس کی دوا نے کتنے مریضوں کو شفا بخشی ہے۔ اس کے بعد ہم کو اسے بدلہ دینا چاہیے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص ایک فلم، کتاب، کیسٹ یا کسی اور چیز سے کوئی خرابی یا بہتری پیدا کرتا ہے اور لوگوں پر برسوں تک کے لیے اچھا یا برا اثر ڈالتا ہے تو ایسے معاملات میں ہمیں جزا و سزا کے لیے عجلت نہیں کرنا چاہیے اور نہ صرف اس عمل ہی کو زیر غور لانا چاہیے بلکہ دنیا کی عمر کے اختتام تک انتظار کرنا چاہیے تاکہ ہم اس کے کام کی اچھائی یا برائی کو جانچ کر اسے اس کے کیے کی جزا یا سزا دے سکیں۔ یہ بات نہ صرف عقل پر مبنی ہے بلکہ قرآن اور حدیث سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ قرآن میں تو وہی سورۂ یٰسٓ کی بارھویں آیت ہے، جو آپ تھوڑی دیر پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اسلامی روایات میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ:

جو شخص کسی ریت یا نیک کام کی ابتدا کرتا ہے وہ اس کے بدلے میں ان لوگوں کے ساتھ شریک ہوگا جو اس طریق پر چلیں گے یا اس کام کو انجام دیں گے، تاہم اس کی وجہ سے دوسروں کے بدلے میں کمی نہیں آئے گی۔ اس کے برعکس، جو شخص فساد کی جڑ قائم کریگا یا لوگوں کو غلط راہ پر ڈالے گا تو اس راہ پر چلنے والے تو گنہگار رہوں گے ہی ان لوگوں کے برابر کا گناہ اس راہ ریت کی بنیاد رکھنے والے شخص کے لیے بھی لکھا جائے گا۔[1]

خلاصہ یہ کہ معاد کی پہلی دلیل خدا کا عدل ہے، یعنی تین مقدمات سے

---

[1] سفینۃ البحار مادہ سن و بحار جلد ۲ صفحہ ۲۶۱

یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کا برپا ہونا خدا کی عدالت کے عین مطابق ہے اور وہ مقدمات یہ ہیں:

۱۔ لوگ خدا اور انبیاءؑ کے احکامات کے لحاظ سے دو گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں، موافق اور مخالف۔

۲۔ ان چھ جوابات کی رو سے بھی جو ہم دے چکے ہیں دنیا دارالجزا نہیں ہے۔

۳۔ خدا عادل ہے اس لیے یہ بات پکے عقلی دلائل سے ثابت ہو چکی ہے کہ وہ لوگوں کے اعمال کا بدلہ ضرور دیگا اس لیے جزا و سزا کی کوئی جگہ ہونا چاہیے اور وہ قیامت ہے۔

عدلِ الٰہی کے متعلق آیات

قرآن میں بہت سی آیات ملتی ہیں جو لوگوں کی عقل اور ضمیر سے پوچھتی ہیں کہ کیا اچھے اور برے لوگ برابر ہیں، کیا ان میں کوئی فرق نہیں ہوگا؟

کیا وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے ان لوگوں کی طرح ہیں جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ کیا ہم متقی لوگوں کو بدکاروں اور مجرموں کے برابر سمجھیں؟[۱] کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کے مانند سمجھیں؟[۲]

کیا مومن اور فاسق یکساں ہو سکتے ہیں؟[۳]

کیا گنہگار یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو مومنوں اور ان لوگوں کے برابر مان لیں گے جنھوں نے نیک کام کیے ہیں؟[۴]

۱؎ سورۂ صٓ، آیت ۲۸ ۲؎ سورۂ قلم آیت ۳۵ ۳؎ سورۂ سجدہ، آیت ۱۸، ۴؎ سورۂ جاثیہ، آیت ۲۱

ہم نے عدلِ الٰہی کے متعلق کچھ قرآنی آیات عدل کے باب میں لکھ دی ہیں۔

اب آپ ان تمام باتوں کا خلاصہ جو کہی جا چکی ہیں اس باب میں ملاحظہ کریجیے۔ پھر بھی اس خیال سے کہ تحریر کا باہمی تعلق ٹوٹ نہ جائے جو کچھ کہا جا چکا ہے ہم اسے دہراتے ہیں تاکہ تسلسل اور روانی قائم رہے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہر ہونے (وقوعے) کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں۔

۱۔ ہونے کا امکان، جس کے متعلق ہم نے چند صفحات لکھے ہیں۔

۲۔ ہونے کا سبب، انسانوں کا دو گروہوں میں بٹنا، دنیا میں گنجائش نہ ہونا اور خدائی انصاف جس کے بارے میں ہم نے تفصیل سے لکھا ہے۔

اب رہ گئی تیسری شرط اور وہ ہے کسی رکاوٹ کا نہ ہونا۔

دوبارہ زندہ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں

عام طور پر رکاوٹ چھوٹی طاقتوں کے لیے ہوتی ہے مثلاً ایک گاڑی جو صرف ایک ہی راہ پر چلنے کے لیے مجبور ہے، اس کے لیے اس مجبوری کو دُور کرنے کی کوئی تدبیر بھی نہیں ہے۔ راستے میں پڑا ہوا ایک بڑا سا پتھر اس کی حرکت میں رکاوٹ بن سکتا ہے لیکن یہ پتھر اس پرندے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں بنتا جو ایک خاص راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہیں ہے۔ ہاں طاقت اور علم جتنا ہوگا ان چیزوں کی تعداد جو رکاوٹ بن سکیں اتنی ہی کم ہو جائے گی۔

مُردوں کے زندہ ہونے اور بکھرے ہوئے ذرات کے اکٹھے ہونے کی دو شرطیں ہیں:

۱ - بیحد علم ۲ - لامحدود طاقت و قدرت

خدا کے اس لامحدود علم کے سامنے جو ذرّے ذرّے کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ "ہم جانتے ہیں کہ زمین ان میں سے کس قدر مٹا دیتی ہے۔ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب باتیں محفوظ ہیں[1]" اس کی لامحدود قدرت کے سامنے جو بکھرے ہوئے ذرات کو یکجا کر سکتی ہے کسی رکاوٹ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے تقریباً چالیس مرتبہ کہا ہے: "بے شک اللہ ہر چیز پہ قادر ہے[2]" ہم خود مٹی کے بکھرے ہوئے ذرات سے بنے ہوئے ہیں کیونکہ ہم بھی اس دنیا میں اس گیہوں کی بدولت موجود ہیں جو کسی خاص علاقے کی مٹی میں پیدا ہونیوالا غذائی مواد ہے یا چاول اور پھلوں کی بدولت زندہ ہیں جو ایک اور علاقے کی مٹی سے ترکیب پانے والا غذائی مواد ہے۔ ہم ایک عرصے تک باپ کے نطفے کی صورت میں، پھر ماں کی بچہ دانی میں اور اس کے بعد دنیا میں آ گئے۔ ہاں اس وقت ہمارے جسم کا ہر خلیہ زمین کے کسی نہ کسی علاقے سے آیا ہے۔ جس قدرت نے اس دنیا میں ہمیں بکھرے ہوئے ذرات سے بنایا ہے وہی قیامت میں بھی ان گلی سڑی ہڈیوں کے بکھرے ہوئے ذرات سے ہمیں دوبارہ زندہ کر دے گی۔

البتہ کبھی شیطان ہمیں اس شبہے میں ڈال دیتا ہے کہ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن قرآنی آیات اس شبہے کو ایسے جملوں "یہ خدا کے لیے آسان ہے[3]" جیسے

---

[1] سورۂ قٓ۔ آیت ۴ [2] سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۰ [3] سورۂ عنکبوت۔ آیت ۱۹، قٓ۔ آیت ۴۴۔ تغابن۔ آیت ۷، [4] سورۂ نساء۔ آیت ۳۰

جو قرآن میں بار بار آئے ہیں، دور کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ خدا کے لیے مُردوں کا زندہ کر دینا نہایت آسان کام ہے۔

اصلی مشکل

ہمارے کام کی اصلی مشکل یہ ہے کہ ہم خدا کی قدرت اور علم کو اپنے ہی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ ہم خود محدود ہیں اس لیے لامحدود کا تصور نہیں کر سکتے۔ قرآنی قصوں میں اول سے آخر تک یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ خدا ہمارے سوچ بچار کو اس مادّی چوکھٹے کے اثر سے باہر نکالنا چاہتا ہے اس لیے:

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے مریم نامی ایک کنواری لڑکی کو بچہ عطا فرمایا۔[1]

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے نومولود بچے کو پالنے میں بولنے کی قوت بخشی۔[2]

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے ابابیل نامی پرندوں کے ذریعے سے فیل نشینوں کو مروا ڈالا۔ (سورۂ فیل۔ آیت ۴)

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے ایک لاٹھی مار کر پتھروں سے پانی کے بارہ سوتے نکالے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۶۰)

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پھونک سے مُردوں کو زندہ کر دیا۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۱۰)

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے ایک بوڑھے کو اسکی بانجھ بیوی کے بطن سے یحیٰی نامی بیٹا عطا کیا۔ (سورۂ ہود۔ آیت ۷۲)

---

[1] سورۂ مریم۔ آیت ۲۰ [2] سورۂ مریم۔ آیت ۳۰

اگر وہ کہتا ہے کہ ہم نے خود فرعون کے دامن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تربیت دلوائی۔ (سورہ قصص۔ آیت ۸)

تو یہ اور دوسری سیکڑوں مثالیں سب کی سب صرف اس لیے پیش کی گئی ہیں کہ انسانی سوچ کا تناظر اس مادی چوکھٹے سے جس سے انسان مانوس ہو چکا ہے زیادہ وسیع ہو جائے اور فطرت کے باہر بھی کچھ سوچے۔ قرآن پڑھنے کی سفارش اسی قسم کے خیالات کے یاد دلانے کے لیے ہے۔ ہاں ہمیں چاہیے کہ ہم فطری قوانین کے پورے پورے احترام کے باوجود اپنے سوچ بچار کو ان کے چوکھٹے میں قید نہ کر دیں کیونکہ خدا جو چاہتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ خدا کے لا محدود علم اور قدرت کے آگے کوئی روک رکاوٹ تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

دوسری دلیل۔ خدا کی حکمت

ہم نے خدائی عدل کو معاد کی پہلی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اب ہم دوسری دلیل پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر قیامت نہ ہو تو خود انسان اور دنیا کی پیدائش ہی فضول، بیکار اور خدا کی دانائی کے خلاف ٹھیرے گی۔

فرض کیجیے کہ ایک شخص طرح طرح کے تازہ تازہ اور مزیدار کھانے اپنے پیارے مہمانوں کی محبت میں خصوصی توجہ کے ساتھ تیار کرتا ہے، پھر یہ کھانے اور مشروبات ایک خوشنما شامیانے کے نیچے، مہمانداری کے ذمہ دار لوگوں کی نگرانی میں سجا دیتا ہے اور مہمانوں کی خاطر بہت

سے لوگوں کو نگرانی، انتظام اور حفاظت پر مقرر کر دیتا ہے لیکن ان تمام تکلفات کے بعد، وہ بد تمیز مہمان چوہے بلیوں کی طرح اس دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اسے الٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دستر خوان سمیٹتا ہے۔ بتایئے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ہاں تو اگر معاد نہ ہو تو خدا کا کام اس دعوت اور کھانا کھلانے سے کہیں زیادہ بے مقصد قرار پائیگا۔

خدا نے بھی دنیا کی شکل میں انسانوں کے سامنے ایک دستر خوان بچھا دیا ہے۔ نیا دستر خوان جس کو ایجاد کرنیوالا وہ خود ہے[۱]

یہ بہت اچھا اور خوشنما دستر خوان ہے[۲] ایسا خدا جس نے ہر شے خوب پیدا کی۔ ایسا دستر خوان جس کا حساب کیا گیا اور گہری نظر سے اندازہ لگایا گیا ہے۔ خدا کے نزدیک ہر چیز مقدار اور تول میں پوری اور پکی ہے[۳]

ایسا دستر خوان جو خدا کی رحمت پر مبنی ہے کیونکہ اس نے لطف اور رحمت کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے[۴]

ایسا دستر خوان جس پر طرح طرح کی نعمتیں چنی ہوئی ہیں یعنی جو کچھ زمین میں ہے وہ اس نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے[۵] وہ بہت سی من بھاتی اور مزے کی چیزیں ہیں یعنی ہم نے پاکیزہ چیزوں کو لوگوں کی روزی بنا دیا ہے[۶]

۱؎ سورۂ انعام۔ آیت ۱۰۱ ۲؎ سورۂ سجدہ۔ آیت ۷ ۳؎ سورۂ رعد۔ آیت ۸ ۴؎ سورۂ انعام۔ آیت ۱۲ ۵؎ سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۹ ۶؎ سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۰

ایک ایسا دستر خوان جو خوشنما شامیانے کے نیچے بچھا ہوا ہے

ہم نے تمہارے لیے آسمان کو ستاروں سے سجا دیا ہے[1]

اس دستر خوان کے ساتھ بہت سے کارکن وابستہ ہیں جو اس کے انتظام اور تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ ان فرشتوں کی قسم جو دنیا کے معاملات کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں[2] ان فرشتوں کی قسم جو دنیا کے انتظام کے ذمہ دار ہیں[3]

ایک ایسا دستر خوان جس کے ساتھ علاج کے لیے ہمدرد معالج اور گشتی ڈاکٹر ہے

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول اکرمؐ ایسے معالج تھے جو لوگوں کی محبت اور ہمدردی کی وجہ سے خود گشت لگایا کرتے تھے اور روحانی بیماروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کا علاج کیا کرتے تھے۔ واقعی یہ بات تو مانی جا سکتی ہے کہ دانا خدا نے ایک ایسا دستر خوان اس کی تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ نسل انسانی کے لیے بچھا دیا ہے لیکن بہت سے لوگوں کو اس کے آداب کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہے۔ ان کا ایک گروہ ظالم ہے جو ہر طرح سے آرام میں اور آزاد ہے جبکہ دوسرا گروہ قید و بند میں ہے مفلس اور مظلوم ہے۔ کچھ عرصے کے بعد سب مر جائیں گے اور دستر خوان لپیٹ

---

[1] سورۂ صافات۔ آیت ۶ [2] سورۂ ذاریات۔ آیت ۴

[3] سورۂ نازعات۔ آیت ۵

دیا جائے گا۔ کیا اس صورت میں یہ کام دانائی کا ہے؟

اے خدا! تو نے یہ کائنات بے مقصد اور باطل پیدا نہیں کی تو ہر قسم کی لغویات اور عیب سے پاک ہے۔

قرآن میں خدا کو تقریباً سو مرتبہ حکیم کہا گیا ہے اور ہم اس کی حکمت کی نشانیاں ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ آنکھوں کی پلکوں میں، تلوؤں کے خم میں، ماں کی محبت میں، دودھ پیتے بچے کے چوسنے کے عمل میں، آنکھ کے ساتھ کھاری پانی اور منہ کے ساتھ میٹھے پانی کی مناسبت میں، انسان کے سانس میں آکسیجن اور نباتات کے کاربن کھینچنے میں، کان سے لہروں، آنکھ سے روشنی اور نظام ہضم سے غذاؤں کی مناسبت میں، زمین کی خاموش حرکت میں، انسان کی تمام ضروریات کی تکمیل اور کثیر و وافر نعمتوں میں، جو بقول قرآن شمار بھی کرنا چاہو تو نہ کر سکو۔ ایک ایسا بھید بھرا عالم جس کے ایک بھید کو سمجھنے کے لیے مادیات کے اسکالر اپنی تمام عمر صرف کر دیتے ہیں اور پھر بھی اخیر عمر تک کچھ نہیں سمجھ پاتے۔ کیا یہ دنیا اس قدر نزاکت، پختگی اور پاکیزگی کے باوجود صرف چند روز کی زندگی اور اس کے بعد ختم ہو جانے کے لیے ہے۔

ایک اور مثال

کیا آپ اس کی اجازت دیں گے کہ ایک افسر بالا کی طرف سے ایک کمرہ بنانے کا حکم صادر ہو جو پانی، بجلی، ٹیلیفون، گرم کرنے اور سرد کرنے کے انتظامات، پردوں، میزوں اور لاؤڈ اسپیکروں وغیرہ سے آراستہ ہو۔

لہ سورۂ آل عمران - آیت ۱۹۱

جب وہ کمرہ بن جائے تو اس میں محض ایک دو بار بیٹھنے اٹھنے کے بعد اسے بم سے اڑا دیا جائے۔ پھر ہم اس بات کا کیسے یقین کریں کہ جس خدا نے اتنی بڑی کائنات اتنی باریک بینی سے پیدا کی ہو وہ تھوڑے عرصے کے بعد ہی اسے زلزلے اور دھماکے سے برباد کر دے۔

کیا آبخورہ بنانے والا اپنے بنائے ہوئے آبخورے کو توڑنے اور ناپید کر دینے پر تیار ہو جائیگا؟ پس اگر معاد نہ ہو تو پھر خدا کا کام صرف اتنا ہی ہوگا کہ وہ مٹی سے گیہوں' گیہوں سے نطفہ' نطفے سے بچہ بنائے' پھر اسے طاقتور جوان بنا دے اور کچھ عرصے کے بعد وہ ایک بوڑھے انسان کی شکل میں آجائے' پھر مر جائے اور گل سڑ کر مٹی ہو جائے۔ سچ تو یہ ہے' اگر یہی کچھ ہونا تھا کہ اتنے تغیر اور تبدیلی کے بعد ہم مٹی ہو جائیں اور معاد بھی نہ ہو تو ہم سرے سے مٹی ہی کیوں نہ رہتے۔ کیا یہ ایک کھیل اور بیکار کا کام نہیں ہے؟

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بلا وجہ پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف واپس نہیں آؤ گے؟"[1] کیا اس آسمان' زمین' دریا' سورج' درخت اور جانوروں کا انسان کے لیے ہونا اور انسان کا مرنے اور مٹ جانے کے لیے ہونا درست کام ہے؟

اگر معاد نہ ہو تو ایک انسان کی زندگی کے معنی ہزاروں لیٹر پانی کو پیشاب میں اور ہزاروں کلو گرام غذا کو پاخانہ میں تبدیل کرنا قرار پاتا ہے۔ پھر شمع کی روشنی اور گدھے کی سواری یا طیارے کی سواری اور بجلی کی روشنی اصل زندگی میں کوئی فرق نہیں رکھتی۔

---

[1] سورۂ مومنون - آیت ۱۱۵

مارکس ازم جو مزدوروں کے حقوق، مزدوروں کی حکومت، کام کی اہمیت اور مزدوروں کے بیمے، علاج، رخصت، ہڑتال اور بونس وغیرہ کے حق کی بات کرتا ہے۔ آخرکار یہی کہتا ہے کہ یہ تمام باتیں موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ اس کے بعد ہم مٹ جاتے ہیں۔

واقعی اگر اس سارے کام، روش اور نعرے کا مقصد اس زندگی کی خاطر کھانے، کپڑے اور گھر کا حصول ہے اور اس کے بعد صرف مٹ ہی جانا ہے تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ لوگ اتنی مصیبت اٹھانے سے پہلے ہی خودکشی کر لیں؟ ایسی مشین بنانے سے کیا فائدہ جو درّے کا دروازہ گرانے جاتی ہے۔

جب یہ طے ہے کہ ہم مرنے کے ساتھ ہی مٹ جائیں گے تو پھر اتنی تکلیف کیوں اٹھائیں۔ واقعی وہ جوانی جو چند دن کے بعد مٹ جانےوالی ہے وہ مہندی لگانے، سنگھار کرنے اور لباس پر نقش بنانے کی سوچے وہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

اگر ہم موت آتے ہی نابود ہو جائیں گے تو پھر ہماری فطرت میں بقا چاہنے والی جبلت کیوں رکھی گئی ہے؟ ہاں! مادی اور اشتمالی سوچ میں دنیا کا مستقبل تاریک اور فانی ہے۔ یہاں کیے جانے والے کاموں کا مقدر تباہی اور انسانی عمر کا انجام بے فائدہ اور بے حقیقت ہے۔ اس نقطۂ نظر کے باعث کبھی کبھی انسان پوچھنے لگتا ہے، میں کیوں پیدا کیا گیا ہوں اور کس لیے ہوں؟ اگر میں ہوں تو بھیڑیا کیوں نہ بن جاؤں اور کیوں نہ کامیابی حاصل کروں چاہے وہ بہت سے انسانوں کی ہلاکت سے

بھی ملے۔ اب جو ہیں بھی اور تمام انسان بھی موت کی طرف بڑھ رہے ہیں تو اجازت دو تاکہ دوسروں کی فنا میری لذت کا باعث بنے۔ اگر انسان حیوانوں کی طرح زوال پذیر ہیں تو اجازت دو کہ ہم انسانوں پر پوری طرح سواری بھی کریں اور ان کے گوشت سے مزیدار غذا بھی حاصل کریں جب سبھی موت کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں تو اجازت دو کہ وہ میرے ہی منہ کے مزے کے لیے قربان ہوں۔ ہاں! مادیت کا یہ خطرناک سوچ' سماج کو اس حال میں پہنچائے دیتا ہے جہاں وہ اس وقت پہنچ چکا ہے۔ اگرچہ بعض ملکوں میں قحط کا شور مچا ہوا ہے لیکن دنیا کے ترقی یافتہ ممالک اپنے غلے کی قیمتوں کو قائم رکھنے کے لیے گیہوں اور پھل سمندر میں بہا دیتے ہیں یا زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔ پھر ٹیلیویژن پر ایسی تصویریں بھی دکھا دیتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں "وحی" سے پوچھنا چاہیے کہ اس نے حکمت الٰہی کی رو سے معاد کا لازم ہونا کس طرح بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ آزاد ہے اور اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟[1] یعنی اس کا خیال ہے کہ وہ مر جائیگا اور اس کے بعد کچھ نہیں ہوگا؟ قرآن میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ ہم دنیا میں کھیل اور تفریح کے لیے نہیں آتے ہیں۔ نہ ہم کو بے مقصد اور غلط کام کرنے ہیں۔ نہ ہمارے مقاصد معمولی اور سادہ ہیں' نہ دنیا میں گم ہونا مطلوب ہے بلکہ ہماری پیدائش حق کے مطابق انسانوں کی تربیت اور آزمائش کے لیے ہے جو قاعدے اور روش کے ستونوں پر قائم ہے۔ اس تخلیق کا مقصد

---

[1] سورۂ قیامت - آیت ۳۶

بہت سے غیر الٰہی راستوں میں سے خدا کے راستے کا انتخاب کرنا، خدا کو پہچاننا اور اس کی عبادت ہے، پس جلد یا بدیر تمہارا یہ راستا، خدا کے پاس جا کر ختم ہو گا۔ "ہم خدا ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔"[1]

یہ دنیا ایک کھیتی ہے جس کی فصل قیامت میں کاٹی جائے گی، جہاں ہر مرد اور عورت کے ہر فعل کی جزا و سزا دی جائے گی۔[2] "کیونکہ "ہر انسان اپنے عمل کا قیدی ہے۔"[3]

لقمان حکیم اپنے بیٹے سے فرماتے ہیں: اے بیٹے! اگر تو رائی کے ایک دانے کے برابر بھی کام کرے گا، چاہے وہ کام سب سے مضبوط علاقے اور سخت پتھروں کے درمیان ہو، چاہے وہ سب سے دُور دراز علاقوں اور آسمانوں میں ہو، چاہے سب سے گہری جگہوں اور زمین اور مٹی کے اندر ہو پھر بھی خدا قیامت کے دن اس عمل کو نکال لے گا[4] اور کوئی بات اس کی نظر سے اوجھل نہیں رہے گی۔

ایک سچّا واقعہ

ایک شخص مسجد نبوی میں آیا اور کہنے لگا: اے خدا کے رسولؐ! مجھے قرآن شریف پڑھائیے۔ آنحضرتؐ نے اسے اپنے ایک صحابی کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے اس شخص کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف لے جا کر سورۂ زلزال پڑھانے لگے۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے "جو کوئی ذرہ برابر

---

[1] سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۶ [2] سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۲

[3] سورۂ مدثر۔ آیت ۳۸ [4] سورۂ لقمان۔ آیت 15

بھی نیکی یا بدی کریگا وہ اس کا پھل پائے گا۱؎" تو اس شخص نے کچھ سوچ کر اپنے معلم کی طرف دیکھا اور بولا: کیا یہ جملہ وحی ہے؟ معلم نے جواب دیا: ہاں۔ وہ کہنے لگا: میں نے اپنا سبق اسی آیت سے حاصل کر لیا۔ جب اس دنیا میں سرزد ہونیوالے میرے چھوٹے بڑے اور کھلے ڈھکے کاموں کا حساب ہونا ہے تو میری ذمہ داری واضح ہو گئی۔ یہی آیت مجھے زندگی کی راہ بتانے کے لیے کافی ہے۔ میں چلا، خدا حافظ!

جب وہ شخص چلا گیا تو وہ معلم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور کہنے لگا: ہمارا آج کا یہ شاگرد بہت کم حوصلے والا تھا۔ اس نے یہ بھی نہ کرنے دیا کہ میں ایک چھوٹی سی سورت کے علاوہ اسے کچھ پڑھ کر سناتا۔ وہ بول اٹھا: اگر گھر میں کوئی شخص موجود ہے تو اس کے لیے بس ایک آواز ہی کافی ہے۔ بس میں نے سبق حاصل کر لیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: شریعت اور گہری معرفت کے جس مقام تک اسے پہنچنا چاہیے تھا وہ وہاں تک پہنچ گیا۔

مقام افسوس

اس شخص نے تو ایک آیت سے اپنا راستا پہچان لیا۔ سمجھ بھی گیا اور بدل بھی گیا لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ مجھ جیسے لوگ برسوں تک آیات و روایات اور عقلی و نقلی دلائل سے مختلف طریقوں سے بہترین گفتگو کرتے رہتے ہیں لیکن ....

۱؎ سورۂ زلزال۔ آیت ۷۔۸

لینے دینوں کو ترغیب

ہمارے معصوم رہبروں کی اپنے مخالفوں کے ساتھ جو گفتگوئیں ہوئی ہیں ان میں ایک دلچسپ انداز فکر نظر آتا ہے جسے ہم یہاں مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔

ہمیں روزانہ زندگی میں ایسی اطلاعیں ملتی ہیں جن میں کوئی اہم پیغام اور تنبیہ ہوتی ہے۔ ہم پر اس قسم کی باتوں کا مختلف اثر پڑتا ہے یعنی ان میں نفع نقصان کا امکان جتنا زیادہ ہوگا یا خطرہ جتنا بڑا ہوگا ہمارا ردِّ عمل بھی اتنا ہی زیادہ سخت ہوگا۔

مثلاً کسی معاملے میں فائدے کا امکان ۹۰ فیصدی ہو لیکن منافع کی مقدار ۵ فیصدی حاصل ہو تو اس صورت میں اگرچہ منافع کم ہے لیکن اس کی اصل قریب قریب طے ہے لوگ آگے بڑھیں گے اور معاملے میں شریک ہو جائیں گے۔

اگر منافع کا امکان ٪۹۰ کے بجائے ٪۷۰ ہو لیکن منافع کی مقدار ٪۳۰ ہو تب بھی لوگ آگے بڑھیں گے کیونکہ اگر امکان گھٹ گیا ہے تو منافع کی مقدار بڑھ گئی ہے اور اگر منافع کا امکان ٪۴۰ ہو اور منافع بہت زیادہ مثلاً ٪۷۰ ہو تب بھی لوگ آگے بڑھیں گے۔

اگر منافع پانے کا امکان کم یعنی ٪۱۰ ہو اور منافع کی رقم ٪۹۰ تک ہو تب بھی لوگ معاملہ کریں گے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر منافع کا امکان ٪۱ ہے اور منافع مال کی قیمت سے دگنا اور سو فیصد ہو تب بھی لوگ اقدام کرینگے۔

اگر منافع کا امکان دس ہزار میں سے ایک یعنی بہت کم ہو اور فرض کیجیے کہ منافع کی امید زیادہ ہو تو یہاں بھی لوگ اقدام کریں گے جیسا کہ ہم لاٹری اور پرائز بانڈ وغیرہ کے سلسلے میں دیکھتے ہیں جہاں ہزاروں میں سے جیتنے والے چند ایک سے زیادہ نہیں ہوتے اور منافع پانے اور جیتنے کا امکان مثلاً دس ہزار میں سے ایک ($\frac{1}{10,000}$) ہے لیکن اس وجہ سے کہ یہ رقم ایک اعلیٰ ادارے کی حاصل کردہ ہے اس لیے لوگ نہایت کمزور امکان کے باوجود بھی اقدام کریں گے کیونکہ حاصل ہونے کے امکان سے رقم بہت زیادہ ہے۔ اس طریقے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ امکان کتنا ہی کم کیوں نہ ہو اگر رقم زیادہ ہو تو یہی اس کمزور امکان کی تلافی کر دیتی ہے۔ اس بات کو اصطلاح میں دفعِ ضررِ احتمالی کہتے ہیں۔

اب ہم لوگوں کو موت کے بعد کی زندگی، خدا کے باریک حساب کتاب، قہر خدا یعنی دوزخ اور لطف خدا یعنی بہشت کی خبریں دینے والے پیغمبروں، اماموں اور دلیلوں کی باتوں پر چند فیصدی یقین کرتے ہیں (ہمیں تو قوی دلیلوں سے اس کا یقین ہے لیکن یہ بات ہم صرف غافل اور بے دین لوگوں کے لیے کہتے ہیں)۔

اس مقام پر ہم اگر سو میں سے ایک یا ہزار میں سے ایک یا کئی ہزار میں سے ایک درجہ بھی یقین کریں تو ہمیں قدم بڑھانا چاہیے کیونکہ اگرچہ احتمال تو کمزور ہے لیکن دوزخ دائمی ہے اور خدا کا قہر بہت زیادہ ہے، بہشت ہمیشہ رہنے والی ہے اور خدا کا قرب بہت اہمیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے۔

اس لیے ہمیں قوی یا کمزور امکان سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن چونکہ نفع نقصان بھی بہت اہمیت رکھتا ہے اس لیے ہمیں اس طرف دھیان دینا چاہیے۔ کبھی کوئی بچہ خبر دیتا ہے کہ بھڑ چھتے میں ہے کبھی وہ سانپ کی اطلاع دیتا ہے، کبھی کسی کے سیڑھی سے گرنے کا حال بتاتا ہے، کبھی کسی کے دریا میں ڈوبنے کی خبر سناتا ہے، کبھی کہتا ہے کہ مجھے دس روپے پڑے ملے ہیں، کبھی کہتا ہے کہ راستے میں مجھے سونے کی ایک تھیلی ملی ہے۔ ان خبروں میں آپ کی توجہ اس بات پر نہیں ہے کہ خبریں بچے نے دی ہیں یا کسی بڑے نے جس سے آپ کو یقین ہو جاتا ہے یا شبہ بلکہ یہاں آپ کا دھیان مال پر ہوتا ہے۔ سونے کی تھیلی، سانپ، دریا میں ڈوبنے والا وغیرہ اور یہی چیزیں آپ کو حرکت میں لاتی ہیں چاہے بات کسی پختہ یا ثقہ آدمی نے نہ کی ہو (میں پھر اولیائے خدا سے معافی مانگتا ہوں کہ میں نے ان بزرگوں کی گفتگو کا موازنہ ایک بچے کی گفتگو سے کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا مقصد بے دینوں کو سمجھانا ہے)۔

مختصر یہ ہے کہ جب انسان ایک بچے سے بھی منافع بخش یا ضرر رساں بات سن کر ردعمل ظاہر کرتا ہے تو پھر اولیائے خدا کی باتوں پر غور کیوں نہیں کرتا جو تاریخ کے قول کے مطابق اپنے زمانے کے بہترین آدمی تھے۔ لوگ ان پیغمبروں کی باتوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے جو برسوں تک کسی کمزوری کے بغیر پکارتے رہے اور آخر وقت تک اپنے موقف پر ثابت قدم رہے جو اپنے پیشروؤں کی آواز تھے، جنہوں نے انسانوں کو دوسری دنیا کی خبریں پہنچائیں، بہت سی نشانیاں اور معجزے دکھائے اور لاکھوں انسانوں نے

انکی پیروی کی اور جن کی دعوت دل وجان سے قبول کی۔ ان سب باتوں کے باوجود (یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ ایک گروہ کو تو اعتبار ہی نہیں آتا) لوگوں کے دلوں میں احتمال اور شک کیوں نہیں پیدا ہوتا؟ انسان اپنے فائدے یا نقصان کے باعث (خصوصاً جب فائدہ یا نقصان اہم اور دائمی ہو) ایک بچے کے کہے پر جتنا ردِ عمل ظاہر کرتا ہے تو کیا اسے بڑے بڑے انبیاءؑ کی پکار پر اتنا ردعمل بھی ظاہر نہیں کرنا چاہیے؟ انبیاء کی راہ میں کوئی نقصان نہیں ہے البتہ ان کی راہ پر نہ چلنے میں (بے دینوں کی نظر سے بھی) ایسے نقصان کا امکان ضرور ہے جسے کوئی دعا، مال و دولت اور فریاد نہیں روک سکتی۔

یہ وہ دائمی نقصان ہے جو خدا کے قہر سے پیدا ہوتا ہے۔ پس ہر عاقل شخص کو چاہیے کہ وہ انبیاء کی پکار کا اپنے اندر احساس کرے اور کم سے کم خطرے کا امکان ضرور سمجھ لے کیونکہ خطرے کا یہی امکان حرکت کے لیے کافی ہے اس لیے کہ فائدے یا نقصان کی اہمیت بہت ہوتی ہے۔

شاید میں اس گفتگو کا خلاصہ مندرجہ ذیل مثال میں پیش کرسکوں گا۔ ہم سڑک کے کنارے اور بازاروں میں نانبائی، بزاز، قالین فروش اور اسٹیٹ ایجنسی کو دیکھتے ہیں لیکن ان کے مقصد اور سبب میں باہم فرق ہوتا ہے۔

نانبائی کو یقین ہوتا ہے کہ اس سے سو فیصد آدمی روٹی خریدیں گے، اگرچہ ایک روٹی پر بہت کم نفع ہوتا ہے۔ بزاز کو نانبائی کا سا یقین نہیں ہے لیکن وہ اسی فیصد یہ سمجھتا ہے کہ اسے گاہک ملے گا۔ چونکہ کپڑے کا منافع روٹی کے منافع سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ ہر روز اپنی دکان کھولتا

ہے۔ قالین فروش کو گاہک کے ملنے کا امکان پچاس فیصدی نظر آتا ہے لیکن اس وجہ سے کہ قالین کا منافع نسبتاً زیادہ ہے وہ بھی ہر روز اپنی دکان پر جاتا ہے۔

بروکر کو اپنے سودے کی پانچ فیصدی کامیابی کا خیال ہوتا ہے لیکن چونکہ جائداد کی خرید و فروخت کا منافع بہت زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ بھی روزانہ اپنی دکان کھولتا اور گاہک کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے۔

ہاں گاہکوں کی کمی یا زیادتی ہی دکان کھولنے کا واحد سبب نہیں ہے بلکہ منافع کی مقدار کا بھی اس میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔

مومن کا فائدہ خدا کی خوشنودی اور ہمیشہ باقی رہنے والی بہشت ہے۔ گنہگار کا نقصان خدا کا قہر اور دوزخ کا دوام ہے۔ فائدہ اور نقصان دونوں ہی اتنے زیادہ ہیں کہ جو ہمارے سوچ میں نہیں سما سکتے' اس لیے کہ احتمال جتنا کم ہوتا جاتا ہے' رقم کی مقدار اس کی اتنی ہی تلافی کر دیتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان بڑے بڑے امکانی نقصانات کو دور کرنے (جو ہمارے نزدیک یقینی ہیں) یا ان بے شمار امکانی نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے (جو ہمارے نزدیک لابدی ہیں) قدم اٹھائیں۔ ایسا کرنا' انبیاءؑ کی راہ پر چلنا اور اندرونی لالچوں اور بیرونی شیطانوں کے پھندے سے نکل آنا ہے۔

معاد پر ایمان کا اثر

لالچ اور خوف مقدار میں چاہے کتنا ہی کم ہو انسان کی کارکردگی میں بڑا دخل رکھتا ہے۔ پھر اس کا تو کہنا ہی کیا جب لالچ دینے والا یا ڈرانے والا

خدا ہو اور لالچ اور ڈر بالترتیب جاودانی بہشت اور دائمی دوزخ ہو۔

اگر ہم اپنے دل میں معاد پر ایمان اور یقین تازہ کرلیں تو اس کا اثر اور عمل دخل کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہے گا۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ اس جگہ پر حساب کتاب ہوتا ہے، جانچ پڑتال ہوتی ہے، عدالت، قید خانے اور سزا کا وجود ہے اور اس کے ہر چھوٹے بڑے کام کی نگرانی اور حساب فہمی ہوتی ہے وہ کسی طرح بھی غافل، ظالم اور فاسق نہیں ہو سکتا۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کا بھی حساب لیا جائیگا وہ ضرور مطمئن ہوگا۔ وہ بے اطمینان نہیں رہ سکتا۔ اس سے متعلق کچھ قرآنی آیتیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

اقتصادی معاملات میں معاد کا اثر

قرآن لین دین کرنیوالوں سے کہتا ہے: کم تولنے والوں پر افسوس ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب لوگوں سے کچھ لیتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ پورا پورا لیں اور جب خود ناپ کر دینے لگتے ہیں یا تولتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ اس کے بعد کہتا ہے: کیا یہ کم تولنے والے نہیں جانتے کہ انہیں بہت اہم دن اٹھا کھڑا کیا جائیگا[1] تاکہ وہ خدا کی عدالت میں اپنے کم تولنے کی جواب دہی کریں؟

یہاں قرآن کم فروشوں کو قیامت کی یاد دلا کر کم فروشی سے منع کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ معاد پر ایمان رکھنے کے اثر کی ایک مثال ہے ورنہ معاد کا یقین

---

[1] سورۂ مطففین۔ آیت ۵

تمام اقتصادی معاملات مثلاً پیداوار، تقسیم، انتظام، تجارت اور ہر قسم کے دوسرے کاروبار پر اور خاص کر فضول خرچی کے مسئلے پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔

فوجی مسائل پر معاد کا اثر

ہم یہاں ایک مثال بیان کرتے ہیں:

لوگوں کی ایک بڑی جماعت بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کی خدمت میں پہنچی۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہم نے ظالموں سے لڑنے کی ٹھانی ہے لیکن ہمیں اس کے لیے ایک لائق حاکم کی ضرورت ہے۔ پیغمبر نے فرمایا: میری نظر میں تو تم لوگ جنگ کے قابل معلوم نہیں ہوتے۔ وہ بولے، ہم ظلم سہہ سہہ کر اپنے بچاؤ کے لیے ظالم سے لڑنے کو بالکل تیار ہو گئے ہیں۔ ان کے پیغمبر نے کہا: خدا نے جناب طالوت کو تمہارا حاکم منتخب کر دیا ہے کیونکہ وہ ایک لائق، لڑائی کے مسائل سے واقف اور طاقتور جوان ہیں۔ لڑائی کے طلبگاروں کی ایک جماعت بہت سے نعروں کے بعد جیسے ہی لڑائی کا حکم ہوا بھاگ کھڑی ہوئی اور پہلے ہی مرحلے میں ڈر گئی۔ دوسروں نے سردارِ لشکر کی مفلسی کا بہانہ کیا اور آگے جانے سے انکار کر دیا۔ کچھ اور نعرے بازوں نے جنہوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ خدا انہیں جس آزمائش میں بھی ڈالے گا ثابت قدمی دکھائیں گے، بے صبری دکھائی اور ناکام و نامراد ٹھہرے[1]

کچھ اور لوگ جو لڑائی کا حکم ملتے وقت نہیں ڈرے تھے وہ دشمن کا طاقتور لشکر دیکھ کر گھبرا گئے اور کہنے لگے: آج ہم میں لڑائی کی طاقت نہیں

---

[1] آزمائش یہ تھی کہ سردار نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ خدا لڑائی (جاری ہے)

ہے البتہ صرف ایک چھوٹا سا رسالہ جو معاد پر یقین رکھتا تھا یہ نعرہ لگا کر کہ "اس چھوٹے سے گروہ کا کیا کہنا جو اپنے سے بڑے گروہ پر خدا کے حکم سے فتح مند ہوتا ہے[1]" دشمن پر حملہ آور ہوا اور اس نے دشمن کو شکست دے دی۔

اس واقعے میں (جو طالوت اور جالوت کی داستان کے نام سے سورۂ بقرہ کی چند آیتوں میں بیان ہوا ہے[2]) لڑائی میں فتح اور ثابت قدمی کو معاد پر ایمان کا نتیجہ سمجھا گیا ہے کیونکہ قرآن فرماتا ہے: جو لوگ خدا کی ملاقات اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں انھوں نے کہا کہ فتح چھوٹی یا بڑی جماعت پر منحصر نہیں ہے اس لیے ہم حملہ کریں گے اور اپنے الٰہی فرض پر عمل کریں گے اس لیے کہ خدا صابروں کے ساتھ ہے۔

ہاں جنگی ذہنیت کا نظریات سے بڑا تعلق ہے۔ وہ مجاہد جو اپنا مستقبل ہمیشہ کی زندگی، بہشت اور رسولِ اکرمؐ کا قرب سمجھتا ہے اس کا موازنہ اس لڑنیوالے سے نہیں کیا جا سکتا جو اپنے قتل کو فنا اور بربادی سمجھتا ہے۔ جو لوگ محاذ جنگ پر جانے میں سستی برتتے ہیں، ان کے بارے میں خدا فرماتا ہے: "کیا تم آخرت کے بجائے دنیا پر راضی ہو گئے[3]"

کے میدان میں دریا سے تمہاری آزمائش کریگا یعنی تم ایک عرصے تک امتحان دو گے: دریا کا پانی بہت کم ہوگے اور سیراب ہو کر نہیں ہوگے۔ تم میں سے جو کوئی پانی پی لے گا وہ میرا لشکری نہیں رہے گا لیکن یہ پیاسا لشکر جونہی دریا کے کنارے پہنچا بیتاب ہوگیا اور صرف تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر سب کے سب پانی پر جا پہنچے اور سب نے ڈٹ کر پیا۔ یوں وہ خدائی آزمائش میں ناکام ہو گئے۔ [1] سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۴۹ [2] سورہ بقرہ۔ آیات ۲۴۴ تا ۲۵۱ [3] سورۂ توبہ۔ آیت ۳۸

سیاستدانوں اور شیطانوں کے مقابلے میں معاد پر ایمان کا اثر

فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی توہین کی غرض سے تمام شہروں کے جادوگر بلائے، تاکہ وہ ان کے جادو کے زور سے حضرت موسیٰؑ کے معجزے کا توڑ کریں۔ یہ جادوگر جس وقت تک معاد پر ایمان نہیں لائے تھے، فرعون کی حکومت سے دولت کی امید رکھتے تھے۔ یہ لوگ اپنی بھیک منگی ذہنیت کو زبان پر بھی لے آئے اور فرعون سے یوں کہنے لگے:

"اے فرعون! اگر ہم موسیٰؑ کو ہرا دیں تو کیا تو ہم کو اس کا انعام دے گا؟ فرعون نے جواب دیا ضرور دونگا۔"

پھر مقابلہ شروع ہوا۔ جادوگروں نے وہ کیا جو کچھ وہ کر سکتے تھے۔ اس کے بعد جب حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا زمین پر ڈالا تو وہ اژدہا بن گیا۔ جادوگروں نے جب یہ دیکھ لیا کہ موسیٰؑ کا کام ان کے کاموں جیسا نہیں ہے بلکہ یہ ایسا کام ہے جو سو فیصدی خدا کی جانب سے ہے تو وہ سب کے سب خود فرعون کے سامنے ہی حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے۔ فرعون نے ناخوش ہو کر ان سب کو ڈانٹا اور کہا: کیا تم میری اجازت کے بغیر ہی ایمان لاتے ہو؟ میں تمہارے ہاتھ پاؤں ایک دوسرے سے اُلٹے کٹوا دونگا[1]۔ اور تمہیں کھجور کے درختوں کی شاخوں اور تنوں سے لٹکوا دونگا۔

---

[1] یعنی دائیں ہاتھ کو بائیں پاؤں کے ساتھ اور بائیں ہاتھ کو دائیں پاؤں کے ساتھ کٹوا دونگا اور یہ بدترین سزا ہے کیونکہ دونوں ہاتھ یا دونوں پاؤں (جاری ہے)

لیکن وہ جادوگر جو ایک گھڑی پہلے، فرعون سے مال کی آس لگائے ہوئے تھے۔ خدا اور معاد پر ایمان لانے کے باعث چند ہی لمحات کے بعد یہاں تک پہنچ گئے کہ انھوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ فرعون سے کہہ دیا کہ تو جو چاہے کرلے، کیونکہ تیرا زور اس دنیا سے آگے نہیں چلتا۔[1]

پھر بولے: یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے جو ہم اپنے خدا کی طرف پلٹے جاتے ہیں۔[2]

واقعی معاد پر ایمان نے ذرا سی دیر میں ان لوگوں کی ذہنیت میں کس قدر تبدیلی پیدا کردی۔ وہ اس دنیا کی زندگی فرعون کی قوت اور تمام دولت اور انعامات کو جو چند لمحے پہلے انھیں سب سے بڑی بات نظر آتے تھے بالکل ہیچ سمجھ رہے ہیں اور فرعون کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ وہ بڑی جرأت سے کہہ رہے ہیں کہ تیری طاقت تو اسی دنیا تک محدود ہے۔ معاد پر ایمان نے ان لوگوں کی سوجھ بوجھ میں انقلاب برپا کردیا، ان کی روح میں عظمت پیدا کردی اور ان میں شہادت کا جذبہ بیدار کردیا۔

محروموں کے مسئلے میں معاد پر ایمان کا اثر

آپ سب نے سنا ہوگا کہ امام علی علیہ السلام کے بھائی عقیل نے امام کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر ہو سکے تو ہماری خوراک کا حصہ بڑھا دیجیے۔ امام فوراً لوہے کا ایک ٹکڑا گرم کر کے عقیل کے ہاتھ کے نزدیک لاتے ہیں اور کہتے

کٹ جائیں تو زندگی بسر کی جا سکتی ہے لیکن ایک ہاتھ اور ایک پاؤں اور وہ بھی اس طرح کتنا سخت اذیت ناک ہے۔ [1] سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۷۲ [2] سورۂ شعرا۔ آیت ۵۰

ہیں کہ اگر تم اس دنیا کی معمولی سی آگ سے ڈرتے ہو تو میں بھی خدا کے ابدی عذاب اور ناخوشی سے ڈرتا ہوں[1]

آپ نے یہ بھی سنا ہو گا کہ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام بچپن میں ایک بار علیل ہو گئے تو رسول اکرمؐ اپنے اصحاب سمیت دونوں بچوں کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ گھر سے رخصت ہوتے وقت لوگوں نے حضرت علیؑ کو یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں بچوں کی سلامتی کے لیے آپ تین دن کے روزوں کی منت مان لیں۔ امامؑ نے یہ تجویز مان لی۔ جب یہ دونوں بچے صحتیاب ہو گئے تو حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا وغیرہ نے روزہ رکھا۔ گھر میں کھانے کا سامان نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے کچھ روٹیاں تیار ہوئیں۔ ان لوگوں نے مغرب کی نماز پڑھ کر جیسے ہی روزہ افطار کرنا چاہا" دروازے پر ایک شخص کی صدا سنی جو کہہ رہا تھا: "میں مفلس اور حاجتمند ہوں۔ میری مدد کیجیے"۔ ان بزرگوں نے اپنی اپنی روٹی اس فقیر کو دیدی اور صرف پانی سے روزہ کھولا۔ اگلی شام کو بھی جیسے ہی انھوں نے افطار کرنا چاہا دروازے سے کسی کی آواز آئی: "میں یتیم ہوں مجھے کھانا کھلا دیجیے"۔ اسی طرح تیسری شام کو اسی وقت پر ایک قیدی نے روٹی مانگی تینوں روزے ان خدا کے پیاروں نے پانی سے افطار کیے۔ ان کی اس قربانی کا ذکر قرآن کی سورۂ دہر میں یوں کیا گیا ہے: ہم قیامت کے اس دن سے ڈرتے ہیں جو تاریک اور دردناک ہو گا۔[2]

بیشک معاد پر ایمان انسان کو سماج کے محروموں اور محتاجوں کے

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۲۴   [2] سورۂ دہر۔ آیت ۱۰

حق میں کس طرح ذمہ دار ٹھیراتا ہے۔ہاں جو لوگ محروموں کی پروا نہیں کرتے وہ قیامت میں یہ اقرار کریں گے اور کہیں گے کہ ہمارے دوزخ میں پڑنے کا ایک سبب ہماری یہ غفلت بھی ہے کہ "ہم محتاجوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے[1]" ہم سورۂ ماعون میں پڑھتے ہیں کہ یتیم اور محروم سے بے توجہی برتنا گویا دل سے قیامت پر ایمان نہ لانے کے برابر ہے۔

معاد پر ایمان لانے کا اثر۔ تمام کمالات کی ضمانت

اکثر خوبیوں، قربانیوں اور اخلاقی فضائل سے مراد ہے۔ایک طرح کی محرومیوں کے ساتھ سیدھی سادی زندگی بسر کرنا اور سختیاں اور تکلیفیں اٹھانا۔ پس وہ لنگر جس سے یہ بوجھ اٹھائے جا سکتے ہیں اور اتنی سخت تکلیفیں جھیلی جا سکتی ہیں قیامت کے دن ملنے والے بدلے پر ایمان ہے۔خدا کی بادشاہت پر ایمان انسان سے کہتا ہے کہ اگر تو نے دنیا میں کچھ دن تکلیف اور ایذا دیکھی ہے تو وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب کل قیامت میں تجھے ان تمام تکالیف کا صلہ دیا جائے گا۔ واقعی وہ کون سا سبب ہے جس سے لڑنے والے اپنی جانیں اور مالدار لوگ اپنا مال قربان کر دیتے ہیں۔وہ کون سی قوت ہے جو انسان کو اپنی خواہشات ترک کر دینے پر آمادہ کر دیتی ہے۔

اگر خدا اور اس کے اولیاءؑ کی ملاقات کا عشق اور اس کی یاد کی بات نہ ہو تو پھر کس خیال سے یہ پیچیدہ راہیں طے ہوں۔

اگر عمل کی جزا نہ ہو تو انسان کیوں تکلیف اٹھائے۔

---

[1] سورۂ مدثر، آیت ۴۴

اگر پاداش نہ ہو تو ہمیں ظلم سے کون سی بات روک سکتی ہے۔

اگر آج مومنین، کافروں کے اتنے طعنے، الزامات اور تمسخر برداشت کرتے ہیں تو وہ ان وعدوں کی وجہ سے کرتے ہیں جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے: آج (قیامت) کے دن مومنین کفار پر ہنستے ہیں[1]۔ فرعون کی زوجہ (آسیہ) کسی بھی طرح فرعون کے محل اور سونے چاندی پر فریفتہ نہیں ہوتی کیونکہ اس کی نظر کسی دوسری جگہ لگی ہوئی ہے۔ وہ کہتی ہے:

"اے خدا! مجھے فرعون کے محل سے نجات دے اور بہشت میں اپنی رحمت کے سائے میں ایک گھر تعمیر کر دے[2]" ہاں! جس کا دل بہشت کی خواہش رکھتا ہے اس کے لیے فرعون کا محل بھی قید خانہ بن جاتا ہے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں: وہ شخص سب سے زیادہ گھاٹے میں ہے جو (آخرت کے عوض) دنیا پر راضی اور مطمئن ہو گیا۔

تقویٰ، امانت، امن اور دوسرے جزوی اور کلی مسائل پر معاد کا اثر کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس موضوع پر ذیل میں قرآن و حدیث سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

معاد پر ایمان بھی اور معاد کی یاد بھی

جس طرح خدا کی یاد کے بغیر اس پر ایمان رکھنا مفید نہیں ہے، اسی طرح معاد پر صرف ایمان لانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ معاد کو یاد رکھنا بھی ضروری ہے۔ قرآن آگاہی اور توجہ کو صاحبان عقل سے مخصوص سمجھتا ہے اس لیے

---

[1] سورۂ مطففین۔ آیت ۳۴ [2] سورۂ تحریم۔ آیت ۱۱

کہتا ہے: "صرف صاحبان عقل کو یاد دہانی کرائی جائیگی' اہل غفلت کو نہیں"[1]
بعض لوگوں کے سوچ کے برعکس جو یہ خیال کرتے ہیں کہ موت اور معاد کی یاد انسان کو دنیا اور مادی فوائد سے غافل کر دیتی ہے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ قیامت اور حساب کتاب کی یاد انسان کو لاپرواہی اور بدنظمی سے روکتی ہے.
جو شخص اپنے چھوٹے بڑے کاموں کے ہونیوالے حساب کتاب کو یاد رکھتا ہے وہ کبھی بھی غلط کام نہیں کریگا - ہاں معاد پر صرف ایمان لانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہمیں اسی طرح حساب کتاب اور قیامت کو یاد بھی رکھنا چاہیے جس طرح پھول پر ایمان رکھنا ہی مزہ نہیں دیتا بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اسے سونگھتے بھی رہنا چاہیے -

کبھی قرآن ان لوگوں پر اعتراض کرتا ہے جو معاد پر ایمان نہیں رکھتے اور کبھی ان لوگوں پر نکتہ چینی کرتا ہے جو اس سے غافل ہیں یا اسے بھول گئے ہیں -

ان لوگوں کی توجہ دنیا کے ظاہر اور اسکی چمک دمک کے علاوہ کسی اور نیکی کی طرف نہیں ہے اور یہ لوگ آخرت سے غافل ہیں[2] قبروں کی زیارت کی جو اس قدر سفارش کی گئی ہے شاید اسکی وجہ یہی ہو کہ ہم لوگ کچھ کچھ موت کو بھی یاد رکھیں -

آپ دیکھتے ہیں کہ ہم دن رات میں کئی دفعہ واجب نمازوں میں "وہ قیامت کے دن کا مالک ہے[3]" کا جملہ ادا کرتے ہیں تاکہ ہم میں قیامت کی یاد تازہ رہے -

---

[1] سورۂ زمر - آیت ۹ [2] سورۂ روم - آیت ۷ [3] سورۂ فاتحہ - آیت ۴

موت اور معاد کی یاد کے اثرات

امام صادق علیہ السلام موت اور معاد کی یاد کی اہمیت اور اثر کے متعلق فرماتے ہیں:

۱۔ ذِكْرُ الْمَوْتِ يُمِيتُ الشَّهَوَاتِ. موت کی یاد خواہشات کو ختم کر دیتی ہے۔

۲۔ وَيَقْلَعُ مَنَابِتَ الْغَفْلَةِ۔ وہ غفلت کی جڑیں اکھاڑ پھینکتی ہے۔

۳۔ وَيُقَوِّي الْقَلْبَ بِمَوَاعِدِ اللهِ. خدا کے وعدوں کے ساتھ انسان کے دل کو مضبوط کرتی ہے۔

۴۔ وَيُرِقُّ الطَّبْعَ۔ انسانی ذہنیت کو سختی سے نرمی کی طرف لے جاتی ہے۔

۵۔ وَيَكْسِرُ اَعْلَامَ الْهَوٰى۔ موت کی یاد ہوا وہوس کے جھنڈے گرا دیتی ہے۔

۶۔ وَيُطْفِئُ نَارَ الْحِرْصِ وَيُحَقِّرُ الدُّنْيَا. حرص کی آگ بجھا دیتی ہے اور دنیا کو انسان کی نظر میں حقیر کر دیتی ہے۔

اس کے بعد امامؑ فرماتے ہیں: جناب رسول اکرمؐ نے جو یہ فرمایا ہے کہ "گھڑی بھر کا سوچ سال بھر کی عبادت سے افضل ہے"[1] تو اس سوچ کا مطلب اپنے مستقبل، پوچھ گچھ، حساب کتاب، خدائی عدل کی کچہری اور اس میں جواب دہی کے لیے تیاری کے متعلق سوچنا اور انتظام کرنا ہے۔

---

[1] بحار۔ جلد ۶ صفحہ ۱۳۳

ہم روایتوں میں پڑھتے ہیں کہ سب سے زیادہ عقلمند اور باہوش وہ لوگ ہیں جو موت کو زیادہ یاد رکھتے ہیں۔[1]

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "حقیقت یہ ہے کہ دلوں پر بھی لوہے کی طرح زنگ لگ جاتا ہے تو لوگوں نے پوچھا: ان کی صفائی کس چیز سے ہو سکتی ہے؟ آپ نے جواب دیا: موت کی یاد اور قرآن کی تلاوت سے۔

رسول اکرمؐ سے جو دوسرا جملہ منقول ہے اس میں ہم یوں پڑھتے ہیں: موت کو زیادہ یاد کیا کرو کہ اسکے چار اثرات ہوتے ہیں:

۱۔ وَ انَّہٗ یُمَحِّصُ الذُّنُوبَ۔ تمہارے گناہوں کو دور کرتی ہے۔

۲۔ وَیُزَهِّدُ الدُّنیَا۔ دنیا سے تمہاری بڑھی ہوئی محبت کو کم کرتی ہے۔

۳۔ فَاِنْ ذَکَرْتُمُوہُ عِنْدَ الْغِنٰی هَدَمَہٗ جب تم اپنی خوشحالی میں موت کو یاد کرتے ہو تو وہ مال و دولت کی بدمستیوں اور زیادتیوں کو روک دیتی ہے۔

۴۔ جب انسان غریبی اور مفلسی میں موت کو یاد کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ کل وہ خدا کی عدالت میں اپنی دنیوی دولت اور سماج کے محرومین کے بارے میں کس طرح حساب دیگا تو وہ اپنے مال کی اسی تھوڑی سی مقدار پر رضامند ہو جاتا ہے کیونکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر اس کے پاس مال نہیں ہے تو اسکی جوابدہی بھی تھوڑی سی ہے۔[2]

امام علی علیہ السلام ایک حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں: جو موت کو زیادہ یاد کرتا ہے وہ مال دنیا کی تھوڑی سی مقدار پر بھی راضی اور مطمئن

---

[1] بحار جلد ۶ صفحہ ۱۳۵ [2] نہج الفصاحت کلام ۴۴۴

ہو جاتا ہے اور اس میں زیادہ لالچ اور بخل نہیں ہوتا[1]

دراصل دنیا خود اپنے عاشقوں کو فریب دیتی ہے۔ جو شخص موت اور قیامت کے خیال سے اپنے دل کو دوسری دنیا کی طرف متوجہ کر لیتا ہے دنیا کی مکاریاں، چمک دمک اور جلوے اسے نہیں لبھا سکتے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے: جو شخص موت کو کثرت سے یاد کرتا ہے وہ دنیا کی مکاریوں سے بچ جاتا ہے۔[2]

ایک اور حدیث میں (جو موت کی یاد کے اثر کے بارے میں ہے) ہم یہ پڑھتے ہیں[3]: جو شخص موت کو اپنے سامنے دیکھتا ہے اور اس کا انتظار کرتا ہے وہ اپنے روزانہ کے کاموں میں پیچھے نہیں رہتا بلکہ جب وہ یہ جانتا ہے کہ وقت کم ہے اور موت یکایک آ جاتی ہے اور کام کرنے کے لیے اسے سدا کی مہلت میسر نہیں ہو گی تو وہ جس قدر ممکن ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ نیک کام انجام دیتا ہے۔

امام علی علیہ السلام پچھلوں کی حالت یاد دلا کر کس طرح موت نے انھیں دبوچ لیا لوگوں کو تیار کرتے ہیں اور یوں فرماتے ہیں:

یہ امام علی علیہ السلام ہی ہیں جو نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں[4]:

آج یمن و حجاز کے بادشاہ اور ان کی اولاد کہاں ہے؟

ایران و روم کے بادشاہ کہاں ہیں؟

ظالم اور ان کی نسل کہاں چلی گئی؟

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ صفحہ ۱۳۶، [2] فہرستِ غرر کلمہ موت [3] فہرستِ غرر کلمہ موت [4] فیض الاسلام صفحہ ۵۹۴۔ خطبہ ۱۸۱

کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے مضبوط قلعے تعمیر کیے اور سونے سے ان کی آرائش کی؟

کہاں چلے گئے وہ لوگ جن کی عمر تم سے زیادہ اور جن کی نشانیاں تم سے بڑی تھیں؟[1]

درحقیقت جن ماؤں کو اپنی بیٹیوں کے مستقبل کی فکر ہوتی ہے وہ ان کے بچپن ہی سے تھوڑا تھوڑا کر کے ان کے لیے جہیز تیار کرتی رہتی ہیں۔

جو تاجر مستقبل میں اپنا قرض ادا کرنے کی سوچتے ہیں وہ مدتوں پہلے سے اپنی آمدنیاں جمع کرنے لگتے ہیں۔

اسی طرح جو لوگ موت اور قیامت کی فکر میں ہوتے ہیں وہ بھی آج ہی کے دن سے بُرا کام چھوڑ کر اچھا عمل کرتے ہیں تاکہ اسے قیامت میں پیش کرسکیں۔

آیت اللہ شیرازی مرحوم جو کربلا کے بہت بڑے عالم تھے لوگوں نے ان سے پوچھا کہ اگر کوئی سچا آدمی آپ سے یہ کہے کہ آپ اسی ہفتے میں مرنے والے ہیں تو آپ زندگی کے ان چند دنوں میں جو باقی ہیں کیا کریںگے؟

انھوں نے جواب دیا: میں شروع جوانی سے جو کام کرتا آرہا ہوں وہی کرتا رہوں گا کیونکہ میں نے اپنی جوانی سے جب بھی کسی کام کا ارادہ کیا تو پہلے قیامت میں دینے کے لیے اس کا جواب سوچ لیا اس لیے میرے لیے مرنا کسی پریشانی کا سبب نہیں ہوگا۔

”ایسے لوگ اس شخص کے شاگرد ہیں جس نے ۱۹ رمضان المبارک صبح کو

---

[1] فہرست غرر لفظ موت

ابن ملجم کی تلوار لگتے ہی فرمایا: خدائے کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

یہی بزرگ امام نہج البلاغہ میں اپنے بیٹے کو تاکید کرتے ہیں کہ موت کو زیادہ یاد کرو تاکہ موت آنے پر تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہوں اور تم غفلت میں نہ پکڑے جاؤ۔[1]

ہم قرآن کی بہت سی آیتوں میں پڑھتے ہیں: جب تم اس سوچ میں پڑ گئے کہ تم نے خود محنت کر کے اپنے آپ کو بنایا ہے اور تم خدا کی بارگاہ میں متقی اور باعزت انسان ہو تو تمہیں موت سے نہیں ڈرنا چاہیے بلکہ تم کو اس کا آرزومند ہونا چاہیے۔

مناجاتوں میں موت کی یاد

موت اور قیامت کی یاد مناجاتوں کا ایک اہم حصہ ہیں مثلاً ہم دعائے ابوحمزہ ثمالی میں پڑھتے ہیں:

اے خدا! مرتے وقت میرے غم و حسرت پر رحم فرما۔

اے خدا! قبر میں میری تنہائی، خوف اور وحشت پر رحم کر۔

اے خدا! اپنی عدالت میں میرے حساب کتاب کے وقت میرے ذلیل ہونے اور میرے پاس جواب نہ ہونے پر رحم فرما۔

اے خدا! اس وقت رحم کرنا جس وقت میرے دوست میرے جنازے کے گرد کھڑے ہوں اور مجھے ایک تختے پر لٹا کر مُردوں کی بستی کی طرف لیجائیں۔

یہ امیرالمومنین امام علیؑ ہیں جو مسجد کوفہ میں یوں التجا کرتے ہیں:

---

[1] نہج البلاغہ فیض الاسلام صفحہ ۹۲۶

اے خدا! مجھے اس دن امان دینا جب ظالم حسرت سے اپنا گوشت چبائے گا اور کہے گا کہ اے کاش! ان لوگوں کے بجائے جنھوں نے مجھے گمراہ کیا میں رسول اکرمؐ کا راستا اپناتا۔

اے خدا! جس دن والدین کے کیے بھی کچھ نہیں ہو سکے گا جس دن ظالموں کی معذرت بھی کام نہیں دے گی جس دن انسان اپنے ماں، باپ، بھائی، بیٹے اور دوست سے بھی بھاگے گا۔ جب ہر شخص تن تنہا اپنے عمل کا خود ذمہ دار اور جوابدہ ہو گا مجھ پر رحم فرمانا اور مجھے امان دینا۔

اے خدا! جس دن گنہگار انسان یہ چاہیں گے کہ ان کی جگہ ان کے تمام بیٹے، دوست، بھائی اور کنبہ بلکہ تمام باشندے پکڑ لیے جائیں اور وہ چھوٹ جائیں اس دن مجھے امان دینا اور مجھے دوزخ کے عذاب سے چھٹکارا دینا۔[1]

ان مناجاتوں کا پڑھنا بیمار دلوں کو شفا دینے اور تاریک روحوں کو اجالنے والا ہے۔

ہاں یہ دعائیں اور مناجاتیں انسان کے دل کی صفائی کرتی ہیں اور اس کی نظر میں اس محدود دنیا سے لامحدود دنیا تک کی وسعت پیدا کر دیتی ہیں۔ انسان کو اوپر اٹھاتی اور ترقی دیتی ہیں۔ گنہگار اور مجرم وہ ہیں جو قیامت میں جوابدہی اور حساب کتاب پر ایمان نہیں رکھتے یا اگر فکری طور پر ایمان رکھتے بھی ہیں تو روحانی لحاظ سے غافل ہیں۔

---

[1] مسجد کوفہ میں حضرت علی علیہ السلام کی دعا۔

AJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 1
Soc...

ہم موت کو کیوں یاد نہیں کرتے؟

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: میں تمہارے لیے دو باتوں سے ڈرتا ہوں۔ ایک خواہشات کی پیروی اور دوسری طویل امیدیں کیونکہ یہ ہوا پرستی تم کو حق پرستی سے اور یہ طویل آرزوئیں تم کو قیامت کی یاد سے دور کر دینگی۔[1]

ہم ایک اور حدیث میں پڑھتے ہیں کہ اگر کوئی موت اور قیامت کو کم یاد کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آرزوئیں طویل ہیں۔[2]

معاد سے انکار کی تحریکات

۱۔ ذمہ داری سے فرار:

جب انسان بیابان کے کسی درخت یا زمین سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا ضمیر اور تقویٰ اس سے کہتا ہے کہ ایسا نہ کر کیونکہ اس کے مالک کی رضامندی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تب وہ اپنے ضمیر کو دھوکا دینے کے لیے کہتا ہے "ان زمینوں اور درختوں کا تو کوئی مالک ہی نہیں ہے تاکہ اس حیلے سے اپنے فائدے کی راہ نکالے یا یہ کہتا ہے کہ فلاں آدمی ایسا خراب ہے کہ کبھی ملتا ہی نہیں کہ وہ اپنے دل کی امنگ پوری کرے۔

قرآن فرماتا ہے: انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے آگے بھی ہمیشہ برائی کرتا جائے۔ وہ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا۔[3]

جب کوئی کسی کی عورتوں اور بیٹیوں کو دیکھنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ

---

[1] نہج البلاغہ فیض الاسلام صفحہ ۱۲۷ [2] فہرست غرر کلمہ موت [3] سورۂ قیامت آیت ۵-۶

ہم سب بھائی بہن ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔

جب وہ ظالم کا مقابلہ کرنے سے ڈرتا ہے تو کہتا ہے: ہمیں تقیّہ کرنا چاہیے۔ جب اس کی طبیعت میں ہچکچاہٹ اور کمزوری ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا چاہیے۔ بے شک انسان میں تاویل اور توجیہہ کرنے کی ایسی طاقت ہے کہ وہ خود بھی اپنی اس صلاحیت سے آگاہ نہیں ہے۔ ہم نے ان تحریکات کو جو نفسیاتی بنیادیں رکھتے ہیں "ذمہ داری سے فرار" کا نام دیا ہے۔

۲- خدا کی قدرت اور علم کا ایمان نہ ہونا:

معاد کے مخالفوں اور اس سے انکار کرنے والوں کے پاس اپنی بات کی کوئی عملی دلیل نہیں ہے بلکہ وہ صرف دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ ہم یہاں دوبارہ زندہ ہونے کی کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے: جو لوگ معاد کے منکر ہیں ان کے پاس کوئی علمی دلیل نہیں ہے، وہ صرف اپنے خیال اور گمان سے ہی ایسی باتیں کرتے ہیں[1]

ایک اور آیت میں ہے: کفار یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مرنے کے بعد زندہ نہیں ہوں گے[2]

ایک اور مقام پر آیا ہے: جب ہم مر کر گل سڑ گئے اور ہمارے بدن کے ذرات زمین میں بکھر گئے تو کیا ہم دوبارہ پیدا کیے جائیں گے[3]

---

[1] سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۴ [2] سورۂ تغابن۔ آیت ۷

[3] سورۂ سجدہ۔ آیت ۱۰

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No. 11, M.L. Heights,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan.

اسی طرح سورۂ مومنون کی آیت ۳۵ و ۸۲ میں سورۂ نمل کی آیت ۶۷ میں، سورۂ صافات کی آیت ۱۶ و ۵۳ میں، سورۂ قٓ کی آیت ۳ میں اور سورۂ واقعہ کی آیت ۴۷ میں مخالفین قیامت کی باتیں (قدرے فرق کے ساتھ) یوں بیان کی گئی ہیں: کیا ہم جب مر کر خاک ہو جائیں گے تب بھی زندہ ہو جائیں گے؟

آپ دیکھتے ہیں کہ مخالفین کی باتیں بے یقینی کے طور پر کہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کہی گئی ہیں۔

لیکن قرآن ان کو واضح جوابات دیتا ہے جن کی مثالیں ہم "امکان معاد" کی گفتگو میں بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم یہاں رسولِ اکرمؐ کی ایک حدیث پیش کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: جب تم فصل بہار کو دیکھو تو اپنے دوبارہ زندہ ہونے کو زیادہ یاد کرو۔[1]

قرآنی آیات بھی بار بار یہ بات بیان کرتی ہیں کہ مردوں کا زندہ ہونا زمین اور درختوں کے زندہ (سرسبز) ہونے کی طرح ہے۔

ہم اس ضمن میں مثنوی مولوی کے دو شعر پیش کرتے ہیں:

این بہارِ نو ز بعدِ برگ ریز
ہست برہاں بر وجودِ رستخیز
در بہاراں سرّہا پیدا شود
ہر چہ خوردہ این زمیں رسوا شود

پت جھڑ کے بعد نئی بہار معاد (دوبارہ زندہ ہونے) کی ایک دلیل ہے۔

---

[1] زندگی جاوید صفحہ ۴۵ از مطہری شہید

بہاروں میں اسرارِ قدرت ظاہر ہوتے ہیں اور زمین نے جو کچھ کھایا ہے وہ سب کو معلوم ہو جاتا ہے۔

بے شک معاد سے انکار کی دلیل تو صرف یہی ہے کہ انسان خدا کی قدرت پر ایمان نہیں رکھتا اس لیے قرآن مخالفوں کے لیے قدرت الٰہی کی مثالیں پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے: وہی قدرت جس نے تجھے بنایا ہے یہ بھی کرسکتی ہے کہ تجھے ریزہ ریزہ کر کے نئے سرے سے بنائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بکھیر دینا، پیدا کرنے سے زیادہ آسان ہے (اگرچہ خدا کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے)۔

دوسرا بہانہ

معاد کے مخالفوں کا دوسرا بہانہ یہ تھا کہ قیامت کا زمانہ کونسا ہے؟ یعنی قیامت کب آئے گی؟

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ جناب رسول اکرمؐ کے دیے ہوئے جوابات سن کر انہیں مان لینے کے بجائے ان لوگوں نے تعجب اور تمسخر میں سر ہلایا اور کہنے لگے: قیامت کا زمانہ کون سا ہے[1]؟ ان لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ قیامت آنے کا وقت خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن وقت اور تاریخ کا نہ جاننا قیامت کے انکار کی وجہ نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی شخص اپنے مرنے کی گھڑی کا علم نہیں رکھتا تو کیا اسے مرنے ہی سے انکار کر دینا چاہیے؟

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۵۱

ایک اور بہانہ یہ تھا کہ وہ لوگ کہتے تھے: اگر خدا مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے تو تم اس وقت ہمارے باپ داداؤں کو زندہ کر دو[1]

ایک اور مقام پر ہے کہ یہ لوگ کہتے تھے: اگر تم سچ کہتے ہو کہ قیامت آنے والی ہے تو ہمارے باپ داداؤں کو اسی وقت زندہ کر دو[2]

واقعی ان کے بھی کیسے کیسے مطالبے تھے! تاہم اگر انسان ڈھیٹ اور ضدی نہ ہو تو معاد کو ماننے کے لیے اس کا اپنا سوتا، جاگنا اور درختوں کے تازہ پتے نکلنا ہی بطور دلیل کافی ہیں اور اگر نہ ماننے کی ضد ہو تو پھر مُردہ باپ زندہ بھی ہو گیا تو وہ یہی کہے گا: میرے باپ داداؤں کو زندہ کرو اور اس کے بعد کہے گا خود ہم کو جوان بنا دو۔ پھر آخر میں قدرت کا کارخانہ ڈھانے کی فرمائش کریگا لیکن ایمان نہیں لائے گا۔

کیا قرآن میں نہیں آیا ہے کہ کچھ لوگ رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے: اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم ایمان لائیں تو اجرام فلکی کو زمین پر اتار دیجیے، خدا کو انسانی جسم میں ہمارے سامنے لا کھڑا کیجیے، چاند کے دو ٹکڑے کر دیجیے اور اس پہاڑ میں سے ابھی اور اسی وقت ایک زندہ اونٹ برآمد کر کے دکھائیے۔

یہ لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ پیغمبروں کا کام قدرت الٰہی کی نشانیاں دکھانا اور انکی دلیلیں پیش کرنا ہے ورنہ یہ دنیا ہر کس و ناکس کی خواہشات کا پابند کوئی نمائش گاہ کا کمرہ اور کوئی صنعتی کارخانہ نہیں ہے۔

کیا چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے کے بعد بھی ان لوگوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ

---

[1] سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۵ [2] سورۂ دخان۔ آیت ۳۶

یہ جادو ہے ؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے سب لوگوں سے خدا کی قدرت منوا سکے ؟ کیا تیرے میرے ایمان لانے کی خاطر دنیا کا نظام درہم برہم کر کے قدرت کا پہیا پیچھے کی طرف گھمایا جا سکتا ہے ؟ کیا خدا جسم رکھتا ہے کہ وہ تیرے میرے پاس آ کھڑا ہو۔ یہ گفتگو ہم قرآن کی ایک آیت پر ختم کرتے ہیں۔

خدا ان لوگوں کے جواب میں جو مُردوں کا زندہ ہونا غیر ممکن سمجھتے ہیں سورۃ بنی اسرائیل میں یوں فرماتا ہے :

"کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسی اور چیزیں بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں تو اس نے ان لوگوں کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے البتہ ظالم اور کافر اس سے انکار کرتے ہیں[1]"

مختصر یہ ہے کہ اگر لوگ ایمان لانے کے لیے معجزے کے محتاج ہیں تو وہ انبیاءؑ نے دکھا دیے ہیں۔ پھر اگر کسی شخص کے ایمان لانے کے لیے یہ لازم ہو کہ کائنات کا انتظام ہی درہم برہم کر دیا جائے تو انبیاءؑ ایسے ہوس کے بندوں اور ضدی لوگوں کی خواہشات اور مطالبے ہرگز نہیں مانیں گے۔

موت بھی خدا کا قانون ہے

کیا مرنے کے معنی خدا کی قدرت کے ختم ہو جانے اور خدا کے ارادے پر موت کے فتح پانے کے ہیں ؟ ہرگز نہیں کیونکہ یہ مرنا بھی خدا کی قدرت اور

[1] سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت ۹۹

ارادے کے ماتحت ہے۔ یہ ان باتوں میں سے ہے جو پہلے سے طے ہو چکی ہیں۔ قرآن فرماتا ہے: خود ہم نے موت کو تمہارا مقدر بنایا ہے۔ پس دنیا کی کوئی چیز نہ ہم پر غالب آ سکتی ہے نہ ہم سے سبقت لیجا سکتی ہے۔ سورۂ واقعہ۔ آیت ۶۰

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن میں چودہ مرتبہ مرنے کا ذکر توفی کے کلمے سے کیا گیا ہے جس کے معنی سپرد ہونے کے ہیں، یعنی تم مرنے کے بعد مٹ نہیں جاؤ گے بلکہ ہم اپنی دی ہوئی چیز کو کسی کمی اور کسر کے بغیر واپس لے لیں گے اور اسے عارضی طور پر اپنے متعین کیے ہوئے کارندوں کے سپرد کر دیں گے۔

کیا مرنا اصل میں مٹ جانا ہے؟ نہیں! کیونکہ مٹ جانا کبھی پیدا ہونا نہیں چاہتا لیکن قرآن میں خدا فرماتا ہے: اس نے موت اور حیات دونوں کو پیدا کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت فنا نہیں ہے بلکہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہونا ہے، اسی لیے مرنے کو توفی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہی تعبیر رسول اکرمؐ کی باتوں میں بھی ملتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے: یہ نہ سمجھو کہ تم موت سے مٹ جاؤ گے بلکہ ایک مکان سے دوسرے مکان کو کوچ کرو گے۔ (بحار باب برزخ)

ب
ACC No. 13008 Date 15/4/11
Section G A5 اصول Status ....
D.D. Class ....
NAJAFI BOOK LIBRARY

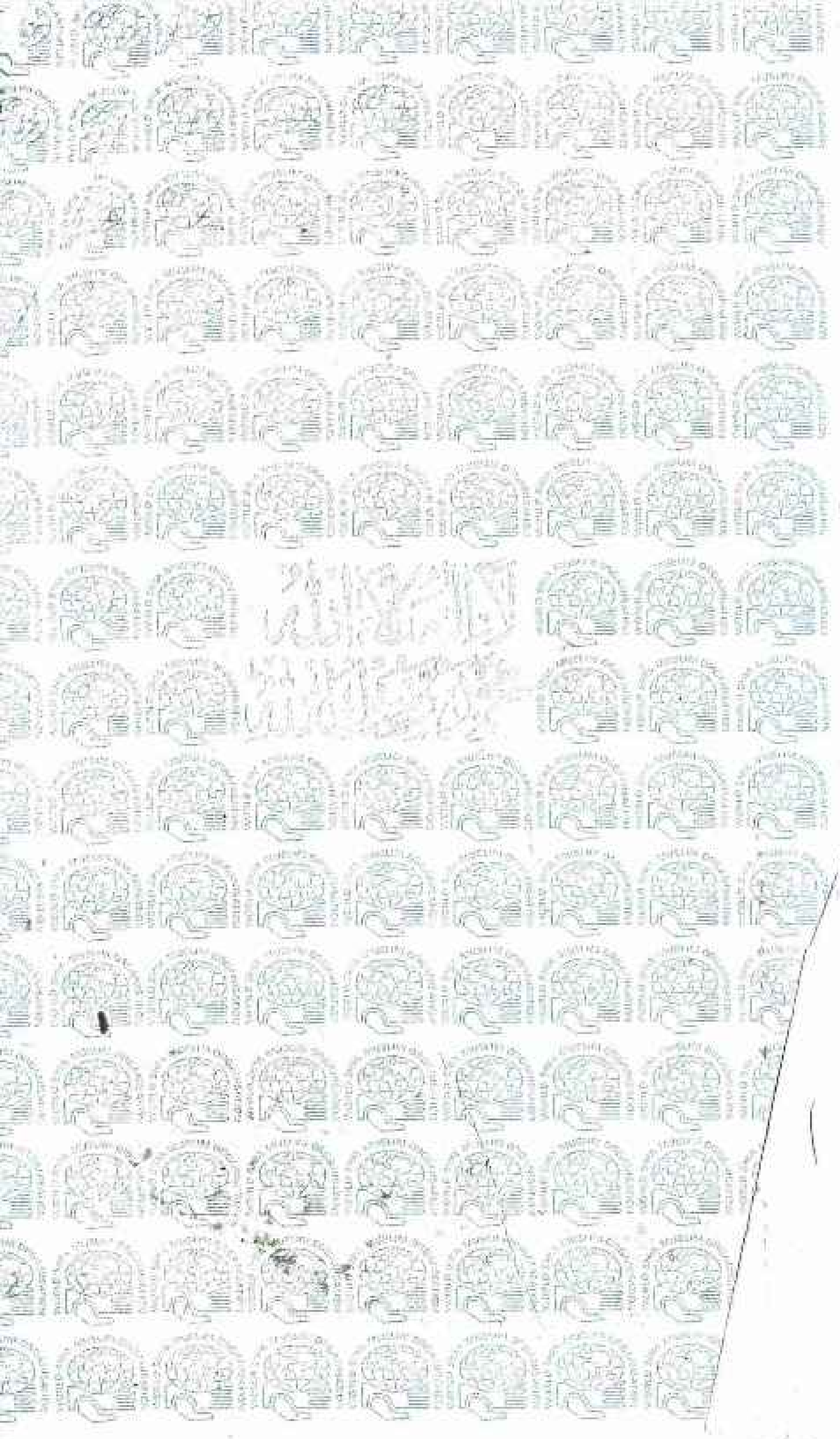

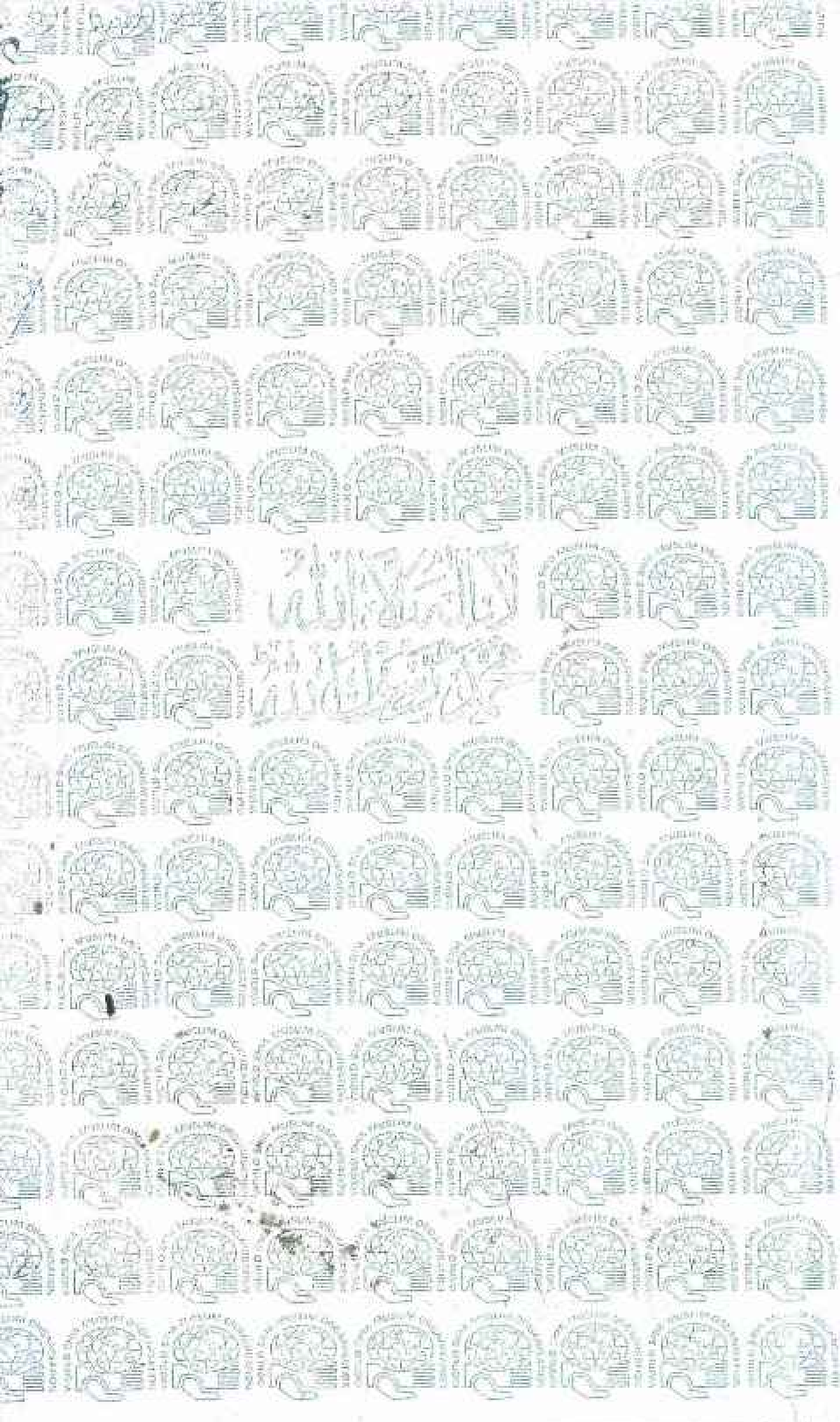

ہماری مطبوعات

اسلام دینِ فطرت	کتابُ الدعاء والزیارات
اسلام دینِ معاشرت	اعمالِ حج
اسلام دینِ معرفت	حکایاتُ القرآن
اسلام دینِ حکمت	حیاتِ انسان کے چھ مرحلے
فلسفۂ معجزہ	مقالاتِ مطہری
فلسفۂ شہادت	بُت شکن
فلسفۂ ولایت	مردِ انقلاب
فلسفۂ حجاب	ہار جیت
فلسفۂ احکام	بہلول عاقل
تاریخِ عاشوراء	فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعْبَۃ
گفتارِ عاشوراء	سخن
بنائے کربلا	ابُوطالب۔ مظلومِ تاریخ
مرگِ گُل رنگ	تفسیر سورۃ حمد
مکتبِ اسلام	شرحِ قرآن
مکتبِ رسول ص	سیر و سُلوک
مکتبِ تشیّع	یَسَّرْنَا الْقرآن
آخری فتح	غدیر کی برکتیں
انتظارِ امام ع	تعلیماتِ اسلامی
توضیح المسائل اردو	پاسدارانِ اسلام
توضیح المسائل فارسی	دعائے خلیل، نویدِ مسیحا
شریعت کے احکام	انسانِ کامل

نیز بچّوں کے لیے دل چسپ مذہبی کہانیاں بھی دستیاب ہیں!

جامعۂ تعلیماتِ اسلامی پاکستان